

۱۴
چودہ

بصیرت افروز مجالس

فرمودات

علاّمہ سیّد ابنِ حسن قبلہ رضوی جارچوی ایم اے

اعلی اللہ مقامہٗ

ناشر

افتخار بُک ڈپو (رجسٹرڈ)

اسلام پورہ۔ لاہور

نام کتاب ——— چودہ بصیرت افروز مجالس

بار ——— اوّل ۔ مارچ ۱۹۷۹ء

تعداد ——— ایک ہزار

سائز ——— ۱۸ × ۲۳ / ۲۳

ضخامت ——— ۲۲۴ صفحات

کاتب ——— عزیز احمد قریشی

مطبع ——— حیدری پریس ۔ لاہور

قیمت ———

پیش لفظ

آج سے بیس برس قبل علامہ سید ابن حسن صاحب قبلہ رضوی جارچوی اعلی اللہ مقامہٗ نے مدیر رضاکار کو از راہ محبت اپنی چودہ ۱۴ مجالس کا مسودہ مرحمت فرمایا تھا ۔ جسے ادارہ رضاکار نے ۱۹۵۹ء میں بصورت محرم نمبر "بصیرت افروز مجالس" کے عنوان سے شائع کیا ۔ یہ محرم نمبر اس قدر مقبول ہوا کہ ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگیا ۔ مومنین کرام اصرار فرماتے رہے ۔ کہ مذکورہ نمبر کو دوبارہ کتابی صورت میں شائع کیا جائے ۔ لیکن بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر ہم اب تک حضرات مومنین کی یہ فرمائش پوری نہ کر سکے ۔

اس دوران میں متعدد حضرات علماء کرام کی مجالس کے مجموعے چھپ کر بازار میں آگئے ۔ لیکن پھر بھی علامہ جارچوی مرحوم کی مجالس کی مانگ برابر جاری رہی اور ان مجالس کی انفرادیت اپنی جگہ برقرار رہی ۔ چنانچہ احباب کے شوق اور اصرار پیہم پر اب ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے ۔ کہ بغیر مزید تعویق کے علامہ مرحوم کی یہ بلند پایہ منفرد اور علمی مجالس کو جو عصر حاضر کے تقاضوں کے عین مطابق ہیں ۔ اور بجا طور پر علمی دنیا میں خراج تحسین حاصل کرنے کی مستحق ہیں کو کتابی شکل میں شائع کیا جائے ۔ یہ مجموعہ مجالس اسم بامسمیٰ یعنی حقیقی معنوں میں بصیرت افروز ہے ۔ مجالس عزا میں ان مجالس کی خواندگی یقیناً قلوب مومنین کو منور کرے گی ۔ اور اُن کی دینی بصیرت میں متعدبہ اضافہ ہوگا ۔ ہم اس دعوی کے ساتھ یہ کتاب حضرات مومنین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں کہ اگر تعلیم یافتہ حضرات ان مجالس کو حفظ کر کے خصوصاً عشرہ محرم کی مجالس میں پڑھیں گے تو ہم پورے وثوق کیساتھ کہہ سکتے ہیں ۔ کہ یہ مجالس دینی و قومی نقطہ نظر سے سامعین کیلئے بیحد مفید و کارآمد ثابت ہونگی ۔ اور اُن میں مذہب و ملت کی ٹھوس اور تعمیری خدمات انجام دینے کا صحیح جذبہ انگڑائیاں لینے لگے گا ۔ جو ہماری قومی زندگی میں انقلاب پیدا کرنے کا موجب ثابت ہوگا ۔

ان مجالس کی نشر و اشاعت علامہ جارچوی مرحوم کی روح کو بھی شاد کریگی کیونکہ وہ ملت جعفریہ کی سربلندی کیلئے ہر آن کوشاں رہتے تھے اور انہوں نے زندگی بھر زبان و قلم سے قوم کی ترقی و بہبود کیلئے جہاد فرمایا ۔

قارئین کرام کی خدمت میں التماس ہے ۔ کہ وہ کتاب کا مطالعہ شروع فرمانے سے قبل سورہ فاتحہ کا ثواب علامہ جارچوی اعلی اللہ مقامہٗ کی روح پُر فتوح کو ارسال فرمائیں ۔

محمد صدیق

مدیر ہفت روزہ ۔ رضاکار ۔ لاہور

علّامہ مرحوم کا تعارف!

علامہ سیّد ابن حسن صاحب قبلہ رضوی جارچوی لعلےٰ اللہ مقامہٗ کی وفات حسرت آیات کے موقع پر رضاکار کے یکم اگست ۱۹۶۳ء کے شمارہ میں افتتاحیہ تحریر کیا گیا تھا۔ جس میں علامہ مرحوم کے مختصر سوانح حیات درج تھے۔

ہم یہ افتتاحیہ اس عظیم شخصیت کے تعارف کے سلسلہ میں قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ (صدیق)

آہ! علّامہ ابنِ حسن جارچوی

اک روشن چراغ تھا نہ رہا!

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

علامہ سید ابن حسن جارچوی کے نام کے ساتھ مرحوم لکھتے ہوئے قلم کانپتا ہے۔ لیکن قانونِ قدرت یہی ہے کہ جو شخص اس دُنیا میں آتا ہے۔ اسے ایک نہ ایک دن رختِ سفر باندھنا پڑتا ہے چنانچہ علامہ جارچوی صاحب قبلہ نے ایک طویل علالت کے بعد مورخہ ۱۶ر جولائی ۱۹۶۳ء کو صبح سات بجے معصومین ہسپتال کراچی میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ علامہ جارچوی کی رحلت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے شہر میں پھیل گئی۔ اور تعزیت کے لئے آنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔

آہ علامہ کی موت نے ہمیں ایک ممتاز عالمِ دین۔ تحریکِ پاکستان کے عظیم رہنما اور قائدِ اعظم کے ایک مخلص ترین رفیقِ کار سے محروم کر دیا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

علامہ سید ابن حسن جارچوی ۱۹۰۵ء میں جارچہ ضلع بلند شہر (یو۔پی) بھارت میں پیدا ہوئے بچپن ہی میں والدین کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ تو ان کی تین بہنوں نے پرورش کی میٹرک پاس کرنے کے بعد علامہ جارچوی میرپور بٹھورو ضلع ٹھٹھہ (سندھ) میں اپنے بہنوئی جناب سید شبیر حسین صاحب کے پاس آ گئے۔ جہاں تھوڑے ہی عرصہ میں اپنی دینی و قومی سرگرمیوں کی وجہ سے عوام میں کافی مقبولیت حاصل کر لی۔

۱۹۲۲ء میں سکھر (سندھ) میں آل انڈیا شیعہ کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا۔ تو علامہ صاحب نے اس میں شرکت فرمائی اور اپنی بصیرت افروز تقاریر سے لوگوں کے دل موہ لئے۔ اس اجلاس کی صدارت شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ نے فرمائی اور سابق چیف جسٹس ہائی کورٹ آغا حسن علی صاحب نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے اس اجلاس میں شرکت فرمائی۔ ہر دو حضرات نے علامہ مرحوم کی دینی و ملی فراست کی داد دی۔ اس کانفرنس کے بانی میر آف خیرپور تھے۔ جو ہمیشہ علامہ مرحوم کے مدّاح رہے۔

کچھ عرصہ کے بعد علامہ کی صلاحیتیں انہیں پنجاب لے آئیں جہاں لاہور میں قیام کے دوران انہوں نے پنجاب لے آئیں۔ جہاں لاہور میں قیام کے دوران انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے بی اے ایم۔اے، ایم او ایل کے امتحانات امتیازی حیثیت سے پاس کئے۔ اس کے بعد علامہ علی گڑھ پہنچ گئے۔ اور وہاں سے بی ٹی کا امتحان پاس کیا۔ بی ٹی کرنے کے بعد علامہ جارچوی دہلی پہنچے جہاں ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۸ء تک جامعہ ملیہ کالج سے وابستہ رہے جہاں بھارت کے سابق صدر ڈاکٹر ذاکر حسین جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر، ڈاکٹر محمود حسین اور ڈاکٹر عابد حسین ان کے ساتھیوں میں تھے۔

۱۹۳۸ء میں علامہ جارچوی دہلی سے ریاست محمود آباد چلے گئے جہاں موجودہ راجہ صاحب محمود آباد کے والد صاحب نے انہیں راجہ صاحب کا اتالیق مقرر کیا۔ ۱۹۴۲ء سے لے کر ۱۹۵۱ء تک علامہ جارچوی صاحب شیعہ ڈگری کالج لکھنؤ کے پرنسپل رہے۔ اور اس دوران میں وہ یو۔پی شیعہ وقف بورڈ کے صدر بھی رہے۔

علامہ صاحب ۱۹۵۱ء میں بھارت سے ہجرت کر کے کراچی تشریف لائے اور جامعہ کراچی کے شعبہ معارف اسلامیہ سے منسلک ہو گئے جہاں سے ۱۹۶۰ء میں ریٹائر ہوئے۔

علامہ جارچوی ممتاز ماہر تعلیم ہونے کے ساتھ ساتھ شعلہ بیان مقرر بھی تھے۔ اور سیاست میں گہری دسترس رکھتے تھے۔ چنانچہ تحریک پاکستان میں ان کو اور ان کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ۱۹۴۵ء میں سر کرپس مشن بھارت آیا۔ اور اس نے قائد اعظم محمد علی جناح ؒ سے معلوم کیا کہ آپ پاکستان کیوں چاہتے ہیں؟ اس کے متعلق اسلامی نظریہ پیش کیا جائے! تو قائد اعظم نے علامہ ابن حسن صاحب جارچوی اور مولانا شبیر احمد عثمانی کو مشن کے سامنے پیش ہو کر مسلمانوں کی علیٰحدہ مملکت کے بارے میں تفصیلات اور اسلامی نکتہ نظر پیش کرنے کا کام سپرد کیا۔ چنانچہ علامہ جارچوی اور مولانا شبیر احمد عثمانی نے یہ کام نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا اور مسلمانوں کی علیٰحدہ مملکت کے بارے میں اپنا موقف نہایت واضح طور پر وفد کو سمجھایا۔ جس کی داد قائد اعظم مرحوم نے بھی دی۔

علامہ جارچوی ابتدا ہی سے مسلم لیگ کے لئے دن رات کام کرتے رہے۔ لیکن جب ۱۹۳۶ء میں قائد اعظم ؒ لنڈن سے واپس آئے اور مسلم لیگ کی صدارت قبول فرمائی تو علامہ جارچوی نے قائد اعظم ؒ کی رہبری میں انتہائی خوش و خردشش سے کام شروع کر دیا۔ اور پھر مرتے دم تک پاکستان اور مسلم لیگ کی ٹھوس اور تعمیری خدمات بجالاتے رہے۔ پاکستان کو صحیح معنوں میں اسلامی مملکت بنانے کے سلسلہ میں علامہ مرحوم نے جو خدمات سر انجام دیں وہ تاریخ پاکستان میں ہمیشہ سنہری حروف میں لکھی جائیں گی۔

علامہ صاحب نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں "انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اینڈ کلچرل ریسرچ" کے قیام کا بیڑہ اُٹھایا۔ اور اس کے لئے حکومت پاکستان سے سیرہائی دے فیڈرل بی ایریا کراچی میں قطعہ زمین بھی حاصل کر لیا۔ لیکن موت نے علامہ مرحوم کو اس کی تکمیل کی مہلت نہ دی۔

علامہ مرحوم جہاں شعلہ بیان مقرر تھے۔ وہاں وہ بہترین لکھنے والے بھی تھے۔ ان کی تحریروں میں ان کی تقریروں کا رنگ جھلکتا تھا۔ ان کی تحریر میں ایسی جاذبیت چاشنی

کشش اور ولولہ ہوتا تھا کہ ان کی تحریر کو بار بار پڑھنے کو دل چاہتا ہے۔ ان کو قلم پر ایسی قدرت حاصل تھی کہ وہ اپنے مافی الضمیر کا اظہار ایسے اچھوتے اور پرجوش انداز میں فرماتے تھے کہ پڑھنے والوں کے سامنے نقشہ کھنچ جاتا تھا۔ علامہ مرحوم کی مندرجہ ذیل تصانیف پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔

- فلسفہ آل محمدؐ - چار جلدوں میں۔
- تذکرہ آل محمدؐ - تین جلدوں میں۔ حضرت علی کا طرز جہانبانی - انگریزی و اردو۔ عہد مامون و حضرت امام رضا۔ انگریزی و اردو۔ اور جدید ذاکری ان

کے علاوہ ابھی کئی تصنیفات زیر تکمیل تھیں۔ کہ انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

بوقت انتقال علامہ مرحوم کی عمر ۶۸ سال تھی۔ ۱۹ر جولائی ۱۹۷۳ء کی شام کو علامہ مرحوم کو "اسلامک اینڈ کلچرل ریسرچ" کے احاطہ میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ نماز جنازہ مولانا نصیر حسین اجتہادی نے پڑھائی۔ نماز جنازہ میں علمائے کرام اراکین اسمبلی اور عمائدین شہر نے بڑی تعداد میں شرکت فرمائی۔

علامہ جارچوی نے اپنے پسماندگان میں ایک بیوہ۔ دو صاحبزادے سید محمد مشہود اور سید علی حسن اور دو صاحبزادیاں چھوڑی ہیں۔

علامہ مرحوم شرافت کا مجسمہ تھے۔ انہوں نے تنگی ترشی میں گذر اوقات کی مگر صاحبان ثروت اور حکومت سے کبھی کوئی امداد قبول نہ کی۔ نہ ان کو خریدا جا سکا۔ اور نہ ان کو جھکایا جا سکا۔ وہ آزادی فکر کے علمبردار تھے۔ اور یہی آزادی فکر و بے نیازی تھی جس نے ان کو بے باک و حق گو بنایا۔ ان کے دل میں امت مسلمہ کے لئے درد اور مسلسل کرب تھا۔ وہ پاکستان کے مفاد و مقصد کے خلاف کوئی بات برداشت نہیں کرتے تھے۔ اور اپنے خیالات کا اظہار نہایت جرأت و بے باکی سے کرتے تھے۔ اور کسی شخصیت سے مرعوب نہیں ہوتے تھے۔

ان کی شخصیت مرنجان مرنج اور پہلو دار تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ذات سب کے لئے قابل عزت و احترام تھی۔ وہ محض ایک فرد نہیں تھے۔ بلکہ انہوں نے ایک ادارے کی

حیثیت اختیار کر لی تھی۔ وہ ہماری بہترین ثقافتی روایات کے بھی مظہر تھے۔ یہ ہماری کتنی بدقسمتی ہے۔ کہ قحط الرجال کے اس دور میں ایسی ہستیاں ایک ایک کر کے اُٹھتی جا رہی ہیں۔ جو ہمارے لئے سرمایۂ افتخار تھیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ احساس پیدا ہوتا ہے۔ کہ وہ سانچے ہی ٹوٹتے جا رہے ہیں جن میں اس طرح کی منفرد و محترم شخصیتیں ڈھالی گئی تھیں۔

مرحوم اوّل و آخر شیعہ تھے۔ باوجود سیاست میں حصہ لینے کے انہوں نے اپنی شیعیت کو کبھی نہیں چھپایا۔ بلکہ اپنے شیعہ ہونے پر ہمیشہ فخر کرتے رہے۔ جب کبھی بھی شیعہ قوم کو ان کی ضرورت پڑی۔ انہوں نے قوم کی آواز پر لبیک کہی اور ہر آڑے وقت میں قوم کے کام آئے۔ ابھی گذشتہ سال کی بات ہے۔ جب شیعیان پاکستان نے اپنے مطالبات منوانے کے سلسلہ میں راولپنڈی میں محاذ قائم کیا۔ اور اس کے نتیجہ میں حکومت نے اسلام آباد میں شیعہ علماء و زعماء کی میٹنگ طلب کی تو مرحوم نے سخت علالت کے باوجود اس میں شرکت فرمائی۔ اور جس جرأت و بے باکی کے ساتھ شیعوں کی وکالت فرمائی وہ پاکستان کی شیعہ تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گی۔

مدیر رضاکار کے ساتھ مرحوم کے دیرینہ تعلقات تھے۔ مرحوم سے ہماری پہلی ملاقات قیصر باغ لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ اس وقت سے لے کر اب تک مرحوم کے ساتھ ہمارے تعلقات ایسے رہے جیسے ایک بیٹے کے باپ سے ہوتے ہیں۔ مرحوم نے رضاکار کی قلمی اعانت سے کبھی دریغ نہیں فرمایا۔ ۱۹۵۹ء میں مرحوم نے ہمیں چودہ مجالس پر مشتمل ایک قابل قدر مسودہ مرحمت فرمایا۔ جسے ہم نے سید الشہداء نمبر کی شکل میں بصیرت افروز مجالس کے عنوان سے شائع کیا۔ اس نمبر کی اشاعت نے دنیائے ذاکری میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ مرحوم کی رضاکار کے ساتھ محبت کا یہ عالم تھا کہ مرحوم نے بغیر ہماری تحریک کے رضاکار کی لائف ممبری قبول فرمائی اور مرتے دم تک رضاکار کی سرپرستی فرماتے رہے۔

ہم جب بھی کراچی گئے مرحوم کی خدمت میں ضرور حاضر ہوئے۔ مرحوم انتہائی محبت، شفقت اور خلوص سے پیش آتے تھے اور ہمیشہ اپنے مفید مشوروں سے نوازتے تھے۔ جب کبھی مرحوم

لاہور تشریف لاتے تھے تو دفتر رضاکار میں ضرور قدم رنجہ فرماتے تھے۔ لہٰذا ہمیں اپنے تعلقات کی بنا پر علامہ جارچوی صاحب کی موت پر جو صدمہ پہنچا ہے ہم اس کا اظہار الفاظ میں کرنے سے قاصر ہیں۔

بارگاہ رب العزت میں ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ مرحمت فرمائے اور مرحوم کے پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے ہمیں اس صدمہ جانکاہ میں مرحوم کے پسماندگان کے ساتھ دلی ہمدردی ہے۔ اور ہم اس غم میں ان کے ساتھ برابر کے شریک ہیں

قارئین رضاکار کی خدمت میں التماس ہے کہ وہ مرحوم کی روح کو ایصال ثواب کے لئے سورہ فاتحہ تلاوت فرمائیں اور مجالس عزا کا انعقاد کریں۔

مرنے والے تجھے روئے گا زمانہ برسوں

سوگوار ــــــ ادارہ

(ہفت روزہ رضاکار لاہور۔ یکم اگست ۱۹۷۳ء)

ذکرِ حسینؑ کیوں؟

حسینی تعلیمات موجودہ بین الاقوامی مسائل کا حل پیش کرتی ہیں!

۸-۹-۱۰ اپریل ۱۹۵۵ء کو لاہور میں "یوم الحسینؑ" کے سلسلہ میں عظیم الشان بین الاقوامی اجتماعات منعقد ہوتے تھے۔ جن میں شیعہ۔ سُنّی۔ ہندو۔ سکھ۔ عیسائی اور اچھوت۔ غرضیکہ برصغیر پاک و ہند میں بسنے والے تمام مذاہب کے دانشوروں نے شرکت کی اور بارگاہ سید الشہداءؑ میں ہدیۂ عقیدت پیش فرمایا۔۔۔ ادارہ رضاکار نے ان دانشوروں کی تقاریر کو بصورت "سید الشہداء نمبر۔ واقعات کربلا پر بین الاقوامی تبصرہ" کے عنوان سے ۱۹۶۰ء میں شائع کیا تھا۔

اس عظیم اجتماع کو علامہ سید ابن حسن صاحب قبلہ رضوی جارچوی نے بھی خطاب فرمایا تھا۔ آپ کی تقریر کا موضوع تھا۔۔۔ ذکرِ حسینؑ کیوں؟ اس تقریر کا ماحصل یہ تھا کہ حسینی تعلیمات موجودہ بین الاقوامی مسائل کے حل کی "کلید" ہیں۔ اور اگر آج اقوامِ عالم حسینی تعلیمات کو اپنالیں۔ تو یہ فسادی دُنیا جنتِ ارضی بن سکتی ہے۔ موصوف نے یہ دعویٰ کیا۔ کہ حسینؑ شناسی ہی دُنیا کے مصائب کو ختم کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔۔۔ لہذا یہ فرض حسینؑ کے نام لیواؤں پر بھی عائد ہوتا ہے۔ کہ وہ تمام بنی نوع انسان کو حسینیت سے متعارف کرائیں۔ تاکہ شاعرِ حسینیت حضرت جوشؔ ملیح آبادی کے یہ اشعار لباسِ حقیقت پہن سکیں۔

کیا صرف مسلماں کے پیارے ہیں حسینؑ — چرخِ نوعِ بشر کے تارے ہیں حسینؑ
انسان کو بیدار تو ہو لینے دو — ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؑ

علامہ مرحوم نے اپنے۔۔۔ اس دعوے کو پوری وضاحت کے ساتھ زیرِ نظر

چودہ بصیرت افروز مجالس کے مجموعہ میں پیش فرمایا ہے۔ علامہ مرحوم نے مذکورہ بالا اجتماع میں اپنی تقریر میں جو کچھ تمہیداً ارشاد فرمایا تھا۔ وہ ان چودہ مجالس کی تمہید کی حیثیت رکھتی ہے۔ لہذا ہم علامہ کی اس تمہیدی تقریر کو قارئین کرام کے ملاحظہ کیلئے ذیل کرتے ہیں۔

صدرِ عالی قدر!

میں آج برسوں کے بعد لاہور کے باشندوں سے مخاطبہ کر رہا ہوں۔ امام حسین علیہ السلام کی ذات سے لاہور کے شہریوں کی عقیدت کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ لیکن آج اپنے اردگرد پچاس ہزار انسانوں کا جم غفیر دیکھ کر بے انتہا مسرت ہو رہی ہے۔ مجھے یہاں پنجاب کے ہر ضلع کے نمائندے نظر آرہے ہیں سینکڑوں ایسے ہیں جن کو شہید کربلا کی عقیدت پاکستان کے دُور دراز مقامات سے کھینچ لائی ہے۔ یہاں ایران کے رہنے والے بھی موجود ہیں۔ عراق کے باشندے بھی شامل ہیں اور ہمارے ہمسایہ ملک بھارت سے عقیدت مندوں کا جو قافلہ آیا ہے۔ اس میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی ہر طبقہ کے لوگ "اتحادِ انسانی" کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

جنابِ صدر!

میں بس یہی دیکھنے کے لئے چلا آیا تھا۔ کہ ایشیا کے رہنے والوں نے پچھلے پچیس ۲۵ سال میں جو سیاسی، معاشی اور اخلاقی ترقی کی ہے۔ اس نے ان کو "حسینؑ شناسی" میں کتنی مدد دی ہے؟ اور غلامی کی قید و بند سے آزاد ہو کر ہم انسانیت کے سب سے بڑے شہید کے پیغام کو زیادہ وضاحت کے ساتھ سمجھنے لگے ہیں۔ یا نہیں؟ اس عظیم الشان جلسے کے بلند و بالا اسٹیج پر کھڑے ہو کر جب میں اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالتا ہوں۔ چاروں طرف ان خرد افزا اور بصیرت افروز کتبوں کو دیکھتا ہوں۔ جن کے ایک ایک لفظ سے آزادی، حریت، ایثار اور

قربانی کی تعلیم جھلک رہی ہے۔ اور ایک ایک لمحے بعد وہ فلک بوس نعرے سنتا ہوں۔ جو پچاس ہزار انسانوں کے منہ سے نکل کر فضا میں ایک خاص کیفیت پیدا کر رہے ہیں۔ تو میری روح بالیدہ ہو جاتی ہے۔ اور میں سوچنے لگتا ہوں کہ دنیا جتنی آگے بڑھ رہی ہے "حسینیتؑ" کو زیادہ سمجھتی جا رہی ہے۔ اور اب دھواں دھار تقریروں اور آتش بیان مقرروں کے بجائے ایسے مستقل اداروں کی ضرورت ہے جہاں آئندہ نسل کو درساً اور سبقاً حسینی تعلیم سے روشناس کرایا جائے۔ اور خود غرض، جنگجو اور خون ریز دُنیا کو ایثار پیشہ اور صلح جو حسینؑ کے کردار پر چلنے کی دعوت دی جائے۔ کہ ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم سے ڈری ہوئی نسل انسانی کے لئے صرف کربلا کا درس عافیت ہی تسکین بخش ہو سکتا ہے۔

جناب صدر!

میں تقریر کرنے کے ارادے سے اس جلسہ میں شریک نہیں ہوا تھا۔ بلکہ یہاں کے ماحول اور یہاں کے مقرروں کے بیانات سے متاثر ہو کر کچھ عملی تجاویز پیش کرنے کی نیت سے آیا تھا۔ تقریریں بہت ہو چکی ہیں۔ اور بحمد اللہ بہت اچھی ہو چکی ہیں۔ اس لئے مجھے اجازت دیجئے کہ میں اسی مجمع سے غیر رسمی طور پر بات چیت کروں اور حاضرین سے تبادلہ خیالات کر کے یہ طے کروں کہ ہم صرف تین شبانہ روز کے اس قومی میلے اور حال و قال کے اس حسینی اجتماع پر اکتفا کرنا چاہتے ہیں یا دنیا کے بدلے ہوئے حالات اور تقاضوں سے متاثر ہو کر "حسینی تعلیم" کو بین الاقوامی مسائل کے حل کے لئے خود بھی استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ اور دوسروں کو بھی اکسیر کے اس نسخے اور کیمیا کے اس گُر سے کام لینے کی دعوت دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ بین الاقوامی قسم کے یہ جلسے محرم کے مہینے میں نہیں

ہوئے کیونکہ اس زمانے میں ہم مذہبی اور اعتقادی لحاظ سے گریہ و بکا، ماتم و عزا اور نوحہ خوانی اور روضہ خوانی میں مصروف ہوتے ہیں۔ اور ہم کو وفور جذبات اور کثرت اعمال مذہبی کی وجہ سے اتنا وقت نہیں ملتا کہ ہم شہادت حسینؑ کے دوسرے پہلوؤں پر غور کر سکیں۔ اور اقوام معاصر کو دعوت دے کر اپنے ساتھ شامل کریں۔ اور ان غلط فہمیوں کا ازالہ کر سکیں جو وقتاً فوقتاً اس عالمگیر مشن اور وقت گیر دعوت صلح و اتحاد کے متعلق پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ آج ہم جس اسٹیج پر کھڑے ہو کر مخاطبہ کر رہے ہیں۔ جس جلسہ میں شامل ہیں۔ وہ مذہبی نہیں، بلکہ بین الاقوامی ہے۔ اس لئے ہمارا لب و لہجہ طرز تخاطب اور انداز استدلال بھی ایسا ہی ہونا چاہیئے جو مختلف الخیال سامعین کے جذبہ تجسس و تحقیقات کی تسکین کر سکے۔ اور "اندھے کی شیرنی" ہو کر نہ رہ جائے۔ ملک آزاد ہو چکا ہے ہم سب ایک صالح تمدن اور ترقی بخش معاشرہ کی تعمیر میں مصروف ہیں۔ اور اپنے نوجوانوں کے سامنے ایک ایسا نصب العین پیش کرنے کے متمنی ہیں جو ایک طرف تو ان کو اقوام عالم کی صفوں میں سربلند و ممتاز کر سکے۔ اور دوسری طرف ان کو سامراجی عزائم، جُوع الارض اور سماج دشمن عادات سے محفوظ رکھ سکے۔ کہ آزاد ہونے کے بعد جب کوئی قوم منظم ہو جاتی ہے۔ تو اس کی قوت کا اسٹیم رولر (STEAM ROLLER) اکثر اوقات غلط راہوں پر پڑ جاتا ہے۔

آپ کہیں گے "آزاد ملک کے آزاد نوجوانوں کے سامنے کسی کامیاب انسان کا کردار رکھیئے"۔ سکندر، چنگیز، ہٹلر، مسولینی کا نام لیجیئے۔ جن کا ذکر نوجوان خون کی حرارت بڑھا دیتا ہے۔ آپ "حسینؑ" کا نام بار بار لے کر اس ساری دنیا کو عزا خانہ

ماتم کدہ، اور امام بارہ بنانے کی فکر میں ہیں جہاں قوم کے بہترین دل و دماغ، ملک کے منتخب دست و سینے مایوسیوں کے ڈھیر پر نوحہ خوانی اور سینہ کوبی کیا کریں گے۔ دنیا کی "نژادِ نو" ماضی کے صرف انہی چراغوں سے اقتباس نور کر سکتی ہے جو ان کے اندھیرے گھر میں اُجالا کر سکیں۔ جن کی روشنی کا پرتو بھیانک اور غم آفرین نہ ہو۔ جو مردہ دلوں کے اندر توانائی اور طاقت پیدا کر سکے۔ اور مایوس و حرماں نصیب لوگوں کی ہمت افزائی کرنے میں مدد دے۔

وہ دیئے جو غمناک فضا پیدا کرتے ہیں سرِ مزار جلائے جاتے ہیں۔ وہ کافوری شمعیں بن کر مدھم روشنی افسردگی پیدا کرتی ہے مردوں کے سرہانے روشن کی جاتی ہیں۔

آپ آزاد ملک کے آزاد نوجوانوں کو زندگی، کامرانی، سربلندی اور علو ہمتی کا پیام دینے اُٹھے ہیں۔ اور مثال دیتے ہیں اس انسان کی جس کی ناکام زندگی پر چودہ سو سال سے ماتم ہو رہا ہے۔ جس کا نام سنتے ہی آنکھوں سے آنسو نکل آتے ہیں۔ جس کا ذکر سن کر لوگ سر و سینہ پیٹنے لگتے ہیں"۔

آیئے بظاہر اس معقول اعتراض کا جائزہ لینے سے قبل اس بین الاقوامی اجلاس کو کسی مذہبی، فرقہ وارانہ یا کسی طبقہ کے مخصوص نعرے کے بجائے "حسینیت زندہ باد" کے نعرے سے رونق دیں تاکہ ہر مذہب و ملت اور طبقہ و گروہ کے لوگ آزادی سے اس نعرے میں شریک ہو سکیں۔

جنابِ صدر!

یہ صحیح ہے کہ امام حسین علیہ السلام کے افسانہ حیات پر سرسری

نظر ڈالنے سے بہت سے لوگوں کو یہ غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے اور چودہ سو سال کا یہ طویل عرصہ بھی "اُن" کے پیام کو پورے طور پر سمجھانے کا حق ادا نہیں کر سکا ہے۔

بات یہ ہے کہ امام حسین علیہ السلام نے اپنے طرزِ عمل سے دنیا کو یہ سمجھانا چاہا تھا کہ کامیابی اور ناکامی کا وہ معیار جو صدیوں سے دنیا مانتی چلی آئی ہے۔ غلط ہے۔ ان کے نانا نے ان کو بتایا تھا۔ اور قرآن مجید نے ایک چھوٹی سی سورت میں اس کا ذکر کیا تھا۔ کہ اصل کامیابی کیا ہے۔

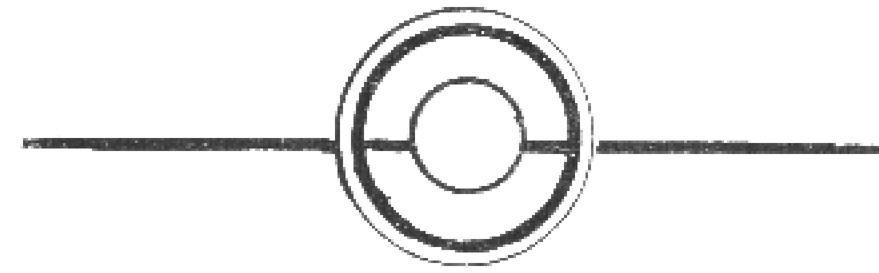
والعصر ٥ ان الانسان لفی خسر ٥ الا الذین امنوا وعملوا الصلحت وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر ٥

زمانہ شاہد ہے۔ آثار قدیمہ پکار پکار کر کہہ رہے ہیں۔ تاریخ گواہی دے رہی ہے۔ کہ ساری کی ساری نسل انسانی گھاٹے میں ہے۔ (بس وہ لوگ کامیاب ہیں) جو ایمان لائے، یقین کی دولت سے مالا مال ہوئے۔ عمل صالح بجا لائے اور ایک دوسرے کو حق اور صبر کی وصیت اور تلقین کرتے رہے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام سے پہلے دنیا مال و دولت، حکومت و سلطنت کو کامیابی سمجھتی تھی ایران کا کسریٰ اس کے نزدیک کامیاب انسان تھا کیونکہ وہ یونان سے لیکر۔ سندھ تک کے علاقوں پر حکومت کرتا تھا۔ جواہر نگار اور سنہری روپہلی تخت اس کی نشست اور ہیرے اور لعل سے جڑا ہوا تاج اس کا سر چومتا تھا۔

سکندر اعظم کامیاب انسان تھا کیوں کہ اس کی فوجوں نے کبھی ناکامی کا منہ ہی نہ دیکھا تھا۔ وہ مغرب سے مشرق کی طرف بڑھا اور فتح ظفر اس کے قدم چومتی گئی۔

مگر امام حسین علیہ السلام نے دُنیا کو بتایا کہ کامیابی خزانوں۔ فوجوں اور فتوحات کی کثرت کا نام نہیں ہے۔ کامیابی اس نشان کو حاصل ہوتی ہے۔ جو ایمان کی دولت سے مالا مال ہو جائے۔ یقین کے خزانے کا مالک بن جائے۔ جس کے اندر اچھے کام کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے جو ایسے خوش قسمت اور خوش نصیب ساتھی پیدا کر سکے جو حق پر جمے رہیں اور صبر و استقامت کو ہاتھ سے نہ دیں۔

اگر یہ بات کسی کو نصیب ہو جاتے تو وہ رہتی دنیا تک فاتح رہے گا۔ دنیا میں ہمیشہ اس کے نام کا سکہ چلے گا۔ اور چھوٹے بڑے سب قیامت تک اس کا کلمہ پڑھیں گے۔



دوسرا ایڈیشن

کتاب ھذا کا نیا ایڈیشن باجازت شیخ محمد صدیق صاحب مالک رضا کار بک ڈپو لاہور، شائع کیا جارہا ہے۔

آغا افتخار حسین

مہتمم افتخار بک ڈپو

پہلی مجلس

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الۡمُرۡسَلِیۡنَ وَاٰلِہِ الطَّیِّبِیۡنَ الطَّاھِرِیۡنَ اَمَّا بَعۡدُ۔ فَقَدۡ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی فِیۡ کِتَابِہِ الۡمُبِیۡنِ ۝ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ یُّعۡجِبُکَ قَوۡلُہٗ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَیُشۡہِدُ اللّٰہَ عَلٰی مَا فِیۡ قَلۡبِہٖ ۙ وَھُوَ اَلَدُّ الۡخِصَامِ ۝ وَاِذَا تَوَلّٰی سَعٰی فِی الۡاَرۡضِ لِیُفۡسِدَ فِیۡہَا وَیُہۡلِکَ الۡحَرۡثَ وَالنَّسۡلَ ؕ وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ الۡفَسَادَ ۝ (سورۂ بقر آیت ۲۰۴ اور ۲۰۵)

قرآن مجید کی ان آیتوں کا ظاہری ترجمہ یہ ہے۔

"(اے رسولؐ) لوگوں میں سے بعض ایسے بھی ہیں کہ زندگانی دنیا کے بارے میں اُن کی باتیں تم کو بہت اچھی لگتی ہیں (زبان سے تو وہ چکنی چپڑی باتیں کرتے جاتے ہیں) اور اُن کے دل میں جو کچھ (چھپا ہوا) ہے اُس پر اللہ کو گواہ ٹھہراتے جاتے ہیں۔ حالانکہ (حقیقت یہ ہے کہ) (وہ بڑے جھگڑالو) اور دشمنی اور خصومت میں سب سے زیادہ سخت ہیں (ان کو اُس وقت دیکھنا) جب (حکومت ان کے ہاتھ آجائے گی اور یہ کسی ملک کے) حکمران بن جائیں گے تو ملک میں ان کی ساری دوڑ دھوپ (صرف) اس لئے ہوگی کہ وہاں فساد پھیلائیں (خرابیاں ڈالیں) اور کھیتی باڑی اور فصل کو تباہ کریں حالانکہ (حقیقت یہ ہے کہ) اللہ اس فتنہ و فساد کو بالکل پسند نہیں کرتا۔"

قرآن مجید جس کو ہم سب مسلمان آسمانی، الہامی اور آخری کتاب مانتے ہیں۔ زندہ بھی ہے اور زندگی بخش بھی ہے۔ اس کی آیتوں پر ماضی کا کہر اور گزرے ہوئے زمانے کی افسردگی چھائی ہوئی نہیں ہے کہ ان کی صرف تاریخی اہمیت ہو اور حال و استقبال

ان کی گرفت سے آزاد رہے۔ اس کے احکام کو قیامت تک کے لئے نافذ العمل رہنا تھا۔ اس کے مضامین کو رہتی دنیا تک تر و تازہ رکھنے کی ضرورت تھی۔ اس لئے قدرت نے اس کا اندازِ بیان ایسا رکھا ہے کہ اس کی گرفت ماضی، حال اور استقبال تینوں زمانوں پر رہے۔ اس کے سدا بہار چمن میں ماضی کی خوشبو بھی ہے اور حال و استقبال کی نکہت بھی، الفاظ کو اس خوبی سے مرتّب کیا گیا ہے کہ ان کا اطلاق ماضی کے ان واقعات پر ہو سکتا ہے جن کے لئے وہ نازل ہوئے تھے۔ لیکن پھر بھی وہ ایسی شانِ عمومی رکھتے ہیں کہ قیامت تک ملتے جلتے واقعات پر ان کا انطباق کیا جا سکتا ہے۔ تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ فلاں آیت فلاں واقعہ کے بعد مُردہ ہو گئی۔ اب وہ صرف ایک تاریخی دلچسپی کی چیز ہے۔ آئندہ اس سے کوئی ہدایت و رہنمائی حاصل نہیں ہو سکتی قدرت کی بنائی ہوئی چیزوں میں اور ہماری بنائی ہوئی چیزوں میں یہی فرق ہے کہ ہماری مصنوعات کی افادیت کا دائرہ محدود اور عمر کوتاہ ہوتی ہے۔ لیکن قدرت کی مصنوعات کی افادیت کا دائرہ وسیع ہوتا ہے۔ اور مٹتے مٹتے بھی اپنا جانشین چھوڑ جاتی ہیں۔ تاکہ آنے والی نسلیں بھی ان سے مستفید ہو سکیں۔

باغ میں جا کر گلاب کے تختوں پر نگاہ ڈالئے۔ کیسے نظر افروز، روح افزا اور شام نواز پھول کھلے ہوئے ہیں رنگ و بُو اور تر و تازگی کے علاوہ ان کے اندر کچھ چھُپے ہوئے جوہر بھی ہیں۔ ان سے عرق گلاب بنتا ہے عطر گلاب نکلتا ہے ان کی پتیاں گلقند کی شکل میں بہت سی بیماریوں کا علاج ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ان پھُولوں کی بہار بھی چند روزہ ہے لیکن قیامت تک ان کی نسل میں پیدا ہونے والے پھول اپنی بہار دکھلاتے رہیں گے۔ اپنے رنگ و بُو سے دُنیا کے چشم و مشام کی تواضع کرتے رہیں گے اور اپنے رنگا رنگ وجُود کے ذریعہ سے یہ اعلان کرتے رہیں گے کہ ہم قدرت کی صنعت ہیں۔ اس نے ہم کو جو خوبیاں دی ہیں وہ ہماری نسل کے ذریعہ باقی، برقرار رہیں گی اور فائدہ بخش رہیں گی۔ لیکن ہم جو کاغذ سے گلاب کے پھُول بنا لیتے ہیں۔ وہ صرف، دیکھنے دکھانے کے ہوتے ہیں، نہ ان میں خوشبو ہوتی ہے نہ اُن سے عرق گلاب اور عطر گلاب بن سکتا ہے۔ نہ ان کی نسل چلتی ہے

کہ ان کا فیض آئندہ بھی جاری رہ سکے۔

قرآنِ مجید کے منجانب اللہ ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ہی یہ ہے کہ اس کی آیتوں میں سدا بہار تر و تازگی ہے۔ اس کے مضامین پر کہنگی عارض نہیں ہوتی۔ ہر دَور اور ہر زمانے میں اس کی آیتوں نے ہمارے غور و خوض کے لئے نت نئے گوشے اور پہلو پیش کئے ہیں۔ زیر بحث آیتوں ہی کو لیجئے۔ ان میں اللہ تعالےٰ عزّ شانہٗ نے انسانوں کی ایک خاص قسم کا ذکر کیا ہے۔ جو رسولؐ کے پاس آتے ہیں تو چکنی چُپڑی اور لچھے دار باتیں کرتے ہوئے آتے ہیں خوشامدانہ انداز میں گفتگو کرتے ہیں۔ دست بستہ نگاہیں جھکائے ہوئے حضورؐ کے سامنے بیٹھے ہیں۔ اور سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی امور کے متعلق کبھی آہستہ آہستہ اور کبھی پُر جوش انداز میں بات چیت کر رہے ہیں۔ ہر جملے کے بعد واللہ باللہ کہتے ہیں۔ اور اپنے ضمیر کی پاکی، نیت کی صفائی اور خلوص پر اللہ کو گواہ ٹھہراتے جاتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ اپنے رسولؐ سے خطاب فرماتا ہے۔ کہ اس خوشامدی کی باتیں تم کو بھلی معلوم ہوتی ہوں گی چکنی چُپڑی باتیں سب ہی کو بھلی معلوم ہوا کرتی ہیں مگر اس کی ساری رجز خوانی ہاتھی کے دانت کی طرح ہے، کھانے کے اور دکھانے کے اور خوب سمجھ لو کہ یہ شخص تمہارے دشمنوں میں سب سے زیادہ جھگڑالو ہے۔ اور دشمنی اور خصومت میں سب سے زیادہ سخت ہے۔ آج حکومت تمہارے ہاتھ میں ہے۔ تم اس مملکت کے سربراہ و حکمران ہو اس لئے یہ میٹھی میٹھی باتیں کر رہا ہے۔ تم کو بھی خوش کر رہا ہے اور بات بات پر اللہ کو بھی شاہد بناتا جاتا ہے۔ کل اگر اس کے ہاتھ میں حکومت آگئی تو دیکھنا سارے ملک میں دوڑا دوڑا پھرے گا۔ اس لئے نہیں کہ زمین کو عدل و انصاف سے بھر دے، ظالم کو سزا دے اور مظلوم کی داد رسی کرے، بلکہ اس لئے کہ اس میں فتنہ و فساد پیدا کرے اور چپّہ چپّہ پر خرابی و تباہی لے آئے۔ یہ میٹھے بول بس اس وقت تک ہیں جب تک قوت و اختیار حاصل نہیں ہے۔ با اختیار ہونے کے بعد اس کا یہ حال ہو جائے گا۔ کہ ذرا کسی سے مخالفت ہوئی، کسی نے اس کے چشم و ابرو کے اشارہ پر کام نہ کیا تو یہ ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ جائے گا۔ اس کی زراعت کو برباد کر دے گا۔ کھیتی باڑی کو اجاڑ دے گا پکی ہوئی فصلوں کو ویران کر کے چھوڑے گا۔ یہ سب اس

لے کرے گا کہ اس کا حریف اور اس کے ساتھی غذا سے محروم رہ جائیں اور تنگ آ کر اس کے چشم و ابرو کے اشارہ پر ناچنے لگیں۔ اگر اس پر بھی وہ باز نہ آئے تو نسل کشی (GENOCIDE) تک سے دریغ نہ کرے گا۔ اے رسولؐ۔ بادشاہ ایسے ہی ہوا کرتے ہیں کہ جس خاندان سے حکومت چھینتے ہیں اس خاندان کو بیخ و بُن سے اکھاڑ کر پھینک دینے کو عین مصلحت سمجھتے ہیں۔ اولاد کو تہ تیغ کرنے، بھوکا پیاسا مارنے اور گھروں میں آگ لگانے تک سے نہیں چوکتے ہمارے سامنے مستقبل بھی حال ہے، ہم جانتے ہیں کہ یہ شخص جو باتیں بنا رہا ہے کل اپنے مخالفوں کے ساتھ اور ان کی اولاد کے ساتھ کس طرح پیش آئے گا۔ جو آج تم کو "ابتر" بے اولاد کہہ کر خوش ہوتے ہیں وہ کل تمہاری نسل کشی کے سامان کر کے تم کو بے نام و نشان بنانے کی کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے، اور ایسی خفیہ اور علانیہ چالیں چلیں گے جس سے ایک ایسا گروہ وجود میں آ جائے جو چُن چُن کر تمہاری نسل کو ختم کر دے۔ اللہ بناؤ سنوار کی کوششوں، تعمیری اور تخلیقی جد و جہد اور اصلاحی مساعی کو تو پسند کرتا ہے۔ مگر فساد اور تباہی کو بالکل پسند نہیں کرتا

خوشامدی اور موذی انسانوں کی اس قسم کے بعد اللہ کہتا ہے۔ کہ آدمیوں کی ایک قسم اور بھی ہے:۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَاللَّهُ رَؤُوفٌ بِالْعِبَادِ (بقرہ آیت ۲۰۷)

(لو اب دوسری قسم کے انسانوں کا حال سنو) کچھ آدمی ایسے بھی ہیں جو اللہ کی خوشنودی کی طلب میں اپنی جانیں تک بیچ ڈالتے ہیں۔ اللہ بھی ایسے بندوں کے لئے سرتا سر شفقت اور مہربانی رکھنے والا ہے۔

اس آیت کا شانِ نزول بھی خصوصی ہے۔ مگر اندازِ بیان عمومی نظر آتا ہے۔ گویا آیت کے تیور یہ بتا رہے ہیں۔ کہ میرا دروازہ قیامت تک کھلا ہوا ہے۔ کسی میں دم ہو تو جان بیچ کر اللہ کی خوشنودی حاصل کرے اور اس کے دامنِ شفقت میں پناہ لے۔ اگر آیت کا انداز عمومی نہ ہوتا تو کہنے والے کہہ سکتے تھے کہ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے

جان کی بازی تو ہم بھی لگانا چاہتے تھے، مگر کریں کیا۔ وحی کا دروازہ بند ہو چکا، ہماری جانبازی کا اعتراف کس طرح ہو گا۔ اور اس کو قبولیت کی سند کیوں کر ملے گی۔ علیؑ کی سی قسمت کہاں سے لائیں کہ ادھر جان بیچی اور ادھر وحی نازل ہوئی۔ ذرا آیۂ "مِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِي" کے پیرایۂ بیان پر نظر ڈالیئے اس کا دامن ان لوگوں کے لئے بھی پھیلا ہوا ہے جو آج کل پرسوں بلکہ قیامت تک جان کی بازی لگا کر اللہ کی شفقت و راحت کے طالب ہوتے رہیں گے لیکن شبِ ہجرت بسترِ رسولؐ پر آرام کی میٹھی نیند سونے والے علیؑ نے جس طرح جان کی بازی لگائی تھی زمانہ اس کی مثال نہ پیدا کر سکے گا۔ ذرا پسِ منظر تو دیکھئے، ماحول پر تو نگاہ ڈالئے۔ علیؑ کس رسولؐ کی خاطر اپنی جان جوکھوں میں ڈال رہے ہیں۔ وہ رسولؐ جس کے قدم ابھی تک کامیابی نے نہ چُومے تھے۔ جس کے گرد مالِ غنیمت کے ڈھیر جمع نہ ہونے پائے تھے۔ اس وقت تو یہ حال تھا کہ مکہ کی سرزمین کا ذرہ ذرہ آنحضرتؐ کی جان کا دشمن تھا۔ ان کے وجود ذیجود کو سماج اور مذہب کے لیے خطرہ سمجھتا تھا۔ ان کے کچھ ساتھی صورتِ حال سے عاجز ہو کر حبشہ کی طرف ہجرت کر چکے تھے، کچھ مدینہ کی طرف قدم بڑھا رہے تھے۔ مکہ میں مسلسل مخالف حالات کا مقابلہ کرتے رہنا یا کفار سے جم کر لڑنا کہاں ممکن تھا۔

حالات بگڑتے بگڑتے نوبت یہ آ پہنچی تھی کہ رسولِ اکرمؐ ــــ کی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ آس پاس کے جتنے سربرآوردہ قبیلے تھے سب نے اپنے من چلے سورماؤں کا ایک منتخب گروہ تیار کر کے بھیج دیا تھا کہ رسولِ اکرمؐ کے گھر کا محاصرہ کرے اور مناسب گھڑی اور موقع پر (خاکم بدہن) آپ پر حملہ کر کے شمعِ رسالت گل کر دے۔ معاملات یہاں تک پہنچ چکے تھے کہ آنحضرتؐ نے علیؑ کو بلا کر کہا۔ "میں گھر سے نکل کر غارِ ثور کی طرف جا رہا ہوں۔ اللہ اگر کرے گا تو وہاں سے مدینہ کی طرف کُوچ کر جاؤں گا۔ دیکھو میری جان کے دشمن گھر گھیرے کھڑے ہیں۔ نیزے بلند ہیں، تلواریں نیام سے نکلنا چاہتی ہیں۔ موت کی بھیانک شکل در و دیوار پر اپنا سایہ ڈال رہی ہے یہ میرا خالی بستر ہے۔ یہ سبز چادر ہے۔ ہتھیاروں کے سایہ میں تم کو اس بستر پر سونا گوارا ہے؟

حضرت علیؑ نے پوچھا۔ "کیا اس طرح یا رسول اللہؐ آپ کی جان بچ سکے گی؟"
رسولِ خداؐ نے جواب دیا "بے شک"

علیؑ نے جرأت کے ساتھ کہا "مجھے منظور ہے۔ میں آپ کے بستر پر آرام سے سو رہوں گا۔ اور آنے والے ہر خطرہ کا خوشی سے مقابلہ کروں گا۔"

الغرض رسولِ عربیؐ کافروں کی آنکھوں میں خاک ڈال کر گھر سے باہر نکل گئے اب کاشانۂ نبوت پیکرِ نبوت سے خالی ہے۔ علیؑ سبز چادر اوڑھے سو رہے ہیں۔ ابوطالبؑ کا دلبر فرزند اور فاطمہ بنت اسد کے گھر کا چراغ اس عمل کا مظاہرہ کر رہا ہے جس کی مشق شعبِ ابی طالب میں کرائی گئی تھی۔ یعنی ایک رات جس بستر پر رسولِ خداؐ آرام فرماتے تھے دوسری رات اس پر علیؑ سوتے تھے تاکہ کوئی کافر شب خون نہ مار سکے۔

اس موقع کی منظر نگاری کرتے وقت قلمکاروں اور خطیبوں نے بڑی بڑی نکتہ آفرینیاں کی ہیں، وہ کہتے ہیں علیؑ درمیانے قد کے تھے، رسولِ اکرمؐ کا قد اچھا خاصہ لمبا تھا، جب وہ کسی کے ساتھ چلتے تھے تو پست نہیں نظر آتے تھے۔ یہ عرب جو اُن کا گھر گھیرے ہوئے تھے، اجنبی نہ تھے بچپن سے ان کو دیکھتے آئے تھے۔ پھر یہ کیا ہوا کہ وہ ساری رات جھانک جھانک کر بستر کو دیکھتے رہے اور یہ نہ سمجھ سکے کہ چادر کے نیچے کوئی دراز قد اُدھیڑ آدمی محوِ خواب ہے یا درمیانے قد کا نوخیز و نوعمر سربلندی کے خواب دیکھ رہا ہے۔ میدان خطابت کے شہسوار اور نکتہ آفرین متکلم تو بڑے حسن و خوبی کے ساتھ اس معاملہ کی توجیہ کرتے ہیں۔ آپ کا دل چاہے تو ان کی سامعہ نواز اور دلکش توجیہہ سُن کر اپنے جذبات عقیدت کو پرمسرت فضا میں بالیدہ ہونے کا موقع دیجئے، وہ کہتے ہیں:۔

"قدرت نے علیؑ کو یہ پہلا موقع دیا تھا کہ چادر کے بقدر پیر پھیلائیں اور جوشِ مسرت اور فرطِ خوشی سے تن کر لیٹیں اور دُنیا کو دکھائیں کہ ان کا قد و قامت مسندِ رسولؐ کے لئے بالکل موزوں ہے، اے علیؑ آج کی رات

آپ کی قسمت کا مقابلہ کون کرسکتا ہے؟ کہ اللہ فخر و مباہات کر رہا ہے، فرشتے رشک کر رہے ہیں اور جو دیکھتا ہے اس کو آپ پر نبوت و رسالت کا گمان ہو رہا ہے۔ خدا نظرِ بد سے بچائے، ابھی عمر ہی کیا ہے؟ آگے چل کر ایسا نہ ہو کہ لوگوں کو آپ پر خدائی کا گمان ہونے لگے۔"

جوشِ عقیدت اور جذباتِ مسرت کو برانگیختہ کرنے کے لئے اور باخلاص — مومنین کو باآوازِ بلند درود بھیجنے کا موقع دینے کے لئے ہمارے نکتہ سنج واعظ اس رات کی تصویر کھینچتے ہوئے یہ بھی بیان فرماتے ہیں۔

" یہ رات پُر از شبہات تھی۔ ساری فضا میں شبہات ہی شبہات تیرتے پھر رہے تھے معلوم نہیں کس بلا کی تاریکی اور قیامت کا اندھیرا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ دکھائی دیتا تھا یا نہیں۔ کہ کافروں کو علیؑ پر رسولؐ ہونے کا گمان ہوا۔ ادھر رسولؐ گھر سے نکل کر غارِ ثور کی طرف بڑھنے لگے خطرے کی موجودگی رات کے سناٹے اور تنہائی کے احساس نے پوری توجہ اس طرف مبذول کر رکھی تھی کہ جس طرح بن پڑے آگے بڑھے چلو تاکہ صبح ہونے سے پہلے پہلے کسی محفوظ مقام پر پہنچ جائیں۔ یکایک پیچھے سے آہٹ ہوئی۔ سناٹے کے وقت تو سوئی کے گرنے کی آواز بھی محسوس ہو جاتی ہے اور یہ تو کسی تیز آنے والے کے قدموں کی چاپ تھی۔ آنحضرتؐ نے خیال فرمایا کوئی کافر میرا پیچھا کر رہا ہے، رفتار کو ذرا اور تیز کر دیا۔ آنے والے نے بھی قدم بڑھا کر رسولِ اکرمؐ کے قریب پہنچنے کی کوشش تیز تر کر دی رسولِ پاکؐ نے جان بچانے کی کوشش میں رفتار کو اور بڑھا دیا۔ یہاں تک کہ قدم مبارک کسی پتھر سے ٹکرانے کی وجہ سے خون آلودہ ہوگیا۔ تعاقب کرنے والے نے پیچھے سے آواز دی" یا رسول اللہؐ تیز نہ دوڑیئے۔ میں دشمن نہیں دوست ہوں"۔ آواز جانی پہچانی تھی۔ آنحضرتؐ کے قدم مبارک رُک گئے۔

موضوع کی خشکی اور آپ کی خستگی کو دور کرنے کے لئے میں نے دو ٹکڑے ایسے پیش کر دیے جو آپ کے لئے خوش آئند سامع نواز اور دلکش ثابت ہو سکیں ورنہ بیان تو یہ ہو رہا تھا کہ اللہ تعالےٰ نے زیر بحث آیتوں میں دو قسم کے انسانوں

کا ذکر کیا ہے۔ ایک تو وہ جو منہ پر چکنی چپڑی اور خوشامدانہ باتیں کرتے ہیں اور ضرورت پڑے تو اپنے مافی الضمیر پر خدا کو بھی گواہ کرتے جاتے ہیں۔ مگر حقیقت میں ان کے دل و زبان میں مطابقت نہیں ہوتی۔ اللہ اپنے نبی کو اطلاع دے رہا ہے کہ یہ حصولِ جاہ اور طلبِ اقتدار کے لئے تمہارے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ ان کی دور رس نظر نے ان کو بتادیا ہے یا کسی ستارہ شناس کاہن نے ان کو خبر دے دی ہے کہ ایک دن تمہارا نیرِ اقبال بامِ عروج پر پہنچ کر رہے گا۔ لہٰذا یہ تمہارا دل لبھانے اور تم کو خوش کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں مگر دل میں یہی آرزو پوشیدہ ہے کہ کسی طرح بامِ اقتدار تک رسائی مل جائے۔ جب کسی ملک کی عنانِ اقتدار ان کے ہاتھ میں آجاتی ہے تو پھر ان کے اصلی جوہر نظر آتے ہیں، ان کی خود غرضی اور ستم رانی ایک طرف، غذائی صورتِ حال کو خراب کرنے کے لئے باغوں کو برباد کردیتا ہے۔ کھیتوں کو تباہ کر ڈالتی ہے۔ دوسری طرف ان جانوروں کی نسل کشی پر آمادہ ہوجاتی ہے۔ جو کسی ملک کی زرعی، غذائی اور نقل وحمل کی آسانیوں کی فلاح و بہبودی کا باعث ہوتے ہیں۔ بڑھتے بڑھتے ان کا ستم آفریں اور ہلاکت خیز ہاتھ اپنے حریفوں اور مخالفوں کا قلع قمع کرنے پر بھی آمادہ ہوجاتا ہے۔ اس کرۂ ارض پر فلکِ پیر بہت سے ایسے نظارے دیکھ چکا ہے۔ فاتح قومیں اپنے مفتوح حریفوں کا کلیتہً ختم کردینے کے منصوبے بروئے کار لاچکی ہیں۔ تاریخ کی ورق گردانی کرنے سے یہ حقیقت عریاں ہوجاتی ہے کہ وقتاً فوقتاً بادشاہ، سلطان ملک، راجہ اور مہاراجہ کے القاب و آداب سے ایک گروہ دنیا پر مسلط ہوتا رہا ہے۔ اپنی بقاء اور کامیابی کے لئے اور اپنے اثرات کی توسیع کے لئے اس گروہ نے دو حربوں سے کام لیا ہے

۱۔ اپنے ہواخواہوں کی دل کھول کر مدد کی، ان کو وسائلِ حیات اور ذرائع معاش سے مالا مال کردیا ان کو پھولنے پھلنے اور دوسروں پر مسلط ہونے کی ساری سہولتیں مہیا کیں۔

۲۔ جن پر مخالفت کا ذرا سا بھی شبہ ہوا ان پر عرصۂ حیات تنگ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ تہمتیں لگائیں عوام کی نگاہ میں ان کو سبک کرنے کے لئے ان کے

متعلق غلط افواہیں پھیلائیں۔ ان پر وسائلِ معاش یکسر بند کردیے۔ بالآخر ان کی نسل کشی سے بھی دریغ نہیں کیا

یہ مرقع اور منظر تاریخ کے ہر دور میں نظر آتا ہے۔ مصر کے فرعونوں، عراق کے نمرودوں ایران کے کسراؤں، روم کے قیصروں اور روس کے زاروں کا تو نام ہی بدنام ہے مسلمان جو اپنے آپ کو خیر الملل اور اشرف الامم کہتے ہوئے نہیں تھکتے، ان کی تاریخ بھی اس خونریز اور روح فرسا عمل سے خالی نہیں ہے۔ تاریخ اسلام کے نام سے جو کتابیں ہمارے درس میں داخل ہیں وہ دراصل مسلمانوں کا شاہنامہ ہیں جس میں ہر اس شخص اور خاندان کی قصیدہ خوانی کی گئی ہے۔ جو موافق حالات اور سازگار وسائل کی مدد سے کسی قوم، ملک یا معاشرے کے کاندھوں پر "پیر تسمہ پا" کی طرح سوار ہوگیا تھا۔ اور اس وقت تک چمٹا رہا جب تک نشۂ دولت نے اس کو اتنا بے دست و پا کردیا کہ اس ملک و قوم یا معاشرے نے اس کو چاروں شانے چت زمین پر گرا دیا۔ ورنہ اسلام سے بادشاہوں کو کیا واسطہ اور امن و ترقی کی اس تحریک کا ملوکیت سے کیا تعلق ہے

اسلام کا شاہنامہ لکھنے والے

اسلام کو شاہی سے تعلق کیا ہے؟

کون نہیں جانتا کہ شاہی اور سلطانی ایک جداگانہ دین اور ایک بالکل علیحدہ مسلک ہے۔ شرق وغرب میں لیلائے حکومت کے مجنوں ہر دور اور ہر عہد میں پیدا ہوتے رہے ہیں۔ وہ کالوں کے دیس پر مسلط رہے ہوں۔ یا گوروں کے سر پر سوار رہے ہوں ان کا کلمہ ایک ہی رہا ہے۔ "انا و لا غیری" بس شاہی میرا حق ہے۔ میرے سوا کون ہے جو میرا شریک و سہیم ہوسکے۔ ان کا طریق کار اور طرزِ عمل ہمیشہ یہ رہا ہے کہ اپنی راہ میں حائل ہونے والی ہر رکاوٹ کو جبر و تشدد سے ہٹا دیتے ہیں اور جب تک کسی عقیدے اور مذہب سے ان کی حکومت کو مدد ملتی ہے اس کا ساتھ دیتے ہیں۔

لیکن جب اللہ، رسول، امام بلکہ اپنے باپ اور بیٹے تک کو اپنی راہ میں رکاوٹ پاتے ہیں تو ان کا خاتمہ کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔

یہ ہے مسلک سلطانی اور دین شاہی، آپ کو اللہ کے سامنے سر بسجود ہونے والے بادشاہ بھی ملیں گے اور اللہ کے احکام اور آئین کے خلاف صف آرا ہونے والے سلاطین بھی نظر آئیں گے کسی رسولِ خدا سے حکومت کی بھیک مانگنے والے شاطر بھی ملیں گے اور اللہ کے کسی رسول کو موت کے گھاٹ اتارنے والے حکمران بھی ملیں گے۔ اماموں کے قدم چومنے والے بادشاہ بھی ملیں گے۔ اور ان کو زہر دغا کا جام پلانے والے بادشاہ بھی ملیں گے باپ کے سامنے آداب و کورنش بجالانے والے سلاطین بھی ملیں گے اور باپ کو قید خانے میں بھیجنے والے سلاطین بھی دکھائی دیں گے ہاں بیٹے کو قتل کر کے ملول نہ ہونے والے بادشاہ بھی دکھائی دیں گے اور بیٹے کی خاطر دین و ایمان بیچنے والے بادشاہ بھی نظر آئیں گے۔ لیکن ان کی ہر حرکت حفظِ سلطنت اور توسیع مملکت کے لئے ہو گی کہ دین سلطانی اور آئین شاہی کا اساس اسی پر ہے۔ ورنہ اخلاقی اقدار اور انسانی معیار سے دو چار کے سوا کسی صاحب تخت و تاج کو سروکار نہیں رہا۔ دوسروں کو چھوڑیئے مسلمان بادشاہوں پر نظر ڈالئے قیصر و کسریٰ کے یہ جانشین اور ہٹلر و مسولینی کے یہ پیشرو ظلم و ستم اور قتل و غارت میں کس سے کم تھے؟ جو آیتیں آغازِ تقریر میں پیش کی گئی ہیں ان میں اللہ تعالیٰ نے اسی قسم کے لوگوں کا ذکر کیا ہے جو کسی ملک پر مسلط ہو کر اسمیں فتنہ و فساد پھیلاتے ہیں۔ کھیتوں کو برباد اور نسلوں کو ختم کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے اللہ تعالےٰ نے فرماتا ہے یہ لوگ اپنے منہ میاں مٹھو بنتے ہیں۔ اپنے آپ کو ظل اللہ کہہ کر اتراتے ہیں، مگر نہ یہ ہمارے نمائندے ہیں نہ ان کے افعال و اعمال پر ہماری مہرِ تصدیق ثبت ہے۔ وہ اپنے باپ دادا کے جانشین ہونگے۔ اس سازشی ٹولے کے نمائندے ہوں گے جس نے ان کو تسلط حاصل کرنے میں مدد دی ہے۔ ہمارا ان سے کوئی تعلق نہیں زمین ہماری ہے اس پر بسنے والوں کو ہم نے پیدا کیا ہے۔ اور ان کی رہنمائی اور ان کے معاملات کے انتظام کے لئے ایک سیدھا سادہ طریقہ مقرر کر دیا ہے اور وہ وہی ہے جو ہم نے آفرینشِ آدم کے وقت فرشتوں کو بتا دیا تھا۔ "اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً" بلاشبہ زمین پر (اپنا) نائب مقرر کرنا میرا کام ہے۔ زمین پر اپنی نیابت کے لئے کسی کو مقرر کرنا میرے اختیاراتِ تمیزی میں سے ہے۔ فرشتوں جیسے معصوم مخلوق کے اس اجتماع نے بصد ادب گزارش کی۔ اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ

یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِکُ الدِّمَاءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِکَ وَنُقَدِّسُ لَکَ (کیا تو اس سرزمین پر ایسی ہستی کو (اپنا نائب) مقرر کرے گا۔ جو وہاں فتنہ و فساد پھیلائے اور خونریزی کرے حالانکہ ہم (موجودہ ہیں جو) تیری حمد و ثنا کی تسبیحیں پڑھتے اور تیری تقدیس کی زمزمہ خوانی کرتے ہیں)۔

ذرا اس منظر کو اپنی نگاہوں کے سامنے لانے کی کوشش کیجئے۔ کرۂ زمین پر سبزۂ خودرو کا فرش بچھ چکا ہے۔ دامنِ کہسار میں تناور درخت کھڑے ہیں۔ میدانوں میں ثمردار پودے پھل پھول رہے ہیں۔ کہیں گلپوش جھاڑیاں ہیں، کہیں ہری بھری بیلیں درختوں پر چڑھی ہوئی ہیں۔ پرندے حمدِ باری کے گیت گا رہے ہیں اور چرندے میدانوں میں کلیلیں کر رہے ہیں۔ نیلگوں آسمان پر ستارے بھی چمکتے ہیں، چاند بھی نکلتا ہے۔ سورج بھی ضیا پاشی کرتا ہے۔ مگر بزم ہے، بزم آرا نہیں ہے۔ برات ہے مگر دولہا کا پتہ نہیں ہے دنیا کے سناٹے کو چہل پہل سے بدلنے کیلئے اس وادیٔ خاموش کو قہقہوں اور پرمسرت نعروں سے معمور کرنے کیلئے، ہاں زندگی کو مقصد عطا کرنے کیلئے اللہ تعالےٰ نے حضرت انسان کی تخلیق کا ارادہ کیا ہے۔ اور اپنے ارادے سے فرشتوں کو مطلع فرمایا۔ وہ کہنے لگے تو معبود ہے ہم تیری عبادت کرتے ہیں۔ تو محمود ہے۔ ہم شب و روز تیری حمد و ثنا میں مصروف رہتے ہیں۔ اگر زمین کو آبادی کرنا ہے تو یہ خدمت ہم سے لے۔ کرۂ ارض جولانگاہِ عمل بنانا ہے تو ہم میں کیا کمی ہے؟ یہ معصوم، نوری اور سراپا عبادت مخلوق کا اجتماعی معروضہ تھا۔ مگر اللہ جلّشانہ نے فرشتوں کے اس نمائندہ اجلاس، روحانیوں کے اس یکزبان اور ہم آواز اجتماع کی درخواست کو شرفِ قبولیت نہیں بخشا۔ ارشاد ہوا یہ ہمارے خصوصی اختیارات ہیں۔ ہدایت اور نیابت کا معاملہ اس قدر ٹیکنیکل اور اہم ہے کہ اس کے بارے میں جمہوری رائے کی مداخلت کو ہم گوارا نہیں کر سکتے۔ اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (بے شک میں جو کچھ جانتا ہوں تم نہیں جانتے) اور یہ کیا کہا کہ کہیں وہ خلیفہ فتنہ و فساد نہ پھیلائے اور خونریزی نہ کرے۔ ہم علیم و خبیر ہیں حکیم و بصیر ہیں۔ ہمارا بنایا ہوا نائب، مقرر کیا ہوا خلیفہ، بھیجا ہوا ہادی فساد کیوں پھیلانے لگا۔ خون ریزی کیوں کرنے لگا۔ ہم تو نیکی کا سرچشمہ اور خیر کا منبع ہیں۔ ہماری طرف سے جو مقرر ہو گا وہ "اسلام" اور "ایمان" ہی

پھیلائے گا۔ سلامتی اور امن ہی کے قیام کی کوشش کرے گا۔

بیشک تم فرماں بردار بندے اور اطاعت گزار مخلوق ہو۔ ہر وقت رکوع و سجود میں مصروف رہتے ہو مگر یہ زندگی کا ایک رخ ہے۔ ہماری ذات اور صفات۔ ہر آن اور ہر لمحے ہماری صفاتِ کاملہ کا ظہور نئے نئے انداز سے ہوتا رہتا ہے تو ہماری نیابت اور خلافت کیلئے بھی ایسی ہی مخلوق کی ضرورت ہے جو ہماری ذات وصفات کا مظہر بن سکے یہ رموزِ قدرت ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ہماری نیابت کن صفتوں کی متقاضی ہے۔ تمہارا اجماعی اور جمہوری معروضہ ہم نے سُنا۔ مگر آج ہم اس کو تسلیم کرلیں۔ تو کل دوسروں کے جمہوری مطالبوں کو بھی ماننا پڑے گا۔

دوسرے لفظوں میں یوں سمجھ لیجئے کہ اللہ تعالیٰ عز شانہٗ نے اس حقیقت کو آشکار کیا ہے کہ ہماری نیابت اور خلافت ایک روحانی منصب اور ہدایت وارشاد کا عہدہ ہے، اس لئے اس کے انتخاب کا کام کسی دوسرے کے سپرد نہیں کیا جاسکتا۔ جس طرح مدرسہ کے طالب علم اپنا استاد خود منتخب نہیں کرسکتے۔ دس ہزار مریض مل کر چاہیں تو کسی راہ گیر کو حکیم و ڈاکٹر نہیں بنا سکتے۔ اسی طرح جہالت و ناواقفیت کی ماری ہوئی مخلوق میں یہ طاقت کہاں کہ وہ اپنا ہادی، رہنما اور رہبر منتخب کرسکے۔

اللہ تعالےٰ فرماتا ہے "اِنِّي جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَه" یہ ازل سے ہمارا امتیازی حق اور خصوصی امتیاز ہے۔ اپنی مخلوق کی ہدایت کا انتظام ہم کرتے آئے ہیں اور کرتے رہیں گے
سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۝ الَّذِي خَلَقَ فَسَوّٰى ۝ وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدٰى ۝
(اس عالی شان پروردگار کے نام کی تسبیح کیا کرو۔ جس نے (ہر چیز کو) پیدا کیا۔ پھر (اعضاء وجوارح کو) درست کردیا۔ پھر اس کا ایک اندازہ مقرر کرکے اس کی ہدایت کا سامان مہیا کیا)

کائنات کا ذرہ ذرہ یہ پکار رہا ہے کہ اللہ جب کسی چیز کو خلعتِ وجود بخشتا ہے تو اس کی ہدایت کا سامان بھی خود ہی مہیا کرتا ہے۔ انسان مِل جُل کر رہنے والا جاندار ہے وہ تمدنی زندگی بسر کرتا ہے دوسرے (Social Being) مل جُل کر رہنے والے جانداروں کے معاشرے پر نگاہ ڈالو۔ دیمک، شہد کی مکھی، ہاتھی، گھوڑے، ہوا میں اڑنے والے، بکبر جھیلوں میں زندگی گزارنے والی بطخیں، دیکھو یہ سب کے سب قدرت کی طرف سے

مقرر کئے ہوئے قائد کی زیرِ نگرانی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کا قائد نہ کسی جمہوری ادارہ کا منتخب کردہ ہوتا ہے نہ کسی مکتب اور اسکول کا پڑھا ہوا ہزاروں سال سے قدرت خود قیادت اور ہدایت کا فن ان کو ودیعت کرتی آئی ہے۔ اور صبح آفرینش سے لے کر آج تک نسلِ قیادت کا ایک طویل سلسلہ اس معاشرہ کی رہنمائی کرتا چلا آیا ہے۔

جو اربابِ بصیرت دیمک کے مسکن، شہد کی مکھی کے چھتے، ہاتھیوں کے غول، جنگلی گھوڑوں کے گلے اور قازوں، تلیروں اور مرغابیوں کی ڈاروں کی تنظیموں کا غائر مطالعہ کرتے ہیں۔ ان کو نظر آجاتا ہے کہ لاکھوں سال سے الہی قیادت اور رہبری کا ایک سلسلہ ہے جو باپ سے اولاد کی طرف سے منتقل ہوتا چلا آیا ہے اور یہ قائد اپنے فرائض میں اس قدر ماہر اور قابل ہیں کہ سرمو غلطی نہیں کرتے۔

مرغابیاں سردی اور گرمی میں ایک خطہ سے دوسرے خطہ کی طرف ہجرت کرتی ہیں اور اگر راہ میں ان کا قائد قضائے الہی کا شکار ہوجاتا ہے تو اس کی نسل سے دوسرا قائد آگے بڑھ کر اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ اور یہ کارواں اسی طرح اپنی راہ پر آگے بڑھنے لگتا ہے۔ فطری قیادت اور قدرتی رہنمائی اور رہبری کے یہ کرشمے ہوش وگوش رکھنے والوں کے لئے ایک درسِ نصیحت رکھتے ہیں۔

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی، مضمون میں سے مضمون پیدا ہوتا گیا۔ میں یہ بیان کر رہا تھا کہ اللہ فرماتا ہے کہ خوشامدی اور چکنی چپڑی باتیں کرنے والے لوگ جب تک بامِ اقتدار پر نہیں پہنچتے، اس وقت تک بھیگی بلی بنے رہتے ہیں مگر جیسے ہی تسلط و اقتدار حاصل ہوجاتا ہے تو ان کا مزاج بدل جاتا ہے۔ اس اقتدار کو ہمیشہ اپنی اور اپنے خاندان کی میراث بنانے کے لئے وہ فتنہ وفساد کا حربہ استعمال کرتے ہیں اور حرث ونسل کو تباہ کرکے اپنی بقاء وگرفت کو مضبوط کرنا چاہتے ہیں۔ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ (اللہ اس فتنہ و فساد کو پسند نہیں کرتا) ہاں انسانوں کا ایک دوسرا گروہ ہے جن پر اللہ مہربان ہے جن کو اللہ پسند کرتا ہے یہ وہ لوگ ہیں جو جان پر کھیل کر بھی اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے سے دریغ نہیں کرتے (ومن الناس من يشري نفسه ابتغاء مرضات الله) بے شک بظاہر

یہ آیت عمومی شان رکھتی ہے مگر تاریخ کے ورق الٹ جائیے، بے غرضی بے نفسی ایثار اور مواسات کا جو نمونہ شب ہجرت حضرت علیؑ نے پیش کیا ہے اس کی مثال نہ مل سکے گی ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ محمد عربیؐ ابھی بادشاہ نہیں بنے تھے۔ دولت نے ان کے گرد گھیرا نہیں ڈالا تھا۔ ان کا درخشاں مستقبل ابھی مایوسیوں کی گھٹا میں چھپا ہوا تھا۔ وہ کسی کو پناہ دینے کے بجائے پناہ ڈھونڈنے جا رہے تھے جو وطن سے نکلنے پر مجبور ہو۔ جس کو اس کی قوم نے قبول نہ کیا ہو۔ اس رسولؐ کی خاطر ایک اٹھتی ہوئی جوانی اور زیر ارمان شباب تلواروں کے زیر سایہ، نیزوں کی زد کے قریب اور تیروں کے نشانے کی حد میں آرام کی میٹھی نیند سو رہا ہے۔ سونے والا واقف ہے۔ اور خوب واقف ہے کہ سارا مکہ آمنہؑ کے لال اور عبد اللہؑ کے فرزند کے خون کا پیاسا ہے اور تازہ دم خونخواروں کا ایک گروہ کانٹے سے لیس ہو کر اس انتظار میں کھڑا ہے، کہ قبیلے والوں کی ذرا آنکھ جھپکے اور مکہ کے در و دیوار پر ذرا نیند کا افسون چھا جائے، تو یہ بستر پہ پل پڑیں اور سونے والے کا قیمہ کر کے رکھ دیں۔ مگر اللہ رے سکونِ قلب اور واہ رے جذبۂ ایثار۔ سبز چادر اوڑھ کر اس طرح سوئے کہ اس وقت تک کروٹ بھی نہ بدلی۔ جب تک قاتل گروہ کے سردار نے چادر الٹ کر منہ نہ دیکھ لیا۔ اور تعجب سے یہ نہ پوچھ لیا۔

"علیؑ تم یہاں کہاں؟ بتاؤ تو سہی تمہارے ابنِ عم کیا ہوئے؟ کدھر چلے گئے؟"

چمکتی ہوئی تلواروں، سربلند نیزوں، کاندھے پر لٹکی ہوئی کمانوں اور ترکش میں چھپے ہوئے تیروں پر ایک نگاہ غلط انداز ڈال کر علیؑ نے جواب دیا:۔

"کیا تم ان کو میری تحویل میں دے گئے تھے؟"

جس طرح کفار، رسولِ اکرمؐ سے واقف تھے اسی طرح ان کے اس جانباز باڈی گارڈ کو بھی جانتے تھے۔ جو بچپن ہی سے اپنے بھائی، رہبر، اور ہادی کی حفاظتِ جان میں مصروف رہا تھا۔ اور مکے کے گلی کوچوں میں آگے بڑھ کر ان شریروں کو سزا دیتا تھا جو رسولِ اکرمؐ سے گستاخی کرنے کی جرأت کرتے تھے۔ اس دلیر بھائی کے پُرسکون جواب پر وہ عش عش کر گئے اور اللہ نے اپنے رسولؐ کو خبر دی، تمہارے بھائی نے تلواروں، نیزوں اور کمانوں

کی زد میں اطمینانِ نفس کا ثبوت دے کر ہماری مرضی اور خوشنودی حاصل کر لی ہے۔ اللہ اپنے ایسے بندوں پر مہربان رہتا ہے (وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَشْرِیْ نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ)

سُنّی اور شیعہ دونوں مفسروں نے تسلیم کیا ہے کہ یہ آیت واقعۂ ہجرت سے متعلق ہے حضرت علی علیہ السلام کی شان میں ہے۔ مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جب یہ آیت علیؑ کی مدح خوانی اور ثنا گوئی کر رہی ہے تو اس میں ان کا نام صاف طور پر کیوں نہیں لیا گیا ہے۔ کیا اللہ کسی سے ڈرتا تھا، یا گول مول باتیں کر کے مخلوق کو اُلجھن میں ڈالنا چاہتا تھا۔ بھائی غور کیجئے نام لینے سے کیا فائدہ ہوتا۔ یہی نا کہ لوگ آسانی سے پتہ چلا لیتے کہ یہ آیت علیؑ کے شان میں نازل ہوئی ہے اور شک و شبہ اور بحث و مباحثہ کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ مگر سادہ لوح مخاطب نام لینے سے جھگڑے ختم نہیں ہوا کرتے، بد باطن اور بد نیت لوگ نام سن کر بھی یہی کہتے رہتے ہیں کہ ایک نام کے بہت سے لوگ ہوتے ہیں کیا معلوم اس سے کون ہستی مراد ہے۔"

اگر نام سے ذات متعین ہو جایا کرتی تو "رسولاً یاتی من بعدی اسمہ احمد" کے نازل ہونے کے بعد گورداسپور کی تحصیل کے کسی آدمی کو یہ جرأت نہ ہوتی کہ اس سے میری ذات مراد ہے۔ فرض کرو کہ اس آیت میں "علیؑ" کا نام صاف بیان ہوتا تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ اس سال عرب میں جتنے بچے پیدا ہوتے ان کا نام علیؑ نہ رکھ دیا جاتا۔ اور پھر حال یہ نہ کہتے لگتی کہ اس سے فاطمہ بنت اسد کا لال نہیں بلکہ میرا چاند مراد ہے۔ معلوم ہوا کہ صرف نام شخصیت کے تعین کے لئے کافی نہیں ہوا کرتا نام آسانی سے رکھے جا سکتے ہیں کسی نے اپنی مرغی کا نام نورجہاں رکھ لیا تھا۔ مگر اس نام کی وجہ سے وہ "ملکۂ ہند" نہیں بن گئی ہاں اگر صفات و خصوصیات کا ذکر ہو تو جس ذات میں وہ صفتیں اور خصوصیتیں پائی جائیں گی وہی ذات مراد و مطلوب قرار پائے گی۔

آیئے ایک اور گوشے پر نظر ڈالیے، اگر اس آیت میں نام آجاتا تو ایک طرف تو اس کا دوام ختم ہو جاتا۔ شب ہجرت کے بعد اس کا دروازہ بند ہو جاتا اور بس اس کی تاریخی اہمیت رہ جاتی۔ کہنے والے کہتے رہتے کہ اب جان کی بازی لگا کر اللہ کی مرضیاں حاصل کرنے

سے کیا فائدہ ہے۔ ہمارے لئے تو آیت تواترنے سے رہی، دوسری طرف نام سے وہ مطلب بھی حاصل نہ ہوتا۔ جو آپ کے پیش نظر ہے۔ یعنی صفات وخصوصیات سے شخصیت کا جو تعین ہوسکتا ہے وہ نام لینے سے نہیں ہوتا اللہ رے اعجازِ بیان، ندرت نے الفاظ کی ترتیب اس حسن وخوبی سے کی ہے کہ شانِ عمومیت باقی ہے۔ آیت اپنے دامن میں بقاو دوام کی دولت لئے ہوئے ہے مگر اس کے مصداق کی صفات کو اس طرح بیان کیا گیا ہے، کہ صاف نظر آجاتا ہے کہ ان کا نقطۂ عروج اور معراجِ کمال علیؑ کی ذات کے سوا دوسرے میں پایا ہی نہیں جاتا۔ لوگ گزرے ہیں، جنہوں نے تحصیل دولت وجاہ، حصولِ شہرت ومملکت نفسانی خواہشوں اور جنسی لذتوں کے لئے جانیں دی ہیں اور یہ سلسلہ رہتی دنیا تک باقی رہے گا۔ لیکن صرف خوشنودیٔ خدا کے حصول کے لئے اپنی دولت، عزت، شہرت اور خاندان ہی کو نہیں بلکہ اپنے نفس تک کو قربان کر دینے والے دنیا میں کب اور کتنے گزرے ہیں۔ علیؑ اس میدان میں اپنی نظیر آپ ہی ہیں اور اگر اس صفت میں کوئی ان کی پیروی کر سکا ہے تو وہ انہی کے گھرانے والے ہیں جنہوں نے فرات کے کنارے جلتی ہوئی ریت پر علوی ایثار اور حیدری قربانی کی رسم پارینہ کو زندہ کر کے اس آیت کی وسعتوں میں اپنے لئے جگہ پیدا کرلی۔

سرزمینِ مکہ پر ایک علیؑ کی جانفروشی کا نمونہ دیکھ چکے، آیئے فرات کے کنارے دوسرے علیؑ کی جانبازی کا منظر دیکھئے، عراق کی سرزمین اور فرات کا کنارہ بہت سی تہذیبوں اور تمدنوں کا گہوارہ رہ چکا ہے۔ "حمورابی" جیسے بادشاہ، نمرود جیسے قہرمان، ابراہیمؑ جیسے نبی اسی خاک سے پیدا ہوئے تھے۔ چشم فلک نے یہاں قوموں کے عروج و زوال کی بہت سی مثالیں دیکھی ہیں۔ آج وہی تاریخی سرزمین دھوپ کی شدت سے انگارہ بن گئی ہے بلا کی گرمی ہے، لُو چل رہی ہے پیاس کے مارے زبانیں تالو سے لگ گئی ہیں۔ زمین حرارت اگل رہی ہے اور آسمان شعلے برسا رہا ہے۔ امام حسین علیہ السلام کے خیمے دریا سے دور تپتی ریت پر نصب ہیں۔ تین روز سے پانی بند ہے۔ خیموں کے اندر بچے العطش العطش کی آوازیں بلند کر رہے ہیں۔ باہر من چلے سورما ہونٹوں پر خشک زبان پھرا رہے ہیں۔ امامؑ عالی مقام کا یہ حال ہے کہ صبح سے دوپہر تک بہت سے دوستوں اور

عزیزوں کو کھو چکے ہیں اور بہت سوں کی لاشوں پر رو چکے ہیں۔ یار وانصار کا مجمع گھٹتا جا رہا ہے اور اندوہ و یاس کا ہجوم بڑھتا جا رہا ہے۔ عربوں کی مہمان نوازی ہر زمانے میں مشہور رہی ہے۔ مگر کوفہ میں رہ کر عرب اپنی اس "تاریخی خصوصیت" کو بھی کھو بیٹھے تھے۔ نبیؐ کے نواسہ کو مہمان بلایا۔ اور کھانے پینے کے بدلے تیر و تبر سے ان کی مہمانی کی۔

غور سے دیکھئے وہ سامنے نہرِ فرات موجیں مار رہی ہے۔ اس سے ذرا ہٹ کر میدان کشتوں سے پٹا پڑا ہے۔ فاطمہؑ کی نسل کے کیسے کیسے جوان موت کی آغوش میں پڑے سو رہے ہیں۔ صبح سے اس وقت تک حضرت امامؑ کا یہ حال ہے ؎

کبھی لاش اٹھائی کبھی رو دیے

اسی شغل میں شاہ دن بھر رہے

کوئی برسوں کا ساتھی، عمر بھر کا رفیق، گود کا پالا، گھر کی رونق، آنکھوں کا اُجالا رخصت طلب کرتا ہے وداعی سلام کر کے فوجوں کی طرف بڑھتا ہے۔ میدان میں جا کر دادِ شجاعت دیتا اور مظاہرہ ہمت وجرأت کرتا ہے۔ مگر ایک اور ہزاروں کا مقابلہ کیا صفیں اُلٹ دیتا ہے۔ غنیم کی فوجوں کو پیچھے ہٹا دیتا ہے۔ لیکن تین روز کی بھوک پیاس بالآخر غالب آتی ہے۔ ہزاروں آدمی یکہ وتنہا کو آکر گھیر لیتے ہیں۔ گھوڑے سے گرنے لگتا ہے تو اپنے آقا و مولا کو آگاہ کرتا ہے۔ کہ "میں نے حق رفاقت ادا کر دیا ہے۔ اب موت سامنے کھڑی ہے۔ مولا! ہو سکے تو مرنے والے کو زیارت کا موقع دیجئے کہ آنکھیں آپ کا جمالِ جہاں آرا دیکھ کر بند ہوں اور دوسری دنیا میں جب کھلیں تو آپ کے نانا کا چہرہ سامنے نظر آئے حضرت افتاں وخیزاں میدان کی طرف بڑھتے اور جانباز ساتھی یا دنیا سے رخصت ہونے والے عزیز کی لاش پر جا کر اس کی تسلی وتشفی کرتے۔ صبح سے یہی ہو رہا تھا۔ بہادر سپہ سالار ایک ایک کر کے اپنے سپاہیوں کو لڑتے گرتے اور موت کی آغوش میں سوتے دیکھ رہا تھا۔ یکایک نگاہوں نے علی اکبرؑ کو آگے بڑھتے دیکھا۔ اٹھارہ سال کا سن ہے، ذرا اس ہاشمی بہادر کے چہرہ پر غور کرو۔ ہو بہو رسولِ عربیؐ کی تصویر ہے۔ چاند سے چہرے پر کاکلیں بکھری ہوئی ہیں بچپن کا بھولا پن رخصت

ہو رہا ہے اور شباب کی رعنائیاں اس کی جگہ لے رہی ہیں۔ لو وہ علیؑ اکبر باپ کے قریب پہنچ گئے۔ سامنے سر جھکائے کھڑے ہیں حسینؑ حسرت و یاس سے بیٹے کی طرف نگاہ کر رہے ہیں، شاید جوان بیٹا مرنے کی اجازت لے رہا ہے؟ جہاد کی رخصت مانگتا ہے؟ دین پر آنچ آنے لگے، ایمان خطرے میں ہو تو دفاع واجب ہے امامؑ امر واجب سے کیونکر روک سکتے ہیں۔ مگر شاید فرض اور محبت میں کشمکش ہو رہی ہے۔ فرض کا تقاضا ہے ہر تندرست کار آمد اور بالغ سپاہی کو میدان کی طرف جانے سے نہ روکا جائے اور محبت ری ہم شبیہ پیغمبرؐ کو چند ساعت اور زندہ دیکھنا چاہتی ہے۔

ارشاد فرما رہے ہیں "بیٹا خیمہ کے اندر جاؤ۔ اپنی ماں سے رخصت ہو لو۔ پالنے والی پھی سے اجازت لو۔ بہنوں کو گلے لگا کر وداع کرتے آؤ" لو وہ اٹھا۔ ہم شبیہ پیغمبرؐ اندر ل ہوئے۔ کس کو معلوم ہے کہ اندر کیا ہوا؟ جب جوان بیٹے نے مرنے کی اجازت مانگی ں پر کیا گزری؟ بھتیجے پر جان چھڑکنے والی پھوپھی نے دل پر صبر کی سل رکھ کے کیونکر زت دی۔ بہنوں نے بھائی کو ہاں اس بھائی کو جس کی شادی کا ارمان تھا۔ کس طرح ست کیا۔ ہاں "تذکرہ نگاروں اور غم و الم کی خیالی تصویر کھینچنے والوں نے اتنا بتایا ہے ب حضرت زینبؑ نے سمجھ لیا کہ موت ٹل ہی نہیں سکتی اور جانباز بھتیجا میدان کی طرف جائے سے گا۔ تو انہوں نے علی اکبرؑ سے کہا "جاتے تو ہو مگر آخری بار زلفیں تو سنوار لینے صبح سے یہ وقت ہونے آیا تھا۔ کربلا کی ریت کپڑوں پر جم چکی تھی۔ پانی کہاں تھا جو منہ ھلائیں۔ ہاں صرف ستھرا لباس پہنا کر رخصت کیا جب علی اکبرؑ سب کو سلام کرکے ے نکلنے لگے تو ہر آنکھ آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ کیونکہ سب کو نظر آ رہا تھا کہ یہی جوڑا کفن بنے گا۔ اور یہ صاف ستھرے کپڑے جلد ہی خون سے رنگین ہو جائیں گے۔

ں ذرا غور سے دیکھیئے۔ مادر علی اکبرؑ اپنے خیمہ میں سر جھکائے بیٹھی ہیں۔ کلیجہ میں ہوک ا ہے، آنسو امنڈ امنڈ کر آ رہے ہیں۔ اپنی اولاد کی فکر نہیں، ایسے لاکھ بیٹے ہوں تو ت پڑے قربان کر دیں۔ مگر دل و دماغ پر اثر ہے۔ اس حادثہ کا جو جلد ہی پیش ہے اور جس کے ٹالنے کے لئے ہزاروں تدبیریں اور سینکڑوں دعائیں بروئے کار

آچکی ہیں۔ مگر وہ خطرہ ہے کہ لمحہ بلمحہ قریب نظر آ رہا ہے۔ دل میں یہ تصورات آ جا رہے ہیں" ہائے اس امت جفا کار نے نبیؐ اور آل نبیؐ کی قدر نہ کی۔ چہیتی بیٹی دنیا سے پہلو شکستہ گئی علیؑ کوفہ کی مسجد میں تلوار کا نشانہ بنے، زہر ہلاہل پلا کر حسنؑ کا کام تمام کیا گیا۔ پنجتن پاک کی آخری نشانی اب حسینؑ زندہ رہ گئے ہیں ان پر بھی آج مصائب کا ہجوم اور آلام کا انبار ہے تین روز گزرے کہ آب و دانہ بند ہے اور آج تو صبح ہی سے قیامت کے آثار نمایاں ہیں ہر گھڑی ایک نئی سنائی آتی ہے۔ اور ہر لمحہ کسی عزیز قریب یا یاور و رفیق کے قتل کی خبر لے کر آتا ہے۔ خدایا یہ اٹھارہ سال کا جوان رعنا یہ تیرے نبیؐ کی جیتی جاگتی تصویر اسلام کی راہ میں قربان ہونے جا رہی ہے۔ پروردگارا ہماری اس قربانی کو قبول کر۔ اور اپنے نبیؐ کے نواسے کی جان بچا لے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ جوان بیٹا اپنے باپ کا فدیہ بن سکے۔ خدایا! میرے دل کو یہ قوت عطا فرما کہ اٹھارہ سال کے بیٹے کو خاک و خون میں تڑپتا ہوا دیکھوں اور اُف تک نہ کروں۔

لیجئے۔ وہ علی اکبرؑ امام عالی مقامؑ کے قریب پہنچ گئے۔ بوڑھے باپ کی جوان ہمتی تو دیکھئے، خدا حافظ کہہ کر گھوڑے پر سوار کرایا۔ ہاں جب وہ چند قدم آگے بڑھ چکے تو آسمان کی طرف نظر ڈالی اور فرمانے لگے:۔

اَللّٰھُمَّ اَشْھَدْ عَلٰی ھٰؤلاءِ القوم لقد برز الیھم غلام اشبہ الناس خَلقًا و خُلقًا و منطقًا برسولک

"اے اللہ اس قوم کی بدسلوکی کا گواہ رہنا کہ اب نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ وہ جوانِ رعنا ان کی طرف بڑھنے لگا۔ جو شکل و شمائل، عادات و سیرت اور بول چال کے لحاظ سے تیرے رسولؐ (اور میرے نانا) کی ہوبہو تصویر تھا۔

علی اکبرؑ فوج کی طرف بڑھے چلے جا رہے ہیں حسینؑ خیمہ کی طناب پکڑے کھڑے ہیں اور جاتے ہوئے بیٹے کو غور سے دیکھ رہے ہیں۔ مادرِ علی اکبرؑ بھی پاس ہی کھڑی ہیں اور امامؑ کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے ہیں۔ شاید یہ خیال ہے کہ بیٹے کی جان پر کچھ بنے گی تو امامِ زمانہؑ کا روشن ضمیر اس کا ادراک کر لے گا اور باپ کے دل کا عکس چہرے پر

پڑے گا۔ سامنے دیکھئے نہر فرات موجیں مار رہی ہے۔ خنک لہریں بلند ہو ہو کر پیاسوں کو اپنی طرف دعوت دے رہی ہیں۔ دھوپ کی بے پناہ شدت سے کربلا کی ریت گرم ہو چکی ہے لو ہے کی زرہ پیاسے غازی کے خشک بدن کو جلائے دے رہی ہے۔ دریا کی طرف سے کوئی سرد جھونکا آ نکلتا ہے تو دل بے قابو ہو کر پانی کی طرف مائل ہونے لگتا ہے۔

دیکھیے اور سوچیے، یہ نبیؐ کے نواسے کا نوجوان بیٹا ہے۔ یہ ساقیٔ کوثر کا پوتا ہے۔ یہ تین شب و روز سے پیاسا ہے نہر پانی سے لبریز ہے۔ اس پر مسلمانوں کا قبضہ ہے۔ اس کے جد کا کلمہ پڑھنے والوں کا قبضہ ہے۔ یہ نوجوان غازی اپنے باپ کے ساتھ انہی مسلمانوں کے بلانے پر ادھر آیا ہے۔ کیا ان ہزاروں مسلمانوں، میزبانوں، کلمہ گویوں میں کوئی ایسا نہیں جو پیاسے ہاشمی کی پیاس بجھا دے۔ وہ نیزے لے کر آگے بڑھ رہے ہیں تلواریں نیام سے نکال رہے ہیں۔ اب شباب کی وہ تصویر، نبی کی وہ شبیہہ، دل بادل لشکر کے ہجوم میں گم ہو گئی۔ لیکن دیکھیے وہ جوان بھی بلا کا بہادر اور قیامت کا صف شکن ہے۔ اس نے فوجوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک دیا۔ اور حملہ کرنے والوں کو پسپا کر دیا۔ علیؑ کا شیر بدر و حنین کے معرکہ کی یاد تازہ کر رہا ہے اور فوجوں کی گھٹا چھٹتی جا رہی ہے۔ ذرا تین دن کے بھوکے پیاسے کی جنگ دیکھئے۔ کبھی میمنہ پر جا گرتا ہے، کبھی میسرہ پر حملہ آور ہوتا ہے۔ جدھر قدم بڑھتے ہیں سروں کے انبار اور تنوں کے ڈھیر لگ جاتے ہیں۔ علیؑ کے پوتے نے تلوار کے وہ ہاتھ دکھائے کہ دشمن بھی دادِ فن دیئے بغیر نہ رہا۔ اب میدان میں سناٹا ہے فوجیں پسپا ہو کر دور کھڑی ہیں۔ اور چالاک غنیم کمین گاہوں میں چھپ گئے ہیں۔ گرمی کی شدت اور آفتاب کی حدت نے آخر اپنا اثر دکھایا اور جب سامنے کوئی لڑنے والا نہ رہا تو توجہ خود بخود پیاس کی طرف منعطف ہوئی اور پیچھے مڑ کر دیکھا تو دور سے ماں باپ کھڑے نظر آئے۔ بے اختیار گھوڑے کو مہمیز کر کے خیمہ کی طرف بڑھے اور ساقیٔ کوثر کے لال سے پانی کا سوال کیا۔

سخی باپ کا سخی بیٹا کسی کے سوال کو رد کرنے کا عادی نہ تھا۔ آج یہ عالم ہے کہ بیٹا سائل بن کر آیا ہے اور پانی جیسی چیز مانگ رہا ہے مگر حسینؑ کبھی آسمان کی

طرف نظر ڈالتے ہیں، کبھی بیٹے کی شکل دیکھ کر رہ جاتے ہیں آخر ارشاد فرمایا:-

"بیٹا یہ انگوٹھی منہ میں رکھ لو۔ شاید تسکین کی کوئی صورت نکل سکے"

انگوٹھی منہ میں رکھ کر علی اکبرؑ نے پھر میدان کا رُخ کیا۔ فوج مخالف نے سمجھا خدا جانے تازہ دم غازی کیا غضب ڈھائے، اس لیے جلدی جلدی صفوں کو درست کیا۔ میمنہ، میسرہ، قلب و عقب کو از سرِ نو ترتیب دے کر ہراول دستہ کو آگے بڑھایا۔ اب کوفہ کی کالی گھٹا نے فاطمی چاند کو گھیرے میں لے لینے کی پوری تیاریاں کر لیں۔ بپھرے ہوئے شیر کی طرح علی اکبرؑ کبھی میمنہ پر حملہ کرتے کبھی میسرہ کی صفوں کو توڑ کر باہر نکل جاتے مگر نیزوں کے وار اور تیروں کی بارش کا کب تک مقابلہ کرتے اکیلا بہادر ہزاروں کے سامنے کب تک جما رہتا۔ ہاں لڑائی ہوئی اور گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ سینکڑوں کھیت رہے۔ ہزاروں بھاگ گئے، مگر قوت گھٹ رہی تھی۔ پیاس کی شدت بڑھ رہی تھی۔ زرہ اور اسلحہ نے تن بدن میں آگ سی لگا رکھی تھی تھکا ماندہ جسم نڈھال ہوتا جا رہا تھا۔ کسی میں اتنی ہمت تو نہ تھی کہ سامنے آکر وار کرتا۔ ہاں کمین گاہ سے حملے ہو رہے تھے۔ آخر جب بہادر تھک کر چور ہو گیا اور مسلسل حملے اور متواتر زخموں کے اثر نے بیتاب کر دیا تو بھاگی ہوئی فوج پلٹ آئی اور کسی نے آگے بڑھ کر سینہ پر نیزہ مارا۔ علی اکبرؑ گھوڑے پر رُک نہ سکے اور "وَاَبَتَاہُ اَدْرِکْنِی" کہہ کر زمین پر گر پڑے۔ اب شباب خاک پر پڑا تھا۔ اور کرب و الم کی شدت سے ایڑیاں رگڑ رہا تھا امام حسین علیہ السلام نے بیٹے کی آواز سنی۔ بوڑھے باپ پر اس آواز کا جو اثر ہوا ہوگا۔ اس کو زبان سے ادا کرنا مشکل ہے۔ صاحبِ دل بھی اس کا تصور مشکل سے کر سکتا ہے۔ ہم اور آپ ہوتے اور جوان بیٹے کی چیخ سنتے تو غش کھا کر گر پڑتے۔ دُنیا آنکھوں کے سامنے تاریک ہو جاتی۔ مگر یہ نسل ابراہیمی کے سلسلۂ ہدایت کے فرد ہیں۔ انہوں نے نبیؐ و علیؑ کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ یہ اس گھرانے کے چشم و چراغ ہیں جو صبر و شکر کی تعلیم دیتا آیا ہے۔ آیئے مصیبت کے وقت تحمل و برداشت کا سبق ان سے سیکھیے۔

مادرِ علی اکبرؑ کو تلقین صبر کر کے خیمہ میں بھیجا ہے اور خود اس طرف بڑھے ہیں جدھر سے

بیٹے کی آواز آئی تھی۔ معمولی انسانوں کے قلب و دماغ اور جذبات و عقل میں ایسے موقعوں پر جو کشمکش ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ تو ہر صاحب اولاد کو ہو سکتا ہے مگر حسینؑ معمولی انسان نہیں ہیں۔ وہ ان قائدوں اور رہبروں میں سے ہیں جو ہزاروں سال بعد پیدا ہوتے ہیں بے شک کئی دن سے آب و دانہ نہیں ملا جسم زخموں سے چُور ہے۔ دل پر اعزا اور رفقا کے داغ اٹھائے ہوئے ہیں۔ ضعف حد سے بڑھ چکا ہے۔ قدم آگے بڑھانے چاہتے ہیں۔ مگر طاقت ساتھ نہیں دیتی۔ چاروں طرف یا فوجیں نظر آتی ہیں۔ یا پیاروں کے لاشے دکھائی دیتے ہیں۔ جو سامنے آتا ہے۔ اس سے فرماتے ہیں "ابھی ابھی ایک بہادر اس میدان میں لڑ رہا تھا۔ تم نے دیکھا ہو تو بتاؤ کہ گھوڑا اس کو کس طرف لے کر نکل گیا۔ اس بہادر کی لاش کس سمت پڑی ہے۔" مگر لوگ ہمدردی کے بجائے تمسخر کرتے اور راستہ بتانے کے بجائے ہنس کر کہتے "شاید پیاس زیادہ لگی ہوگی، نہر پر پانی پینے گئے ہیں"

جب کوئی چارۂ کار نظر نہ آیا تو مہرِ پدری نے ایک آہِ سرد کھینچی اور فضا میں یہ الفاظ گونجے۔ "بیٹا کہاں ہو ایک مرتبہ پھر باپ کو پکارو تاکہ میں آواز کے سہارے تمہارے پاس پہنچ جاؤں" جس کے سینے میں نیزے کی انی پیوست ہو، جو سیروں خون اُگل چکا ہو جس کا جسم زخموں سے چھلنی ہو چکا ہو۔ وہ کیا خاک آواز دے گا۔ اور آواز دینے کی کوشش بھی کرے تو وہ دور تک کیسے پہنچ سکے گی۔ طبل جنگ بج رہے تھے حسینؑ جس کے سوگ میں تھے اسی کے خاتمہ کی خوشی میں کوفی شادیانے بجا رہے تھے اور ایسا نظر آرہا تھا کہ کوفی فوج میں کوئی صاحب اولاد ہے ہی نہیں۔ انسانی ہمدردی کے سوتے خشک ہو چکے ہیں اور غمخواری و غمگساری کے جذبے کبھی پیدا ہی نہیں ہوئے۔ بیٹے نے جان پر کھیل کر باپ کو پکارا اور اسی آواز کے سہارے حسینؑ اس مقام پر پہنچے جہاں اٹھارہ سال کی کمائی موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ مگر واہ رے حسینؑ، سینے سے خون کا فوارہ اُبلتے دیکھا، نبضیں ڈوبتی پائیں، سانس اُکھڑا ہوا نظر آیا، پیشانی پر موت کا پسینہ آتا ہوا دیکھا۔ مگر صبر و ضبط کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ بیٹے کے سر کو زانو پر رکھ لیا اور کہنے لگے "جانِ پدر! پیاس کی شکایت کر رہے تھے۔ لو اب جنت کی طرف

سدھار رہے ہو، ۔۔۔۔۔ ہمارے نانا اور والد ماجد تم کو ٹھنڈے پانی سے سیراب کریں گے۔ بیٹا، گھبرانا نہیں۔ ہم بھی تھوڑی دیر میں تمہارے پاس آرہے ہیں۔ ہاں یہ تو بتاؤ، ماں کے لئے کچھ کہنا ہے، بہنوں کو کوئی پیغام دینا ہے" یکایک جوان بیٹے کا اضطراب سکون سے بدلنے لگا۔ نظریں پتھرا گئیں، ہونٹ ہلتے نظر آئے باپ نے کان لگا کر سنا تو یہ آواز آرہی تھی:-

" زندگی کا سفر ختم ہوتا نظر آرہا ہے۔ آخرت کی منزل سامنے ہے، جنت کے در کھلے ہیں۔ نانا اور دادا مجھے لینے آئے ہیں۔ اُن کے ہاتھ میں سرد پانی کے جام ہیں۔ ابا جان اب رخصت ہوتا ہوں۔

میری طرف سے ماں کو، بہنوں کو، بھائیوں کو اور ہو سکے تو وطن کے دوستوں کو رخصتی سلام پہنچانے کی کوشش فرمائیے۔" یہ کہا اور ایک آخری ہچکی نے منزل آسان کردی۔ اب نہ وہ کرب تھا نہ بے چینی تھی۔ امام حسینؑ فرماتے رہے۔ یابنی علی الدنیا بعدک العفا۔ لقد استرحت من هم الدنيا وغمها وتركت اباك وحيداً فريداً۔

بیٹا تمہارے بعد جینے میں کیا مزا ہے۔ تم تو رخصت ہو گئے۔ دنیا کے غم و اندوہ سے چھٹ گئے۔ مگر ہم یکہ و تنہا چھوڑ گئے۔ ہر باپ کو یہ امید ہوتی ہے کہ موت کی گھڑی آئے گی تو بیٹا سرہانے موجود ہوگا۔ کفن دے گا۔ قبر میں سلائے گا۔ اور مرنے کے بعد گھر بار اور خاندان کو سنبھالے گا۔ مگر حسینؑ جوان بیٹے کی لاش پر کھڑے ہیں کبھی ماضی کی یاد ستاتی ہے کبھی مستقبل کا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ اٹھارہ سال تک جس بیٹے کے آرام کی خاطر سینکڑوں جتن کئے تھے۔ آج اس کو دو گز کفن بھی نہیں دے سکتے تھے۔

مگر واہ رے ثباتِ قدم اللہ کی راہ میں یہ سارے صدمے سہہ رہے ہیں اور صبر و شکر کے سوا زبان سے کچھ نہیں کہہ رہے، طاقت جواب دے چکی ہے۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا ہے۔ بوڑھا باپ جوان بیٹے کی لاش کیونکر اٹھائے اور اٹھائے تو اٹھا کر کہاں لے جائے۔ خیمہ کی طرف جہاں شہید کی ماں، بہنیں، پھوپھیاں اور چچیاں انتظار میں کھڑی ہوں

گی یا گنجِ شہیداں کی طرف جہاں صبح سے اس وقت تک قتل ہونے والے بہادر موت کی گہری نیند میں سو رہے ہیں۔

تو کسی نہ کسی طرح بوڑھے باپ نے جوان بیٹے کی لاش اٹھائی اور خیمہ کا رُخ کیا۔ خیمہ کے در پر آ کر آواز دی، ایسے موقع پر ایک باپ کے منہ سے جو الفاظ نکل سکتے تھے ان کی ترجمانی مراثی نگار حضرات نے اس طرح کی ہے:۔

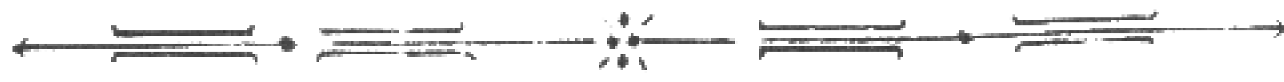
" بہن زینبؑ کہاں ہیں، ام کلثومؑ کدھر گئیں، مادرِ علی اکبرؑ کو ساتھ لے کر آگے بڑھیئے، سکینہؑ کہاں ہے؛ اس کو بھی خبر کر دیجیئے کہ رن سے علی اکبرؑ واپس آئے ہیں۔ سفید کپڑے پہن کر گھر سے نکلے تھے، سُرخ جوڑا بدل کر گھر کی طرف لوٹے ہیں سارے عزیز استقبال کے لئے آگے بڑھیں۔ صبح تک سب کو جس کے بیاہ کی تمنا تھی اور شادی کی آرزو تھی اس جوانمرگ کے خون میں نہائی لاش آئی ہے اسلام کا یہ سپاہی دین کی خاطر اسلامی اصول و آئین کی حفاظت کے لئے لڑنے گیا تھا، جان دے کر اسلام کو زندہ کرنے کی جو دیرینہ خواہش تھی وہ آج پوری ہو گئی حسینؑ کا گھر رہے یا نہ رہے مگر دین زندہ رہے گا۔ آؤ ہم سب مل کر اللہ کا شکر ادا کریں کہ اس نے ہمارے گھرانے کو یہ توفیق دی کہ وہ ملتِ ابراہیمی کی یاد تازہ کر سکا۔ اور سر دے کر اسلام کو سربلند کرنے کی رسمِ کہنہ کی تجدید میں ناکام نہیں رہا۔"

بیشک حسینؑ امام تھے مگر ان کے پہلو میں انسانی دل بھی تھا جو رنج والم سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ عزیزوں کی موت کے وقت رسولِ اکرمؐ بھی روتے تھے اور سارے اکابرِ اسلام اشک فشانی کرتے تھے۔ امام حسین علیہ السلام نے بھی اس دل فگار حادثہ پر غم کے آنسو بہائے اور سارے اہلِ حرم نے جوان مرگ کی لاش پر گریہ و بکا کیا۔ مگر یہ شجاعت کے آنسو تھے جو بہادری کے جذبات اُبھارنے میں مدد دیتے ہیں اور یہ غم و الم صحیح انسانی فطرت کا مظاہرہ تھا جو سنگ و خشت اور قلب و جگر میں اور پتھر کی مورت اور گوشت و پوست کے مجسمہ میں حدِ فاصل قائم کرتا ہے ؎

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں ٭ روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں رُلائے کیوں!

دکھ بھرے حادثہ پر آنسو بہانا، داستانِ مصیبت سن کر اشک افشانی کرنا فطرتِ انسانی کا تقاضا ہے پہلو میں انسانی دل ہو تو داستانِ غم سُن کر جذبات میں طوفان ضرور پیدا ہوگا۔ اور بے ساختہ آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگیں گے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

" جو امام حسینؑ علیہ السلام کا فسانۂ شہادت سُنے،
اس کو رونا چاہیئے۔ اور جو روتا ہے اس کو
صرف رونے ہی پر اکتفا نہ کرنا چاہیئے —"



دوسری مجلس

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

الحمد للہ رب العلمین، والصلوٰۃ والسلام علیٰ اشرف

الانبیاء والمرسلین وآلہ الطیبین الطاہرین ۔ امّا بعد ۔ فقد

قال اللہ سبحانہ تعالیٰ فی کتابہ المجید افغیر دین اللہ یبغون

ولہ اسلم من فی السمٰوٰت والارض طوعاً وکرھاً والیہ یرجعون

(پ۳ ۔ آل عمران)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے علاوہ کسی دوسرے طریقہ ی تلاش میں ہیں حالانکہ جو ہستیاں آسمانوں میں ہیں یا زمین میں ہیں وہ اس کے سامنے ی ہوئی ہیں (خواہ یہ جھکنا) رضا و اختیار سے ہو یا بے اختیاری سے اور (بالآخر) سب اسی طرف لوٹائے جائیں گے۔

دنیا کے لوگ ادھر ادھر بھٹکتے پھر رہے ہیں، کبھی اپنی خواہشوں کے سامنے سر ھکاتے ہیں، کبھی مظاہر قدرت کو معبود سمجھ کر پوجتے ہیں، کبھی اپنی طرح کے انسان کو خدا ناتے ہیں، پھر ان توہمات اور غیر معقول نظریات و اعمال کے نتائج بھگتنے پر مجبور ہوتے ہیں ہ تعالیٰ فرماتا ہے، یاد رکھو ہم خالق فطرت ہیں، ہم ہی نے دین کے احکام نازل کئے یں ۔ فاقم وجھک للدین حنیفا فطرت اللہ التی فطر الناس یھا لا تبدیل لخلق اللہ ہر چیز سے منہ موڑ کر الدین کی طرف رخ کر۔ یہ وہ فطرت ہے جس پر اللہ نے سب لوگوں کو پیدا کیا ہے ۔ اللہ کی خلقت میں کوئی تبدیلی یں ہوا کرتی ۔

اگر کائنات میں دو خدا ہوتے تو یہ سمجھا جا سکتا تھا کہ ایک مخلوقات کو جامہ ہستی عطا کرتا ہے اور دوسرا کتاب دین و آئین بھیجتا ہے ۔ اس لئے دونوں میں منافات اور تضاد ممکن ہے۔

ایک خدا کھانے پینے کی خواہش پیدا کرتا اور دوسرا کہتا خبردار روٹی کو ہاتھ نہ لگانا، پانی کے پاس تک نہ جانا۔ ایک خدا جنسی خواہش پیدا کرتا اور دوسرا کہتا، عورت کالا ناگ ہے اس کے پاس گئے اور موت آئی تجرد کی زندگی گزارو اور ہمارے نام کی مالا جپتے رہو ۔"

مگر جب ہم ایک خدا کے قائل ہیں تو فطری تقاضوں اور کتاب آسمانی کے احکام میں تضاد دیکھ کر خود چونک اٹھیں گے اور سوچیں گے ۔ ہماری عقل دھوکہ کھا رہی ہے آسمانی کتاب اور فطرت میں تضاد کیسے ہو سکتا ہے ۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ اسی حقیقت کی نقاب کشائی کر رہا ہے ۔ تم اپنی جہالت کی وجہ ادھر ادھر بھٹک رہے ہو تدبیر منزل، سیاست مدن اور بین الاقوامی مسائل کی گتھیاں سلجھانے کے لئے نت نئے قانون بناتے ہو ۔ مگر تمہارے مسائل حل نہیں ہوتے ۔ اللہ کے سیدھے سادھے قوانین کے سامنے کیوں نہیں جھکتے فطرت سے کیوں لڑ رہے ہو ۔ تمہاری یہ اکڑ اور لڑائی زیادہ دن نہیں چلے گی اور جب تک چلے گی تم کو زحمتوں میں ڈالے رہے گی ۔ بالآخر تم کو قانون الٰہی کے سامنے جھکنا پڑے گا ۔ چاہے اپنی خوشی سے جھکو یا انقلاب عالم اور مصائب دنیا کے تھپیڑے تم کو مجبوراً دین الٰہی کے سامنے جھکا دیں ۔ آسمان اور زمین کی مملکتوں پر نگاہ ڈالو ۔ کائنات کے ذرّے ذرّے کو دیکھ ڈالو ۔ یہاں جو کچھ ہے قانون الٰہی کے اشارہ پر ناچ رہا ہے ایٹم (Atom) کا پیٹ چیر کر برقی پاروں کا رقص دیکھو، نظام شمسی کے سیاروں کی گردش پر غور کرو ۔ اس نظام شمسی سے دور دوسرے ستاروں اور سیاروں کے افلاک اور مدارات دیکھتے چلے جاؤ کسی کی یہ تاب اور مجال نہیں ہے کہ حکم الٰہی سے سرتابی کر سکے ۔ ہاں زندگی ارتقاء کی منزلوں سے گزر کر جب انسانی قالب میں آئی ہے تو ہم نے اس کو فی الجملہ آزادی بخشی ہے ۔ مگر ہدایت کے لئے عقل کا چراغ جلا دیا ہے ۔

انبیاء و مرسلین آسمانی کتابیں لے کر منزل کی نشاندہی اور مقصد کی طرف رہبری کر رہے ہیں ۔ عقل کی بات اور ضمیر کی آواز سے چند دن تغافل برتا جا سکتا ہے ۔ آسمانی کتابوں اور خدائی رہبروں کی تبلیغ کچھ دن تک صدا بصحرا رہ سکتی ہے مگر تمدنی شکنجے، سیاسی حالات، معاشی مشکلات اور فطرت کے تقاضے، بالآخر آزادی سے غلط فائدہ اٹھانے والے انسان

علیؑ سے بغض (۱۶)

اعمش بیان کرتے ہیں میں مسجد میں بیٹھا تھا ایک شخص کو دیکھا جس نے نماز ادا کی بعد میں خدا کے حضور میں دعا کرنے لگا اے میرے رب میرا گناہ بہت بڑا ہے تو اس سے بڑا ہے۔ اے بڑے۔ میرا بڑا گناہ تو ہی بخش سکتا ہے۔ وہ شخص زمین پر گر کر رو رہا تھا میں نے سوچا کہ یہ سجدے سے اٹھے تو اس سے پوچھوں جب وہ سجدے سے اٹھا تو میں نے دیکھا کہ اس کا چہرہ کتے کے چہرے کی طرح ہے اس کے بال کتے کے بالوں کی طرح ہیں باقی بدن عام انسانوں کی طرح ہے میں نے پوچھا اے اللہ کے بندے وہ کونسا گناہ ہے جو تم نے کیا ہے جس کی وجہ سے تمہاری صورت مسخ ہو گئی ہے۔ اس نے جواب دیا کہ میرا گناہ بہت بڑا ہے نہیں چاہتا کہ لوگ میرا گناہ سنیں میں نے اصرار کیا تو اس شخص نے بتایا کہ میں ناصبی تھا۔ میں حضرت علیؑ بن ابی طالب سے بغض رکھتا تھا اس بغض کا برملا اظہار کرتا تھا۔ ایک دن بازار میں میں حضرت امیرالمومنین کی شان میں گستاخی کر رہا تھا۔ اتنے میں ایک شخص میرے پاس سے گذرا اس نے کہا کہ اے شخص تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ اگر تم جھوٹے ہو تو خدا تمہیں آخرت سے پہلے اسی دنیا میں مسخ کر دے گا۔ تاکہ تمہاری دنیا میں خوب شہرت ہو اور اپنے انجام کو آخرت سے پہلے دنیا میں بھی دیکھ لو میں نے اس شخص کی کوئی پرواہ نہ کی اپنے گھر روانہ ہو گیا۔ رات آئی سو گیا۔ صبح اٹھا تو میری شکل اور بال کتے میں تبدیل ہو چکے تھے۔ اب مجھے اپنے کئے کا احساس ہوا ہے اب میں پچھتا رہا ہوں اب خدا کے حضور میں معافی اور بخشش کا طلب گار ہوں۔ اعمش کا بیان ہے جب میں نے یہ واقعہ لوگوں سے بیان کیا تو اس کے ماننے والے کم اور جھٹلانے والے زیادہ ہیں۔

ایک اہم انکشاف (۱۷)

حضرت علیؑ امیرالمومنین کوفہ میں اپنے دور خلافت

میں ایک صبح نماز سے فارغ ہوئے تو ایک شخص سے فرمایا فلاں مقام پر ایک مسجد ہے۔ اس کے قریب ایک گھر ہے جس میں ایک مرد اور عورت آپس میں جھگڑ رہے ہیں ان دونوں کو بلا کر لے آؤ وہ شخص اس گھر پر پہنچا آپ کے ارشاد کے مطابق مرد عورت کو لڑتا پایا انہیں حکم دیا کہ آپ دونوں کو امیرالمومنینؑ نے طلب کیا ہے دونوں امیرالمومنین کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ [illegible] ان سے مخاطب ہو کر فرمایا آج رات تم دونوں میں بہت زیادہ جھگڑا ہوا ہے۔ [illegible] جوان نے عرض کیا یا امیرالمومنین اس عورت کو نکاح کر کے لایا ہوں اس سے جب قربت کا خیال کیا تو مجھے اس سے سخت نفرت [illegible] میرا بس چلتا [illegible] اسی وقت میں گھر سے نکال دیتا۔ یہ عورت اس وقت سے مسلسل مجھ سے جھگڑ رہی ہے یہاں تک کہ آپ کا حکم آ پہنچا ہم دونوں حاضر ہیں۔ آپ نے [illegible] فرمایا کچھ باتیں ایسی ہیں جو ان دونوں کے علاوہ [illegible] اس لئے تم سب رخصت ہو جاؤ حاضرین کے چلے جانے کے بعد [illegible] عرض کی ہاں۔ فرمایا میں تمہیں [illegible] کرے گی عورت نے عرض کیا [illegible] امیرالمومنینؑ نے فرمایا تو فلاں بنت فلاں ہے۔ [illegible] تیرا ایک چچا زاد بھائی تھا تم دونوں میں آپس میں بڑی محبت تھی۔ [illegible] وہاں تجھے [illegible] تو اس سے حاملہ ہوئی یہ راز تو نے سب سے پوشیدہ رکھا [illegible] سب کچھ بتا دیا۔ [illegible] وضع حمل کا وقت [illegible] گئی۔ تجھے بچہ پیدا ہوا تیری ماں اس بچہ کو [illegible] حاجت کی جگہ تھی وہاں رکھ دیا [illegible] بچہ کو دیکھا تو ایک پتھر مارا جو کتے کے بجائے اس بچہ کے سر پر لگا [illegible] شکستہ ہو گیا تیری ماں نے اس بچہ کا سر باندھا اور پھر تم دونوں اس کو چھوڑ کر چلی گئیں۔ [illegible]

کو ایسا جکڑیں گے کہ وہ محرابِ فطرت میں رکوع اور دربارِ الٰہی میں سجود کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ دیکھتے نہیں ہو تم نے صدیوں شراب کو سرور بخش اور اندوہ ربا سمجھ کر حلال رکھا اور انفرادی اور اجتماعی طور پر میخانوں کی سر پرستی کرتے رہے۔ بنت العنب، دخترِ رز، آتشِ سیال کے ساتھ جو پیمان تم نے باندھا تھا وہ آج شکست ہو رہا ہے۔ اور کل تک جس کو حکماء اور اطباء فرحت بخش اور روح افزا سمجھتے تھے آج متفقہ طور پہ اس کو زہر ہلاہل کہہ رہے ہیں۔ ہمارے نبیوں کی ہزارہا سال پرانی بات کی صداقت ظاہر ہو رہی ہے اور جابجا انسداد شراب نوشی کے لئے ادارے بن رہے ہیں لیکن یہ بھی یاد رکھو کہ تمہارا بنایا ہوا کوئی قانون شراب نوشی کا سدِباب نہیں کر سکتا۔ تمہاری بنائی ہوئی کوئی ٹمپرنس سوسائٹی مے خواری کا خاتمہ نہیں کر سکتی۔

ہمارے نبیؐ کے ایک حکم نے مدینہ میں خم کے خم انڈھا دیئے تھے۔ اور شراب نالیوں میں بہنے لگی تھی۔ تم بیسیوں سال سے انسداد شراب نوشی کے لئے کوشاں ہو اور خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلتا۔

دیکھو عورتیں ہر ملک میں گرفتار بلا تھیں۔ منوجی مہاراج کہتے تھے جب تک عورت ماں باپ کے گھر ہے ان کی کنیز ہے۔ جب شادی ہو جائے تو شوہر کی کنیز ہے اور شوہر کے مرنے کے بعد اولاد کی دست نگر اور محتاج ہے یہودی اور عیسائی معاشرے میں بھی عورت کا درجہ چنداں بلند نہیں۔ مگر ہم نے "ولھن مثل الذی علیھن" کہہ کر صدیوں کے تعصبات مٹا دیے اور ہزاروں سال کے جمے ہوئے عقیدے بدل دیے۔ اب ساری دنیا پر نظر ڈالو ـــ فطری دین کی جیت ہو رہی ہے یا نہیں؟

پہلے وراثت میں عورت کا حصہ کہاں تھا ظلم و ستم سہنے کے باوجود وہ طلاق کب لے سکتی تھی۔ ایک شوہر کے مرنے کے بعد اس کو دوسری شادی کون کرنے دیتا تھا۔ مگر اب حوادثِ زمانہ کے تیز و تند جھونکوں نے انسان کو مجبور کر دیا کہ وہ عورت کے ساتھ عدل و انصاف کرے اور معاشرے میں اس کو مناسب مقام دے۔

اسلام چونکہ دینِ فطرت ہے اس نے شروع ہی سے عورت کی قانونی، معاشرتی اور

معاشی شخصیت کو تسلیم کیا ہے۔ اور اسلامی معاشرے نے مثالی عورتیں پیدا کی ہیں۔ جو لوگ حضرت خدیجہؑ، حضرت فاطمہؑ، حضرت زینبؑ، حضرت ام کلثومؑ، حضرت سکینہؑ کے حالات سنتے ہیں۔ ان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ خدا کے نزدیک عورت کا مرتبہ کیا ہے اور اسلام کس قسم کی عورتوں کو پسند کرتا ہے۔

کل تک لوگ سود لیتے دیتے تھے۔ اور کہا کرتے تھے۔ کہ بغیر سود کے تجارت چل ہی نہیں سکتی۔ مگر آج معاشیات کے مسلم ماہروں نے اس کو انسانی معاشرہ کی تباہی کا سب سے بڑا ذریعہ بتایا ہے۔ جوا اور سٹہ بھی کل تک مقبول عام تفریح تھی اور لوگ دیوالی کی رات لکشمی دیوی کے قدموں کی برکت حاصل کرنے کے لئے جوا کھیلتے تھے۔ اس مقبولِ عام رسم کی وجہ سے کتنے گھر تباہ ہوئے۔ کتنے خاندان برباد ہوئے کتنی حکومتیں مٹ گئیں۔ مگر اللہ کے رسولوں نے لاکھ لاکھ سمجھایا، سب شیطان کے پیچھے لگے رہے اور جوا کسی نہ کسی طرح دنیا پر چھایا رہا۔ آج جب علم و فن نے ترقی کی تو سب کی آنکھیں کھلیں اور اب کوئی سمجھ دار ایسا نہیں ہے جو جوئے کو معاشرے کے لئے مفید سمجھتا ہو۔ وہ دن جلد آ رہا ہے جب قانوناً اور جبراً اس برائی کا سدِباب کرنے کے لئے ساری دنیا متفق ہو جائے گی اور انسانیت کی پیشانی پر (MANTECORLO) "مانٹی کارلو" قسم کے داغ نظر نہ آئیں گے۔

جن لوگوں نے کائنات کا مطالعہ غائر نظر سے کیا ہے اور آسمانی کتابوں کو توجہ سے پڑھا ہے، وہ جانتے ہیں کہ تہذیبِ نفس تدبیر منزل اور سیاستِ مدن کے سبق جو دین کی طرف سے ملتے ہیں ان میں جبر و اکراہ کو دخل نہیں ہوتا (لا اکراہ فی الدین) فطرت ہر انسان کو ڈھیل دیتی ہے۔ مہلت عطا فرماتی ہے تاکہ وہ ٹھوکر کھا کر سنبھلے اور کچھ کھو کر حاصل کرے کہ سیکھنے کا یہی طریقہ مؤثر اور دیرپا ہوتا ہے۔ اللہ خود ہی ارشاد فرماتا ہے:-

اُدع الیٰ سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن۔

(لوگوں کو) اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت و دانائی سے اور دلکش انداز، پند و نصیحت سے دعوت دو اور اگر بحث و مباحثہ کی نوبت آجائے تو اس طریقہ سے

بحث کرو جو سب سے زیادہ بہتر ہو۔ مامور من اللہ کے اندازِ تبلیغ میں اور خود ساختہ قائدوں کے طرزِ تسلط و جہانبانی میں یہ فرق بہت نمایاں نظر آتا ہے۔

اللہ کا بھیجا ہُوا ہادی اور قدرت کا مقرر کیا ہوا قائد تبلیغ اور تحریص کے ذریعے سے اپنی بات منواتا ہے۔ دل و دماغ سے اپیل کرتا ہے۔ نفس انسانی کی حریت اور ضمیر کی آواز کا احترام کرتا ہے وہ صبر و شکر، رواداری اور مہلت کی دولت سے مالا مال ہوتا ہے۔ ہر چند کہ دیر میں کامیاب ہوتا ہے مگر جب ایک مرتبہ کامیاب ہو جاتا ہے۔ تو اس کی تعلیم کا اثر دیر تک رہتا ہے

اس کے برخلاف خود ساختہ قائدِ فوج اسلحہ اور خزانوں کی مدد سے اپنی بات منواتے ہیں۔ اور دلائل کے بجائے دنگہ فساد، لپاڈگی اور دھینگا مشتی کے حربے استعمال کرتے ہیں۔ وقتی طور پر ان کو کامیابی حاصل ہو جائے تو ہو جائے مگر جب ان کے جور و ظلم کے شکنجے ڈھیلے ہو جاتے ہیں تو دُنیا آہستہ آہستہ ان کے مسلک سے ہٹنے لگتی ہے اور ان کے غیر معقول طریقے کو خیر باد کہہ دیتی ہے۔

اللہ تعالیٰ اسی بات پر زور دے رہا ہے کہ باطل کی حکومت زیادہ دن تک قائم نہیں رہتی پاپ کی ناؤ کے دن چلے گی؟ ظلم کی ٹہنی کب تک پھلے گی؟ جیت بالآخر دینِ برحق کی ہوتی ہے اور جیسے جیسے زمانہ گزرتا ہے دنیا کی آنکھیں کھلتی جاتی ہیں اور وہ انسان حق کے سامنے سربسجود ہو جاتے ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ عقلمند اپنی مرضی سے حق کے سامنے آجھکتے ہیں۔ نادانوں کو حوادثِ زمانہ کی ٹھوکریں دینِ حق کی طرف مائل کر دیتی ہیں۔

ازل سے یہی ہوتا چلا آیا ہے اور ابد تک یہی ہوتا رہے گا۔ باطل اٹھتا تو بڑی دھوم دھام سے ہے اور چند ہی روز میں اس طرح چھا جاتا ہے کہ خام عقل والے سمجھتے ہیں کہ اب اس کے غلبہ کو کوئی نہیں روک سکتا۔ ظلم و ستم کی گھٹائیں جھوم جھوم کر آتی ہیں اور آفتابِ صداقت کو اس طرح ڈھانپ لیتی ہے کہ یہ اُمید ہی نہیں رہتی کہ وہ پھر کبھی اپنا چہرہ دکھا سکے گا۔ کمزور طبیعتیں باطل کے اس عارضی غلبہ سے متاثر ہو کر اس کے گیت گانے لگتی ہیں۔ مگر چند دن بعد گھٹائیں چھٹتی ہیں۔ اور آفتابِ صداقت کی کرنیں نظر آنے لگتی ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ایسا اُجالا ہو جاتا ہے کہ دنیا محوِ حیرت ہو کر رہ جاتی ہے اور نظریں خیرہ کرنے لگتی ہیں۔ سارے جہاں کی تاریخ

ہم کو سبق دیتی ہے اور مسلمانوں کی تاریخ تو ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے۔

آیئے اسلامی تاریخ کا ایک رُخ آپ کو دکھائیں :۔

امیر معاویہ کی وفات کے بعد یزید ایسا آدمی مسندِ نبوی کا دعویدار بنا جس کو نماز روزے سے عار اور سیر و شکار سے پیار تھا۔ جو اپنی ننھیال کے اثرات کی وجہ سے رِند مشرب اور آوارہ مزاج تھا۔ اور ددھیال کی طرف سے بھی بغضِ بنی ہاشم کے سوا اور کوئی مستقل مسلک و مذہب ورثہ میں نہ ملا تھا۔

شعر، شباب اور شراب کا جادو ہی آدمی کے سر پھرانے کو کافی ہوتا ہے۔ اور اس پر مستزاد یہ کہ حالات و انقلابِ زمانہ نے اس کو شاہی بھی دے دی۔ کریلا اور نیم چڑھا۔ بس اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ تخت پہ پاؤں رکھتے ہی حکم دے دیا۔ "حسینؑ بن علیؑ سے ضرور بیعت لی جائے اور بیعت نہ کریں تو سر قلم کر کے بھیج دیا جائے۔"

یزید شاید اپنے باپ معاویہ کی طرح دور اندیش نہ تھا۔ وہ حسینؑ کو نہ چھیڑتا تو شاید وہ بھی نانا کے مزار پر بیٹھے نماز روزے میں مشغول رہتے اور درس و ارشاد کا مشغلہ جاری رکھتے۔ کسی کی بیعت پر سب لوگوں نے کب اتفاق کیا تھا؟ اور کون ایسا خلیفہ گزرا تھا جس کو سب نے مان لیا ہو؟ مگر یزید کی جلد بازی سے اموی سیاست کو بڑا دھکا لگا۔ اور حسینی تدبیر نے ان کے نانا کے مشن کو بہت بلند اور دور رس نتائج سے دوچار کر دیا۔

یہ یزید کی ناتجربہ کاری تھی کہ وہ یہ سمجھ بیٹھا کہ حسینؑ تلوار سے مرعوب ہو جائیں گے اور موت کے خوف سے میری بیعت کر لیں گے۔ اس کو خبر نہ تھی کہ حسینؑ علیؑ کے فرزند ہیں جنھوں نے فاقے کئے، معاشری تکالیف سہیں سیاسی شکنجے میں گھسیٹے جاتے رہے مگر باطل کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اس کو سندِ قبول عطا نہ کی۔ اس فاطمہؑ کی آغوش کے پلے ہیں جنھوں نے مرتے دم تک اپنی آن بان قائم رکھی اور گھر در کی تکلیف و اذیت کے باوجود نظریاتی مصالحت کو گوارا نہ فرمایا۔

بے شک وہ اپنے بھائی حسنؑ کی طرح تخت و تاج سے مُنہ موڑ سکتے تھے، ان مظالم کو بھی برداشت کر سکتے تھے جو حکومت وقت ان پر ڈھانے کے لئے آمادہ ہوتی مگر نظریات کو

بدلنا اور اصول کو ہاتھ سے دینا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ اور یہ بات کوئی چھپی ڈھکی نہ تھی۔ ساری دُنیا اس حقیقت سے آشنا تھی۔ دیکھو عمر ابن سعد بھی کربلا میں یہی کہتا ہوا نظر آرہا ہے۔ ان الحسین لایبایع فان نفس ابیہ بین جنبیہ۔ "حسینؑ بیعت تو کبھی نہ کریں گے، ان کے پہلو میں بھی وہی دل دھڑک رہا ہے جو اُن کے باپ کے پہلو میں تھا۔"

یزید کے مشیر اگر اس کو بنی ہاشم کی آن بان سے خبردار کردیتے، ان کی سیرت کی خصوصیات بتا دیتے تو شاید وہ یہ غلطی نہ کرتا۔ وہ اپنی ماں کے پاس ریگستانوں اور میدانوں میں پلا تھا' اس کی ننھیال عیسائی تھی اور شراب نوشی اس کی گھٹی میں پڑی تھی۔ شراب نوشی سے انسان کے سوچنے کی روش بدل جاتی ہے۔ اور وہ نشہ کی ترنگ میں بعض اوقات حکم ایسے دے ڈالتا ہے جن کے نتائج افراد کے لئے تلخ اور حکومتوں کے لئے مہلک ہوتے ہیں۔ یزید دینے کے لئے تو حکم دے گیا مگر جب اسے خبر ملی کہ حسینؑ مدینہ کو خیرباد کہہ کر مکہ میں جا آباد ہوئے تو اس کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے کہ حرم محترم میں کسی کو قتل کرنا عوام کو اپنی طرف سے بدظن کرنا ہے۔ اور اگر قتل نہ کیا جائے تو حسینؑ مرکزِ اسلام میں بیٹھے اپنے حقوق کا اعلان اور دعوئے امامت کی اشاعت کرتے رہیں گے اور حج کے موقع پر ساری اسلامی دنیا کے نمائندوں کو دعوتِ فکر دیتے رہیں گے۔ جب شمال وجنوب اور مشرق ومغرب سے آنے والے حاجیوں کو معلوم ہوگا کہ امام حسین علیہ السلام نے یزید کی بیعت نہیں کی وہ مکہ میں پناہ گزین ہیں تو اس کا اثر ساری مملکت پر پڑے گا۔

اس لئے ایک طرف تو اس نے حاجیوں کے لباس میں کچھ ایسے لوگ بھجوائے جو ان کو حرم ہی میں قتل کی دھمکی دے سکیں۔ اور دوسری طرف کوفہ والوں کو آمادہ کیا وہ زیادہ زور سے ان کو وہاں آنے کی دعوت دیں۔ تاکہ ان کے دل میں حرم سے نکلنے کا خیال پیدا ہوسکے۔

یہ صحیح ہے کہ کوفہ سے کچھ مخلص لوگوں نے بھی امام علیہ السلام کو دعوت دی تھی مگر بہت سے ایسے تھے' جو یزیدی مشینری کے پرزے تھے اور امام علیہ السلام کو حرم مکہ سے باہر نکالنا چاہتے تھے۔ تاکہ یزیدی فوجیں آسانی سے اُن کا خاتمہ کرسکیں۔ اس وقت سارے مغربی ایشیا میں یزیدی حکومت کا طوطی بول رہا تھا۔ افریقہ کے بہت سے حصوں پر بھی اس کا تسلط تھا۔ ہر طرف بنی اُمیہ کے کارندے "کوس لمن الملک" بجا رہے تھے۔ کون جانتا تھا کہ کبھی ان کا راج

ختم ہوگا۔ اور دُنیا ان کے دستِ ظلم سے رہائی پائے گی۔

مگر حسینؑ نے بے سروسامانی کے باوجود اپنے عہد کی سب سے بڑی حکومت کو یہ بتانے کی کوشش کی کہ مادی وسائل کی فراوانی' فوجوں کی زیادتی اور خزانوں کی کثرت' اللہ کے دین کی راہ میں رُکاوٹ نہیں پیدا کرسکتی۔

مادی وسائل رکھے رہ جاتے ہیں' فوجیں ناکام ہوجاتی ہیں' خزانے بیکار ثابت ہوتے ہیں۔ یہ اصول کی بلندی اور مقصد کی سچائی ہے۔ جو دلوں میں جرأت' ہتھیاروں میں برشی اور لوگوں میں مادۂ قبول پیدا کرتی ہے۔

حضرتِ حُر کی مثال اس دعوے کے ثبوت کے لئے کافی ہے۔ وہ ایک سپاہی مزاج آدمی تھے۔ نوکری ہی کو سب کچھ سمجھتے تھے۔ کسی سالکِ راہِ ہُدا اور مرشد جادۂ خدا سے ان کو ابھی تک سابقہ نہ پڑا تھا۔ مگر جب منزل شراف کے قریب امام حسینؑ علیہ السلام سے ملنے کا اتفاق ہوا اور ان کے غیر معمولی بذل وایثار کا تماشہ دیکھ لیا تو بندۂ بے دام بن گئے' انہوں نے ساری عمر ایسا سخی کہاں دیکھا تھا جو اپنا وہ قیمتی پانی جو بچوں کی پیاس بجھانے کے لئے مہیا کیا گیا تھا دشمنوں کی نذر کردے اور ان کے گھوڑوں اور اونٹوں کو بھی پیاسا نہ دیکھ سکے وہ سمجھ گئے کہ ہادئ دین اور معمولی حاکموں میں فرق ہوتا ہے۔ ہادی کے سامنے بلند مقاصد ہوتے ہیں' وہ ناراض بھی ہوتا ہے تو اللہ کے لئے' اور راضی بھی ہوتا ہے تو صرف اللہ کیلئے اس کے برخلاف دنیادی حاکم اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لئے نت نئے بہروپ بدلتا ہے۔ کام نکلتا ہو تو گدھے کو باپ بنالے اور کوئی غرض نہ ہو تو باپ کو گدھا بنانے میں عار نہ کرے حالات کا یہی تجزیہ تھا جس نے حُرؑ کو یزیدی فوج سے بیزار کردیا۔ شبِ عاشورہ وہ بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ کبھی اس کو حسینؑ کی دریا دلی یاد آتی' کبھی کوفی لشکر کا یہ انسانیت سوز سلوک نظر آتا کہ خاندانِ رسالتؐ کے زن ومرد تین دن سے پیاسے ہیں اور بے جرم وخطا مظالم کا نشانہ بنائے جارہے ہیں۔ رات کو بار بار اس کی آنکھ کھل جاتی۔ وہ اپنے ساتھیوں کو گہری نیند میں پڑے دیکھتا اور سامنے خیام حسینی کی ٹمٹماتی روشنی کے ساتھ ساتھ تسبیح وتہلیل کی آوازیں آتی ہوئی سنتا اور اندازہ لگاتا کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے اور ملک ودولت

کی خاطر لڑنے والوں میں کیا فرق ہوتا ہے۔ اس کے کسی ساتھی نے جو دیر سے اس کی بے چینی کی کیفیت دیکھ رہا تھا۔ کہا:۔

"حُر! میں تم کو عراق کا سب سے بڑا بہادر سمجھا کرتا تھا۔ آج خدا جانے تمہارا کیا حال ہو گیا کہ گھبراہٹ تمہارے سر پر سوار ہے۔ لب خشک پڑے ہیں، آنکھوں کے گرد حلقے نظر آ رہے ہیں اور تم بالکل کھوئے ہوئے معلوم ہوتے ہو۔"

حُر نے کہا "سوچ رہا ہوں کہ کل صبح کیا گُل کھلے گا"، ساتھی بولا:۔

"یہ بھی کوئی سوچنے کی بات ہے ہمارے ساتھ ہزاروں سپاہی ہیں۔ کھانا ہے پانی ہے مزید کمک کے آنے کی اُمید ہے۔ امام حسینؑ کی فوج میں ستر بہتر آدمی ہوں گے۔ ان میں بوڑھے بھی ہیں، بچے بھی ہیں، چند گھنٹے بھی مقابلہ جاری نہ رہ سکے گا۔ ہر طرف ناکہ بندی ہے۔ ان کی مدد کے لئے کوئی آنا بھی چاہے گا تو نہ آ سکے گا۔ پھر فکر کس بات کی ہے۔ صبح کو کمر باندھنے کے بعد دوپہر تک لڑائی ختم کر کے کمر کھول دیں گے۔ اور حاکم سے انعام لینے کے اُمیدوار ہوں گے۔"

حُر نے کہا:۔

"معاملہ اتنا ہی ہوتا تو گھبرانے کی بات نہ تھی، میں نے بڑے بڑے معرکے دیکھے ہیں گھمسان کی لڑائیوں میں سے فتح بن کر نکلا ہوں۔ اس وقت ہار جیت کا خیال نہیں ہے مجھے جو بات ستا رہی وہ یہ ہے کہ امام حسینؑ رسولِ خدا کے نواسے حضرت علیؑ کے فرزند اور حضرت فاطمہؑ کی آغوش کے پلے ہیں۔ ان کے ساتھ رسولؐ کے گھرانے والے ہیں وہ رسولؐ جن کا ہم کلمہ پڑھتے ہیں۔ جو ہم کو کفر کی تاریکی سے نکال کر ایمان کی روشنی میں لائے۔ جن کی بدولت ہم گلہ بانی چھوڑ کر عنانِ حکومت سنبھالنے کے قابل ہوئے۔ ہم تعداد میں زیادہ ہیں۔ فرض کرو کہ ہم نے ان کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔ ان کے مال و متاع پر قابض ہو گئے۔ ان کے بچوں اور عورتوں کو مقید کر کے کوفہ لے گئے تو ہم دنیا کو منہ دکھانے کے قابل رہیں گے؟ کل روزِ قیامت اللہ کے دربار میں سرخرو ہو کر حاضر

ہو سکیں گے؟ ہم کو رسولؐ کی شفاعت نصیب ہو سکے گی؟

یہ ہیں وہ خیالات جو میرے دل و دماغ میں چکر لگا رہے ہیں اور جنہوں نے میری ہمت اور جرأت پر غلبہ حاصل کر لیا ہے۔ صبح ہوئی تو دُنیا نے دیکھا کہ حُر عمر بن سعد کے پاس کھڑا ہے اور پوچھ رہا ہے۔

"کیا سچ مچ تم لوگ فرزند رسولؐ سے لڑو گے اور پنجتن پاک کے آخری فرد کو خاک و خون میں ملا دو گے۔"

اور ———— ابن سعد کہہ رہا ہے:۔

"حُر! کیا باتیں کر رہے ہو۔ ہم سپاہی ہیں۔ ہم کو منطق چھانٹنے سے کیا کام ہم کو حاکم کی طرف سے جو حکم ملا ہے وہ بجا لائیں گے۔ فوجی نظم کا یہی تقاضا ہے کہ آنکھ بند کر کے حقِ نمک ادا کریں۔ اور صلہ و انعام کے امیدوار رہیں۔"

جب حُر کو یقین ہو گیا کہ لڑائی ہو کر رہے گی اور خاندانِ رسالتؐ کی تباہی کا جو منصوبہ کوفیوں نے بنایا ہے وہ ضرور بروئے کار آئے گا۔ تو انہوں نے دین کو دنیا پر اور جنت کو نار پر ترجیح دی اور ہتھیار سج کر گھوڑے پر سوار ہوئے خیام حسینیؑ کے قریب پہنچ کر گھوڑے سے اترے اور امام علیہ السلام کی خدمت میں دست بستہ حاضر ہو کر عرض کرنے لگے۔

میں بہت گنہگار ہوں، آپ کو کشاں کشاں کربلا تک لانے کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔ یقین مانئے مجھے یہ خیال بھی نہ تھا کہ یہ کوفی رسولؐ کی نشانی کے ساتھ ایسا سلوک کریں گے۔ اب کہ معاملات یہاں تک پہنچ گئے ہیں میں اقبالِ جرم اور اعترافِ گناہ کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ اور اس کے کفارے میں اپنی جان آپ پر سے قربان کر کے آخرت کی نجات کا سامان کرنا چاہتا ہوں۔ مولاؑ! میرا جرم شدید ہے۔ میری گستاخی حد سے گزری ہوئی ہے۔ شرمندگی سے میری آنکھیں جھکی ہوئی ہیں۔ قبل اس کے کہ لڑائی شروع ہو اور چمنِ فاطمہؑ پر آنچ آئے میں چاہتا ہوں کہ اپنے آپ کو راہ حق میں نثار کر دوں، مجھے جنگ کی اجازت اور مرنے کی رخصت دیجئے۔ امام عالیمقام حُر کی ان باتوں سے بہت متاثر ہوئے۔ خیمہ میں جب خبر

پہنچی کر فوجِ خدا کی حمایت کے لئے حُرؓ جرّی نے اپنی خدمات پیش کی ہیں تو حضرت زینبؑ کو بڑی خوشی ہوئی اور ہاتھ اُٹھا کر اس کے حق میں دعائے خیر فرمائی۔ تیسری محرم سے لیکر آج تک جب کبھی طبل بجتا اور کسی رسالہ کے آنے کی خبر ملتی تو حضرت زینبؑ فضہ سے کہا کرتیں کہ دروازے پر جاکر دیکھو یہ لوگ کس کی مدد کے لئے آئے ہیں۔ حضرت فضّہ واپس آکر جواب دیتیں کوفیوں کی امداد کے لئے ایک رسالہ آیا ہے۔ اور حضرت زینبؑ مایوس ہو کر فرماتیں "میرے بھیّا کی کمک کے لئے کوئی نہیں آتا۔ کیا دنیا اولادِ رسولؐ سے اس قدر جلد غافل ہو گئی۔ کیا اب آس پاس کوئی ایسا قبیلہ نہیں ہے جو ہمارے حق کا شناسا ہو۔" اب جو حُرؓ اور اس کے ساتھیوں کی آمد کی خبر سُنی تو ان کو دیر تک دعائیں دیتی رہیں اور کہتی رہیں کہ اللہ میرے ماں جائے کو ہر مصیبت سے بچا اور لوگوں کو توفیق دے کہ اپنے نبی کی آلؑ کا پاس و لحاظ کریں"

ادھر حضرتِ زینبؑ دُعاؤں میں مشغول تھیں ادھر امام عالی مقامؑ اپنے مہمان کا خیر مقدم فرما رہے تھے کہتے تھے۔

"حُرؓ! ایسے وقت میں ہمارے مہمان ہوئے ہو کہ کھانا تو الگ رہا پانی سے بھی تمہاری تواضع نہیں کر سکتے۔ تم کو معلوم ہے کہ تین روز سے تمہارے نبیؐ کی آل پانی تک سے محروم ہے۔ یہ چھوٹے بچے، یہ گرمی کے دن، یہ جلتا ریگستان مگر ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرنا پڑتا ہے۔ ساقیٔ کوثر کے گھرانے پر کبھی یہ وقت نہیں پڑا کہ پانی تک سے مہمان کی تواضع نہ کر سکیں، مگر زمانہ جو کچھ دکھائے اور اُمت جس طرح چاہے آزمائے، سوائے صبر و شکر کے چارہ کیا ہے۔"

حُرؓ نے عرض کی۔ "مہمانی کی تمنا نہیں، آب و غذا کی آرزو نہیں۔ میں تو بس یہ التجا لے کر آیا ہوں کہ مجھے جلد مرنے کی اجازت دیجئے۔ تاکہ سرخرو ہو کر آپ کے ناناؐ کے دربار میں جاؤں اور آپ کے والد ماجد کے ہاتھ سے جامِ کوثر نوش کر دوں۔"

مولا نے تشکر و امتنان کے لہجہ میں فرمایا:۔

"ابھی جلدی کیا ہے۔ دو گھڑی آرام کرو۔ کچھ دیر اور چمنِ عالم کی ہوا کھاؤ۔ دوسرے بہادر میدان میں جا رہے ہیں ان کی جنگ دیکھو، دادِ شجاعت دو۔ اور

اور جب وہ جان دے کر سعادتِ دارین حاصل کریں تو اُن کی لاش اٹھانے میں میری مدد کرو۔ آج سارے دن یہی مشغلہ رہے گا۔ ہم برسوں کے ساتھیوں، گود کے کھلائے ہوئے بچوں اور برابر کے بھائیوں کو جاتا ہوا دیکھیں گے۔ مرتے دم مدد کی طلب میں ان کی آواز آئے گی۔ ہم جلد جلد لاش پر جائیں گے اور کانپتے ہاتھوں اور دھڑکتے ہوئے دل سے ان کی خاک و خون آلودہ میت گھر میں لیکر آئیں گے

حُرؓ! صبح سے ظہر تک یہی شغل رہے گا۔

تم کچھ دیر ٹھہر جاؤ تو اس کام میں میری مدد کر سکو۔

حُرؓ! رسولؐ کے گھرانے میں پانچ تن ایسے تھے جن کی راہ میں مسلمان آنکھیں بچھاتے تھے میں ان میں سے سب سے چھوٹا ہوں لیکن وہ سب اپنی زندگی کے دن پورے کر کے اللہ کو عزیز ہوئے۔ بزرگوں کی موت نے مجھے بزرگ بنا دیا (اکبرؑ کی موت الکبراء) میں پنجتن پاکؑ کا آخری فرد ہوں، میرے بعد دنیا میں کوئی ایسا نہ رہے گا۔ جو رسولِ خداؐ کا نواسا اور فاطمہؑ کا بیٹا کہلایا جا سکے۔

دیکھتے نہیں ہو۔ رسولؐ کی آخری نشانی کی کیا قدردانی ہو رہی ہے۔ مہمان بلا کر بھوک پیاس کی اذیت میں مبتلا کر رکھا ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچے پیاس کے مارے بلک رہے ہیں۔ عورتیں غم و اندوہ سے نڈھال ہو رہی ہیں ان مصیبتوں کے اٹھانے بعد کس کے زندہ رہنے کی امید ہو سکتی ہے۔

حُرؓ! ذرا ٹھہرو اور اپنے امام کے مصائب و آلام میں کچھ تو حصّہ لو۔"

حق یہ ہے کہ کربلا کے وہ چند گھنٹے تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ نہر فرات کے کنارے اس وقت موت راحت تھی اور زندگی موت تھی۔

آفتاب اپنی پوری شدت سے چمک رہا تھا۔ اس کی حدت و حرارت نے سارے میدان کو دوزخ بنا رکھا تھا۔ حسینؑ کے ساتھی جو تین روز سے پیاسے تھے ہتھیار اور زرہ کی گرمی سے بھُنے جاتے تھے۔ یہ حسینؑ کی ہمدردی اور انصار نوازی تھی کہ انہوں نے رفقا کو پہلے مرنے کی اجازت دے دی "تاکہ ان کی تکلیفوں اور اذیتوں کا جلد خاتمہ ہو جائے اور وہ

یہاں کی شدت وحدت سے بچ کر جلد کوثر کے کنارے پہنچ جائیں مگر عزیزوں کو زیادہ عرصہ تک روکے رکھا کہ وہ مصائب و آلام کی پوری شدت کا مقابلہ کر سکیں۔ کربلا میں موت آسان اور زندگی مشکل تھی۔ جو مر جاتا تھا وہ جسمانی تکلیف اور روحانی اذیت سے جلد نجات پا جاتا تھا۔ اور جو رہ جاتا تھا وہ مر مر کر زندہ رہتا تھا۔

پیاسے بچوں کا شور العطش، اپنی گود کے پالوں کے غم میں عورتوں کی گریہ و زاری، ملاعین کے گستاخانہ حملے اور بے ادبانہ کلمے سننے کے لئے بڑے دل گردہ کی ضرورت تھی۔ جو پہلے ہی دنیا سے گزر گئے۔ وہ ان اذیتوں سے بچ گئے، جو زندہ رہے انہوں نے یہ تکلیفیں بھی سہیں۔ موت برحق ہے۔ سب کو آتی ہے۔ مگر حسینؑ نے ہر ایک کو اس کے ظرف کے بقدر آزمائش میں ڈالا اصحاب و رفقاء کو ان جسمانی اور روحانی اذیتوں کے برداشت کرنے کی زحمت زیادہ دیر تک نہ دی اور ان کو جلد ہی مرنے کی اجازت دے دی جو خونی رشتوں میں جکڑے ہوئے تھے ان کا امتحان دیر تک ہوتا رہا۔

حضرت حُرؑ مہمان تھے عیش و عشرت کی زندگی چھوڑ کر حسینؑ کے دامن دولت سے وابستہ ہوئے تھے۔ ان کا خیمہ نہر کے کنارے استادہ تھا کوفی فوج کے نمایاں سرداری کی حیثیت سے ان کو ہر قسم کی آسائش حاصل تھی۔ زیادہ دیر تک زندہ رہتے تو مصائب و آلام کی شدت اُن کو نڈھال کر دیتی یہ مولا کی مہمان نوازی ہی تھی کہ حُر کو زیادہ عرصہ تک مبتلائے آلام نہ رکھا اور جانے کی اجازت دے دی۔ اصحاب میں یہ امتیاز حُر ہی کو حاصل ہے کہ سب سے پہلے آگے بڑھے اور لشکر کوفہ سے یوں خطاب کیا "کوفیو! تم جانتے ہو کہ میں حُر ہوں۔ میری تلوار کا لوہا سب مانتے ہیں میں کسی میدان سے نہیں گھبرایا کسی جنگ میں منہ چھپا کر نہیں بھاگا۔ آج بھی تمہارے ساتھ رہتا تو ہر طرح کا آرام پاتا مگر آرام و آسائش تج کر جو مبتلائے غم و آلام حسینؑ کا ساتھ دے رہا ہوں تو اس کی کوئی وجہ ہے؟"

دیکھو! زندگی چند روزہ ہے۔ ایک دن سب کو مرنا ہے اسی چند روزہ زندگی میں انسان اپنی عاقبت بنا یا بگاڑ سکتا ہے۔ تم دیکھو ایک طرف عمر ابن سعد اور شمر ذی الجوشن ہیں۔ کوفہ کی فوج ہے جو عبید اللہ ابن زیاد کے حکم سے خاندان نبوت کو مٹانے پر آمادہ ہے

دوسری طرف رسولؐ کا نواسہ ہے۔ رسولؐ کا خاندان ہے۔ جن کی گفتار اور کردار منشائے الٰہی کے مطابق ہے۔ کوفیو! ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے باطل کا ساتھ چھوڑنے اور راہ حق اختیار کرنے کا وقت ابھی باقی ہے۔ عاقل وہی ہے جو وقتی فائدے کا خیال نہ کرے اور دیرپا نتائج پر نظر رکھے ——

لو مجھ کو جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا۔ اب مجھ سے حسینؑ اور اس کے ساتھیوں کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی۔ اس لئے آواز دیتا ہوں کہ تم میں سے جو چاہے میرے مقابلے کے لئے آگے بڑھے۔"

صبح کے وقت جب حُر لشکرِ عمر ابنِ سعد سے جُدا ہو کر امام حسینؑ سے آملے تھے تو یزید بن سفیان تمیمی ایک پہلوان نے عمر بن سعد سے کہا تھا کہ اگر مجھے خبر ہو جاتی کہ حُر اس ارادے سے باہر نکلا ہے تو میں ایک ہی نیزہ سے اس کا کام تمام کر دیتا۔ اب جب حُر نے کوفی فوج کو چیلنج کیا تو حصین بن تمیم نے جو کوفہ کی فوج کا ایک افسر تھا یزید بن سفیان سے کہا "دیکھو حُر سامنے کھڑا ہے بڑھ کر نیزہ لگا دو۔" یزید حُر کے سامنے آیا اور کڑک کر آواز دی۔ کہا مجھ سے مقابلہ کرو گے؟ حُر نے کہا "کیوں نہیں" دونوں ایک دوسرے پر وار کرنے لگے۔ نیزہ سے نیزہ اور تلوار سے تلوار ٹکراتی۔ اور آناً فاناً یزید کا جسم خاک و خون میں تڑپتا نظر آیا۔ اس کے بعد کسی کو حُر کے سامنے آنے کی ہمت نہ ہوئی اور وہ ظہر کے وقت تک زندہ رہے جب امام علیہ السلام نے نماز ظہر کے لئے مہلت مانگی اور ظالموں نے آپ کے ساتھ گستاخی کی تو حُر اور زہیر بن قین نے مل کر جنگ کی۔ جب ایک گھر جاتا تھا تو دوسرا اس کی مدد کے لئے آگے بڑھتا تھا۔

مگر بالآخر پیادوں کی فوج نے ہلہ کر کے حُر کو گھیر لیا۔ حُر کا گھوڑا اس سے پہلے پے ہو چکا تھا اور وہ پیادہ لڑ رہے تھے۔ زہیر نے اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر ان کو بچانا چاہا، مگر ناکام رہے اور تلواروں کے مسلسل واروں نے حسینؑ کے اس ناصر و حامی کا خاتمہ کر دیا امام عالیمقام جب لاش پر پہنچے تو سر سے خون کا فوارہ جاری تھا۔ اور روح و تن میں آخری کشمکش شروع ہو گئی تھی۔ رحیم و کریم امام اپنے اس نو وارد اور جلد رخصت

ہونے والے مہمان کے سرہانے بیٹھ گئے۔ زخم پر رومال باندھ کر خون روکنے کی کوشش کی، مگر جب یہ دیکھا کہ پیشانی پر موت کا پسینہ آگیا ہے، سانس اُکھڑ چکا ہے، نبضیں ڈوب رہی ہیں تو فرمانے لگے:۔

لَنِعْمَ الْحُرُّ حُرُّ بَنِیْ رِیَاحٍ　　صَبُوْرٌ عِنْدَ مُخْتَلَفِ الرِّمَاحِ

آہ! حُر ریاحی کیا بندۂ آزاد تھا، نیزوں اور تیروں کے وار ہوتے رہے اور وہ صابر شاکر رہا۔

وَنِعْمَ الْحُرُّ اِذْ نَادٰی حُسَیْنًا　　فَجَادَ بِنَفْسِهٖ عِنْدَ الصِّیَاحِ

حُر کے نصیب کیسے تھے کہ جیسے ہی حسینؑ کو پکارا اور پکارتے ہی اپنی جان فدا کر دی۔

وَنِعْمَ الْحُرُّ فِیْ رَهَجِ الْمَنَایَا　　اِذَا الْاَبْطَالُ تَخْفِقُ بِالصِّفَاحِ

جب موت کی گرد اڑنے لگی اور ہر طرف سے سپاہی اس پر تلواریں لئے ہوئے گرنے لگے۔ تو اس وقت بھی کیا اچھا آزاد مرد ثابت ہوا۔

فَیَارَبِّ اَضِفْهُ فِی الْجِنَانِ　　وَزَوِّجْهُ مَعَ الْحُوْرِ الْمِلَاحِ

پروردگار! یہاں تو ہم اس کی کچھ مہمانی نہ کر سکے، تو جنت میں اس کی ضیافت کر اور جنت کی ملیح حوروں سے اس کی شادی کر۔

کربلا کا معرکہ صحیح معنوں میں جنگ کی تعریف میں نہیں آتا۔ ایک طرف ہزاروں سپاہی تھے سیر و سیراب اسلحہ لگائے ہوئے اور گھوڑے پر چڑھے ہوئے، دوسری طرف ستر بہتر آدمی جن میں جھولے میں جھولنے والے علی اصغرؑ سے لیکر بوڑھے حبیب ابن مظاہر تک شامل تھے۔ پھر ان لوگوں نے کبھی نہ حملہ کی ابتدا کی اور نہ سب نے مل کر ہلہ کیا۔ ہاں راہ خدا میں ایک ایک جاں فروش تنہا جھوجھتا رہا اور دادِ شجاعت دے کر اور اعلیٰ کردار کا مظاہرہ کر کے موت کی آغوش میں سوتا رہا۔

امام عالی مقامؑ کا طرزِ عمل شاہد ہے کہ وہ لڑنے کیلئے نہیں گئے تھے۔ انہوں نے لڑائی کی کوئی تیاری بھی نہیں کی تھی۔ وہ ہر منزل پر اپنے ساتھیوں کو واپس جانے کی ہدایت کرتے رہے تھے۔ عاشور کی شب تو انہوں نے اپنے ساتھیوں سے صاف کہہ دیا تھا کہ کل سب مارے جائیں گے اس لئے جس سے ہو سکے اپنی جان بچا کر لے جائے۔ بیعت کا خیال اس

راہ میں حائل نہ ہو میں اپنی بیعت خود تمہاری گردنوں سے اٹھائے لیتا ہوں۔ ایسا شخص جو اپنی رہی سہی فوجی قوت کو کمزور کر رہا ہو۔ جو اپنے ساتھیوں سے یہ کہہ رہا ہو کہ تم خود بھی چلے جاؤ اور میرے رشتہ داروں کو بھی یہاں سے نکال کر لے جاؤ۔ خواہانِ جنگ نہیں سمجھا جا سکتا۔ کربلا کا المیہ تو دراصل راہِ حق میں ایک بہادرانہ احتجاجی مظاہرہ تھا۔ ستیبہ گرہ تھی صبح سے لے کر دوپہر تک ایک ایک مجاہد فرات کی طرف جاتا تھا۔ ملاعین اس کو روک کر جنگ کرتے تھے وہ جوابی جنگ کر کے اپنے فطری حقِ دفاع کو استعمال کرتا تھا۔ جب موت سے چھٹکارا نہ ملتا اور کسی کا تیز ہتھیار اس کی موت و زندگی کی کشمکش کا خاتمہ کرنے لگتا تو وہ امام عالیمقام کو اطلاع دے کر خود تسلیم و رضا کی اس اعلیٰ صفت کا مظاہرہ کرتا۔ جو بلند کردار انسانوں کو اللہ کی سب سے بہتر مخلوق ثابت کرتی ہے۔ کربلا کا معرکہ نہ اتفاقی تھا اور نہ اس کے اثرات وقتی اثر رکھتے تھے۔ اموی سیاست عرصہ سے اس کی تیاریاں کر رہی تھی اور مسلمانوں کی روشِ خیال و عمل اسی موڑ کی طرف گھوم رہی تھی۔ بنی ہاشم بھی اس رُخ کو سمجھ رہے تھے اور اس کے مقابلے کے لئے آمادہ تھے۔ اموی سیاست ساری نسلِ محمدؐ کو ایک ویرانہ میں گھیر کر موت کے گھاٹ اتارنا چاہتی ہے۔ تاکہ بے خبری کے عالم میں یہ لوگ ختم ہو جائیں اور عوام کے حافظے اور تاریخ کے صفحات سے ان کا نام و نشان گم ہو جائے۔

امام حسین علیہ السلام کے دور رس اور ہمہ گیر تدبر نے اموی سیاست کو شکست دے دی۔ انہوں نے یزید کی غیر قانونی اور ظالمانہ حکومت کے خلاف اس خوبی سے احتجاج کیا کہ ساری اسلامی دنیا کی توجہ انہی کی طرف مڑ گئی۔ ان کا اندازِ احتجاج اور طریقۂ اعلان بالکل انوکھا اور نرالا تھا۔ انہوں نے ظلم و تشدد کے مقابلے میں صبر و تحمل سے کام لیا۔ تیر برسانے والوں اور نیزہ لگانے والوں کو اسلامی آئین اور انسانی اقدار کی طرف بلایا ان سے کہا کہ تلواروں اور خنجروں کو ثالث اور حکم بنانا بڑی غلطی ہے۔ تم پہلے میرا قصور تو بتاؤ۔ مجھے قتل کرنے کے لئے جواز تو پیدا کرو۔ کوئی دلیل و برہان کہاں سے لاتے۔ ہاں جھنجھلا جھنجھلا کر تیر و تبر پھینکنے لگے۔ امام عالی مقام کا سب سے بڑا حربہ علی اصغرؑ کے لئے پانی طلب کرنا تھا۔ اس کو آپ نے سب سے آخر میں استعمال کیا اور یہ کہہ کر استعمال کیا۔ تم مجھے قصوروار سمجھتے ہو

اچھا مجھ پر ظلم کر لو۔ مگر یہ بچہ تو کسی دین اور آئین کی رُو سے مجرم نہیں۔ اس کو پانی کیوں نہیں پلاتے۔ دیکھو تو سہی حسینِ فاطمہؑ کا یہ ننھا سا پھول پانی کے بغیر کملایا جا رہا ہے۔ پیاسی ماں کا دودھ خشک ہو چکا ہے۔ قریب ہے کہ اس بچے کی زندگی کا سوتا بھی خشک ہو جائے ۔۔۔۔"

آہ ظالموں نے ششماہے بچے کو پانی دینے کی بجائے تیر کا نشانہ بنایا وہ سمجھتے تھے کہ کڑکنے والی کمان، زن زن کرتا ہوا تیر، بچے کے گلے میں سوراخ کرنے والا سوفار حسینؑ سے خرمنِ آرزو کو تاراج کر رہا ہے۔ ان کی آخری اُمید گاہ کا خاتمہ کر رہا ہے۔ ان کو یہ خبر نہ تھی۔ یہ بنی ہاشم کے مدبر کی تدبیر کا جچا ہوا تیر ہے جو اموی سیاست کو نشانہ بنا رہا ہے۔ ننھے علی اصغرؑ کے گلے سے جو گرم گرم خون بہا۔ جس نے شیر خوار کے کرتے اور حسینؑ کے چہرے کو رنگین کر دیا۔ رائیگاں نہیں گیا۔ اسی سے بنی امیہ کے ان بلند بانگ دعادی کی قلعی کھل گئی کہ ہم نے اپنی سلامتی کے لئے تلوار اٹھائی تھی اور سلطنت کے امن کو خاک میں ملانے کے خلاف چڑھائی کی تھی۔

میدانِ جنگ کے ایک کونے میں جب ناتواں باپ نے کانپتے ہاتھوں سے ایک ننھی سی قبر بنائی اور دنیا کے اس انوکھے مجاہد اور نرالے شہید کو خون بھرے کُرتے میں دفن کر کے فاتحہ پڑھی تو زمین و آسمان کانپنے لگے۔ آہ یہ قبر نہ تھی۔ حسینؑ کے عدیم المثال صبر و تحمل اور کوفیوں کے یادگارِ زمانہ ظلم کا تاقیامت رہنے والا نشان تھا۔ دوسرے شہیدوں کی لاشیں جلتی زمین پر پڑی رہیں۔ آسمان ان پر سایہ افگن رہا۔ اس ننھے شہید کی تجہیز و تکفین کا حسینؑ نے کیوں اہتمام کیا۔ شاید وہ ظلم و ستم کے اس انتہائی دل سوز مظاہرہ اور بے رحمی و سنگدلی کی اس بے مثال حرکت کو دنیا کی آنکھوں سے اوجھل کرنا چاہتے تھے تاکہ شقاوت و قساوت کی یہ افسوس ناک نشانی بنی آدم کو مخلوقِ خدا کی نگاہوں میں ذلیل نہ کر دے اور اس بُری مثال سے ستم پیشہ لوگوں کو سفاکی اور خونریزی کی مزید جرأت نہ ہو۔

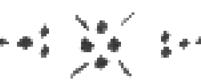
ہاں ۱۱ محرم کو جب اہلِ حرم کا لٹا ہوا قافلہ گنجِ شہیداں سے گزرا اور علی اصغرؑ کی ماں اور بہن نے بیکسی کے اس مزار کو دور سے دیکھا جس پر حسرت و یاس پاسبانی اور ریگِ گرم کے تیز و تند تھپیڑے مگس رانی کر رہے تھے تو پہلو میں دل بے چین ہو گیا منہ سے سرد

آہ نکلی اور آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

ہاتھ رسّی سے بندھے تھے۔ گلے میں طوق گرانبار تھا۔ پاؤں میں بھاری بیڑیاں تھیں مگر دونوں نے اپنے آپ کو اونٹ سے گرا دیا۔ اور دیر تک اس بیکسی کے مزار سے لپٹ کر روتی رہیں۔

اولاد والی مائیں آج بھی اس ننھے شہید کی یاد میں دودھ کے کوزے اور شربت کے گلاس بھرتی ہیں اور چھوٹے چھوٹے بچوں کو پلاتی ہیں تاکہ اس قتیلِ راہِ خدا کی یاد تازہ رہے جس نے اسلام کو سر بلند کرنے کے لئے اپنا ننھا منھا سا گلا تیر سے زخمی ہونے دیا۔ مگر اُف تک نہ کی اور گلے سے خون کا فوارہ اُبلنے کے بعد بھی مسکرا کر جان دی۔

کاش مسلمانوں کی موجودہ نسل اس بچے کی شہادت سے سبق لے اور ہمارے گھر میں آن پر جان دینے والے اور حق کی خاطر سر کٹانے والے بچے ہمیشہ پیدا ہوتے رہیں۔



تیسری مجلس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

الحمدللہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ اشرف الانبیاء والمرسلین والہ الطیبین الطاھرین۔ امّابعد۔ فقد قال اللہ سبحانہٗ تعالیٰ فی کتابہ المجید۔

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○ (۳ : ۳۱)

(اے رسولؐ) ان لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تم (سچ مچ) اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو۔ اللہ (خود) تم سے محبت کرنے لگے گا۔ اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا۔ اللہ تو بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

اس آیت پر غور کرنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ محبت کے زبانی دعوے بیکار اور بے فائدہ ہیں۔ کردار اور اعمال ہی محبت و نفرت کا ثبوت مہیا کر سکتے ہیں۔ روزمرہ کا مشاہدہ بتاتا ہے کہ جب ہم کو کسی سے محبت ہو جاتی ہے تو ہم اس کی ہر چیز کو پسند کرنے لگتے ہیں۔ اس کا لباس، اس کا طرزِ معاشرت، اس کی چال ڈھال، اس کا اندازِ گفتگو غرض اس کی ہر نقل و حرکت ہمارے دل میں گھر کر جاتی ہے۔ اور ہم اس کی ہر ادا کو اپنانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کی ہر صفت کی پیروی کرنا باعثِ سعادت سمجھتے ہیں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اپنے رسولؐ سے فرما رہا ہے کہ تم ان لوگوں کو جو ہمارے نام کی مالا جپتے ہیں اور ہمہ وقت "یاہو" اور "یاحق" کے نعرے لگاتے رہتے ہیں۔ یہ پیغام پہنچا دو کہ اللہ سے محبت کا ثبوت اپنے عمل سے دو۔ یعنی اپنی سیرت اور معاشرے کو اللہ کے لئے پسندیدہ بنا کر دکھاؤ۔ اور یہ اس وقت ہو سکتا ہے کہ تم میرے

نقشِ قدم پر چلو۔ اور میرے اسوۂ حسنہ کو مشعلِ راہ بناؤ۔ اگر ایسا کرو گے۔ تو اللہ خود ہی تم سے محبت کرنے لگے گا اور تمہاری خطاؤں سے درگزر کرے گا۔

نفسیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان حیوان نقال ہے، وہ اپنے ہم جنسوں کو جو عمل کرتے دیکھتا ہے اسی کی نقل اُتارنے کی کوشش کرتا ہے۔ کسی شاعر نے خوب کہا ہے

در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
آنچہ استادِ ازل گفت ہماں می گویم

جب طوطے[1] کو بولنا سکھاتے ہیں تو اس کے پنجرے کے سامنے ایک بڑا سا آئینہ کے پیچھے ایک آدمی چھپ کر بیٹھ جاتا ہے اور جو کچھ سکھانا ہوتا ہے وہ بار بار دھراتا ہے توتا اپنا عکس آئینہ میں دیکھ کر یہ سمجھتا ہے کہ یہ آواز میرے ہم جنس توتے کے منہ سے آ رہی ہے اور اس کی نقل اتارنے کی کوشش کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ اللہ نے ہماری ہدایت کے لئے ملائکہ کو زمین پر نہیں بھیجا۔ جنوں کو ہمارا ہادی و مرشد نہیں بنایا بلکہ "انسان" ہاں ایک انسانِ کامل کو ہماری اصلاح کے لئے مقرر کیا۔ عرب کہتے تھے:-

ما لھذا الرسول یاکل الطعام ویمشی فی الاسواق

ہائیں! یہ کیسا رسولؐ ہے۔ یہ تو کھانا بھی کھاتا ہے اور بازاروں میں گھومتا بھی ہے۔ کیا ملائکہ کو رسولؐ بنا کر نہیں بھیجا جا سکتا تھا۔ تاکہ ہم اس اجنبی اور انوکھی مخلوق کو دیکھ کر اپنے جذبۂ استعجاب و حیرت کی تسکین کر لیتے۔ اللہ نے فرمایا:-

قُلْ لَّوْ کَانَ فِی الْاَرْضِ مَلٰٓئِکَۃٌ یَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّیْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَیْہِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَکًا رَّسُوْلًا (آیت ۹۵۔ بنی اسرائیل پ۱۵)

(اے رسولؐ تم کہہ دو کہ اگر زمین پر فرشتے بسے ہوئے ہوتے کہ اطمینان سے چلتے پھرتے تو ہم ان کے پاس فرشتے ہی کو رسول بنا کر نازل کرتے)

یہ انبیاء و آئمہؑ جو ہماری ہدایت کے لئے بھیجے گئے نہ صرف انسان تھے بلکہ انسانیت کا مکمل نمونہ تھے یہ نہ تو بالکل دنیا میں ڈوب گئے تھے کہ آخرت کی خبر ہی نہ رہ جاتی، نہ

[1] عصرِ حاضر کے انشاپرداز توتے کو "ت" سے لکھتے ہیں۔

بالکل تارک الدنیا تھے کہ اجنبی مخلوق اور دوسری دُنیا کے باشندے نظر آتے۔ انہوں نے شادیاں کیں، گھر گرہستی کے فرائض انجام دیئے، تہذیب و اخلاق کے ساتھ ساتھ تدبیرِ منزل کے کمالات بھی دکھائے، سیاستِ مدن میں بھی ہماری رہنمائی کی اور جب وقت آیا۔ اور موقع ملا تو تعلقاتِ بین الاقوامی کو بھی حسن و خوبی سے برقرار رکھا اور سرانجام دیا۔ اللہ ارشاد فرماتا ہے :-

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً (پ ۱۳ سورہ ابراہیم)

(اے رسولؐ حقیقتاً ہم نے آپ سے پہلے بھی رسول بھیجے تھے، اور ان کو بھی بیویاں اور اولاد عطا کی تھی)

رسولؐ کی آمد کا منشاء اصلاح حال و تزکیہ نفوس ہے۔ وہ ہر شعبۂ حیات میں ہماری ہدایت و رہنمائی کا ذمہ دار ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ اس کی زندگی ایسی جامع اور مکمل ہو کہ اس کا نقشِ قدم ہر راہ پر ہماری رہنمائی کر سکے۔ اگر وہ راہب اور گوشہ گیر ہوگا۔ اگر کشمکشِ حیات سے اس کو واسطہ نہ ہوگا۔ تو وہ راہبوں کی کوئی جماعت اور جوگیوں اور درویشوں کی کوئی خانقاہ تیار کرنے میں کامیاب ہو سکے تو ہو سکے مگر سیاسی، سماجی اور معاشی عقدوں کو حل نہ کر سکے گا۔ اور دنیا آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے ہٹتی جائے گی۔ اگر وہ خود شادی نہ کرے۔ گھر کی ذمہ داریوں کو نہ سنبھالے تربیت و تعلیم کے ذریعے اپنی اولاد کو ترقی کا راستہ نہ دکھا سکے تو اپنی اُمت کے لئے قابلِ تقلید مثال کس طرح بن سکے گا۔ اور وہ کس کا نمونۂ زندگی دیکھ اپنی عادات و سیرت کی اصلاح کریں گے۔

کسی راہب کی زندگی تو جیتا جاگتا Atom Bomb ہے جو نسلِ انسانی کو ہلاکت کا راستہ دکھا رہی ہے۔ اس لئے ہادی کو ایسا ہونا چاہیئے کہ وہ معاد کے ساتھ ساتھ معاش کی تنگیوں، آسائشوں، دقتوں، دشواریوں اور آسانیوں سے آشنا ہو اور اس کو ان سے دوچار ہونے کا موقع ملا ہو۔ تاکہ اس کی مثال دیکھ کر اس کی اُمت اپنے لئے لائحہ عمل تیار کر سکے۔

وہ مذاہب جو ترکِ دنیا اور تیاگ پر زور دے رہے ہیں اور محنت و مشقت سے روزی کمانے کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کسی ترقی پذیر معاشرے میں مقبول نہیں ہو سکتے۔ ان کی سرکردگی میں انسانوں کا جو قافلہ چلے گا۔ وہ ذلت و خواری اور ہلاکت و تباہی کے غار میں گرے بغیر نہیں رہ سکتا۔ محمدؐ و آلِ محمد علیہم السلام کی زندگی نوعِ انسانی کے سامنے رہن سہن کا معتدل معیار پیش کرتی ہے۔ اللہ نے انسان کو جتنی جبلتیں (INSTINCTS) عطا فرمائی ہیں اُنہوں نے سب سے کام لیا۔ نہ کسی کو ختم کرنے کی کوشش کی نہ کسی کو حدِ اعتدال سے آگے بڑھنے کا موقع Self Preservation جبلت حفظِ ذات کا تقاضا تھا کہ ہر خطرہ سے اپنے نفس کی حفاظت کی جائے۔ اور خواہ مخواہ اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالا جائے انہوں نے بھی اللہ کی دی ہوئی جان کو فضول و رائیگاں ضائع ہونے سے بچایا۔ ہاں جب جان سے بڑی چیز ایمان پر آنچ آتے دیکھی تو جان قربان کرنے سے دریغ نہ کیا۔ اور اس طرح اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (بے شک اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال اس وعدے پر خرید لیے ہیں، کہ ان کو اس کے بدلے میں جنّت ملے گی) پر مُہر تصدیق ثبت کر کے دکھا دی

Sex instinct جنسی جبلت بھی اللہ کا عطیہ ہے۔ نہ اس کا استیصال موافقِ فطرت ہے۔ نہ اس کا بیجا استعمال مطابقِ قانونِ شریعت۔ ان مقدس حضرات نے اس جبلت کا صحیح استعمال کر کے نسلِ انسانی کی افزائش میں حصہ لیا۔ اپنا مثل اور جانشین پیدا کر کے نوعِ بشر کو آگے بڑھانے کی کوشش کی اور اپنی عائلی اور گھریلو زندگی کا نمونہ پیش کر کے اپنے پیروؤں کے لئے قابلِ تقلید مثال قائم کی۔

دنیا میں ایسے مذہبوں کی اکثریت ہے جو جنسی جبلت کو ایک لعنت سمجھتے ہیں اور مثالی انسان اسی کو سمجھتے ہیں جو شادی بیاہ اور گھر گرہست کے جھگڑوں سے الگ رہے تاریخ ادیان پر نظر ڈالیے تو مذہب کی تعریف ہی یہ ملے گی کہ "وہ نشہ جو دُنیا کے جھمیلوں سے الگ ہٹا کر آدمی کو آخرت کے خوابستان میں جا سلائے۔"

گوتم رشی جن کے چھوٹے بڑے بُت ساری ایشیا میں مرجع خواص و عام ہیں اس

مسلک کے سب سے بڑے حامی گزرے ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ کی زندگی سے بھی ان کے ماننے والوں نے یہی نتیجہ نکالا ہے۔ آج بھی بہت سے رشی، ولی اور پادری اسی جادہ پر چلنا باعث نجات سمجھتے ہیں۔

مگر اللہ فرماتا ہے کہ میری دوستی کا دم بھرتے ہو تو رسولِ عربیؐ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلو۔ یعنی تہذیبِ نفس کی دُھن میں تدبیرِ منزل کو نہ بھول جاؤ اور آخرت کے پیچھے پڑ کر اس دنیا کو ترک نہ کر دو۔

حضرت رسول اللہؐ کا ارشاد ہے:- لیس منا من ترك الدنيا للآخرة ومن ترك الآخرة للدنيا۔ (دونوں ہم میں سے نہیں ہیں، وہ جو آخرت کی دُھن میں اس دُنیا کو ترک کر دے یا اور وہ جو اس دنیا میں ایسا غرق ہو جائے کہ آخرت کا خیال چھوڑ دے)

رسول مقبولؐ کی پیروی کا حکم اسی لئے دیا گیا ہے کہ ان کی زندگی نوعِ انسانی کے لئے سچی مثالی ہے۔ وہ دنیا کو آخرت کی کھیتی سمجھتے تھے۔ (الدُّنیا مزرعة الآخرة) اور معاشرہ اور سماج کے سارے جائز و مفید فرائض ادا کرنا ضروری خیال کرتے تھے۔

تاریخ شاہد ہے کہ وہ جو سارے دن تبلیغ و اشاعت کے کاموں میں لگا رہتا تھا انتظامِ ملکی اور انصرامِ فوجی میں مصروف تھا جس کو عمالِ حکومت اور حکام فوجی کے مراسلے سننے اور مناسب احکام دینے سے فرصت نہ تھی راتوں کو عبادت اور اوراد و وظائف میں مشغول رہتا تھا۔ اتنا وقت ضرور نکالتا تھا کہ ازواج کے گھروں میں جائے اور اولاد کی تعلیم و تربیت میں حصہ لے سکے۔

فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی تعلیم و تربیت کا سارا بار بظاہر آنحضرتؐ ہی پر تھا امام حسن علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام کی سیرت کے وہ نقوش جو آج اپنے اور پرائے کی توجہ جذب کئے ہوئے ہیں کیا ناناؐ کی آغوشِ تربیت کے ثمر نہ تھے؛ خود اُن کے والد ماجد علی ابن ابی طالبؑ نے بھی سب کچھ خدا کے بعد اسی استاد اور مربی سے حاصل کیا تھا۔

آنحضرتؐ کے دور سے قبل مذہب کا یہی مفہوم سمجھا جاتا تھا کہ اس کو معاملاتِ دنیا سے کوئی سروکار نہ ہو اور مذہبی آدمی کہتے ہی اس کو تھے جو تمدنی ذمہ داریوں سے منہ موڑ کر جنگل میں

جا بیٹھے۔ کرہ ارض کی حالت سے آگاہ نہ ہو۔ مگر آسمان کی باتیں بتائے۔

قرآن شریف نے نجران کے ان عیسائی پادریوں کا ذکر کیا۔ جو رسولِ اکرم سے مناظرہ کرنے کے لئے آئے تھے۔ جب بحث و مباحثہ سے کوئی نتیجہ نہ نکل سکا تو یہ قرار پایا کہ مباہلہ کیا جائے۔ یعنی کچھ لوگ اِدھر کے اور کچھ اُدھر کے ایک جگہ جمع ہو کر اللہ سے دُعا مانگیں کہ دونوں جماعتوں میں سے جو جماعت جھوٹی ہو اس پر اللہ کا عذاب نازل ہو۔

عیسائیوں کا خیال تھا کہ بیوی، بچے اور گھر بار روحانیت کی راہ میں روڑا اٹکاتے ہیں اور اللہ کے دربار میں مقبول وہی بندے ہوتے ہیں جو اس وبال سے پاک ہوں۔ اللہ نے آیہ مباہلہ میں ان کے اس خیال کی تردید کی ہے اور ان کی اس راہبانہ زندگی پر ہلکا سا طنز کیا ہے: فرماتا ہے:-

قُل تعالَوا ندعُ ابناءنا وابناءکم ونساءنا ونساءکم وانفسنا وانفسکم ثم نبتهل فنجعل لعنة الله على الكٰذبين۔ "اے رسول! ان سے کہدو کہ آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بُلا کر لے آئیں۔ تم اپنے بیٹوں کو لے آؤ، ہم اپنی بیٹیوں کو بلا لائیں تم اپنی بیٹیوں کو بلا لو۔ ہم اپنے بھائیوں کو بلا لیں تم اپنے بھائیوں کو بلا لو۔ پھر ہم مل کر مباہلہ کریں اور اللہ سے دُعا کریں کہ وہ جھوٹوں پر پھٹکار نازل کرے۔"

عربی محاورے میں اور قرآن کے اندازِ بیان کے مطابق جب "ابناء" کے ساتھ "نساء" آتا ہے تو اس سے بیویاں نہیں بلکہ بیٹیاں مراد ہوتی ہیں۔ جیسا کہ بنی اسرائیل کے بیان میں ارشاد ہوتا ہے یذبحون ابناءکم ویستحیون نساءکم "وہ تمہارے بیٹوں کو قتل کر دیتے تھے اور بیٹیوں کو چھوڑ دیتے تھے" یہاں بیویوں کا ذکر ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ قتل کا حکم اولاد کے لئے تھا نہ کہ بیویوں کے لئے۔

اسی طرح عربی محاورے اور قرآنی اندازِ بیان میں "نفس" بھائی بند کے لئے بھی آتا ہے۔

میدانِ مباہلہ میں رسول اکرمؐ جن لوگوں کو لے کر گئے ان میں حضرت فاطمہؑ حضرت علیؑ اور

ولا تقتلوا انفسکم (سورۂ نساء آیت ۲۹) کی تفسیر میں مفسرین لکھتے ہیں کہ یہاں انفسکم کے معنی اخوانکم یا من جنسکم ہے (تفسیر کبیر۔ ابن جریر۔ مستدرک)

امام حسنؑ و حسینؑ کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ گویا یہ مقدس ہستیاں ہی اس آیت کی تفسیر تھیں۔ "ابنا" کی تفسیر حسنؑ و حسینؑ تھے، "نساء" کی تفسیر حضرت فاطمہؑ تھیں۔ "انفسنا" کی تفسیر آپ کے "برادر بجان برابر" علیؑ ابن ابی طالب تھے۔

اب پادری، جن کی زندگی "جو رو نہ جانتا، اللہ میاں سے ناتا" کی تفسیر تھی۔ آنحضرت کا منہ دیکھ رہے تھے آنحضرتؐ کے خاندان اور اہل بیتؑ کے روحانی جلال سے مرعوب تھے۔ رسولِ اکرمؐ کا اپنے پیاروں کو میدانِ مباہلہ میں لے کر آنا دو بنیادی حقیقتوں کا اعلان کر رہا تھا۔ ایک تو یہ کہ دین و مذہب ترکِ دنیا کا نام نہیں ہے، اولاد روحانی راہ کے لئے روڑا نہیں ہوتی۔ بلکہ اللہ اچھی اولاد دے تو دین و دنیا دونوں میں بیڑا پار ہو جاتا ہے۔

دوسرے یہ کہ ہمارا دعویٰ نبوت اگر جھوٹا ہوتا تو ہم اپنے پیاروں کو لے کر میدان میں کیوں آتے۔ ہم کو اپنی صداقت کا اتنا بڑا یقین ہے کہ ہم ان ساری عزیز ترین شخصیتوں کو لے کر آئے ہیں۔ جن کے اوپر اگر خدانخواستہ کوئی آنچ آجائے تو پھر ہمارا دنیا میں رہ ہی کیا جائیگا یہ بیٹی فاطمہؑ ہے، یہ اس کے دو لڑکے ہیں۔ یہ ہمارا بھائی اور داماد ہے۔ بس ہماری عائلی محبت و الفت کی یہی کل کائنات ہے۔

آدمی سارے پاپڑ اولاد ہی کے لئے بیلتا ہے۔ سارے جتن عزیز و اقارب ہی کیلئے کرتا ہے۔ تو ہم ان کو میدانِ ابتلا میں لے آئے ہیں۔ ہم کو اپنے دعویٰ پر ذرا بھی شبہہ ہوتا تو اس متاعِ عزیز کو لے کر نہ آتے۔ تاریخ داں حضرات جانتے ہیں کہ اس مظاہرہ کا یہ اثر ہوا کہ عیسائی پادری مباہلے کے لئے آمادہ نہ ہوئے بلکہ یہ کہنے لگے کہ ان نورانی چہروں اور مقدس صورتوں کے مقابلہ کی تاب کس کو ہو سکتی ہے؟

انسان کی ایک جبلت "تلاشِ غذا" (Food Seeking) ہے صحیحِ آفرینش میں ب نسلِ انسانی اپنی زندگی کے ابتدائی سانس لے رہی تھی۔ آدمی بھی دوسرے جانداروں کی رح اسی کا عادی تھا۔ کہ جب بھوک لگتی تو غذا کی طرف توجہ کرتا۔ ابتدا میں پھل ترکاری کھا کر پیٹ ں آگ بجھاتا تھا۔ پھر شکار کر کے کچا پکا گوشت کھانے لگا۔ جیسے جیسے شائستگی اور تمدن نے قی کی چٹورپن بھی بڑھتا گیا۔ اور کل کے لئے آج ہی سامان ہونے لگا ——— قسم قسم کے

باغ لگائے کہ ہر موسم میں پھل میسر آسکیں۔ بھانت بھانت کے پرندے اور چرندے پالے کہ ان کا گوشت کام و دہن کی تواضع کرے۔ کھیتوں میں اناج اور ترکاریاں بوئیں کہ پیداوار کا ذخیرہ وقت ضرورت کام آسکے۔ یہ سب کچھ اسی جبلت کی تسکین کے لئے تھا۔ جس کو جبلت "تلاشِ غذا" کہتے ہیں۔

انسان سے تو اصلاً حیوان اور حیوانوں کا یہ حال ہے کہ جب بھوک لگتی ہے تو لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں۔ نہ آؤ دیکھتے ہیں نہ تاؤ۔ بس جو سامنے آیا اس پر حملہ کر دیا اور جو چیز نظر آئی اس کو چھین کر کھانے لگے۔ درندوں کا حال خصوصی طور پر نگاہ کے سامنے رکھنے کے قابل ہے کہ جب دیو استہا ان کے سر پر سوار ہوتا ہے تو غراتے ہیں، ڈکارتے ہیں، چنگھاڑتے ہیں اور جب تک شکار نہ مل جائے اور کھانے کے لئے کوئی چیز ہاتھ نہ آجائے زمین آسمان ایک کر دیتے ہیں۔ اگر انسان بھی بھوک کے عالم میں یہی طرزِ عمل اختیار کرے تو اس میں اور حیوان میں فرق کیا رہا؟ مگر غور سے دیکھئے۔ انسانوں کا حال تو جانوروں سے بدتر ہے۔ جانور بھوک کے وقت بلبلاتا ہے یہ تو برسوں پہلے سے اپنی اور اپنے متعلقین کی غذا کے لئے ذخیرے کرتے ہیں اور اسی ذخیرہ کی خاطر ہزاروں آدمیوں کو برباد اور بیسیوں ملکوں کو تاراج کر ڈالتے ہیں۔

انسانوں کو جانوروں کے مقابلہ میں کوئی بہتر ریکارڈ پیش کرنا چاہیئے۔ کتے روٹی کے ٹکڑے پر لڑتے جھگڑتے ہیں۔ بلیاں ہڈی کی خاطر چیختی چلاتی ہیں۔ کیا۔ انسان بھی اتنا ہی گیا گزرا رہے گا۔ اور پیٹ کی خاطر دوسروں کو نشانۂ ظلم بنانے سے دریغ نہ کرے گا۔ محمدؐ و آلِ محمدؐ کی زندگی بتاتی ہے کہ انسان کو اپنی ساری جبلتوں کو حیوانی سطح سے بلند کر دینا چاہیئے۔

آیئے تاریخ کے صفحات پر ان تین روزوں کا ذکر پڑھیں جو علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ، حسینؑ اور فضہ نے ایفائے نذر کے سلسلہ میں رکھے تھے۔ پہلے دن روزے رکھ لئے گئے۔ مگر گھر میں کچھ کھانے کا سامان موجود نہ تھا۔ حضرت علیؑ علیہ السلام شمعون یہودی کے ہاں گئے اور اون کاتنے کے لئے لائے۔ حضرت فاطمہؑ نے اون کے تین حصے کئے اور اس کی مزدوری کے طور پر جو جو شمعون نے دیئے تھے ان کو بھی تین حصوں میں تقسیم کیا۔ پہلے دن اون

کا ایک حصہ کاتا اور شام کو اس کی مزدوری کے طور پر ایک حصہ جو پیس کر آٹا تیار کیا۔ اور پانچ روٹیاں پکائیں۔ جب آفتاب غروب ہوا آسمان پر اندھیرا چھانے لگا اور تارے نکل آئے۔ تو سب نے نماز ادا کرنے بعد افطار کرنا چاہا۔ اتنے میں باہر سے کسی کی آواز آئی۔

"اے اہل بیتؑ! ایک مسکین آپ کے دروازے پر کھڑا ہے۔ کئی وقت سے کھانے سے محروم ہے۔ اگر ہو سکے تو کچھ بھجوائیے۔"

یہ آلِ محمد کے جذبہ ایثار اور مواسات کی آزمائش تھی۔ اپنی ضرورت سے زیادہ چیزوں کو خیرات کرنا بھی مشکل کام ہے۔ مگر اتنا مشکل نہیں کہ لوگ نہ کر سکیں۔ مگر آلِ محمد کا درجہ تو بلند ہے ان کو دنیا کے لئے مثال قائم کرنی ہے۔ یہ صبح سے شام تک بھوکے رہے مگر جو مسکین در پر کھڑا ہے وہ اپنے آپ کو کئی وقت سے بھوکا بتا رہا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام نے اپنے حصہ کی روٹی اٹھا کر دے دی۔ حضرت فاطمہؑ نے بھی علیؑ کی پیروی کی۔ حضرت امام حسن علیہ السلام اور حضرت امام حسین علیہ السلام اگرچہ کمسن تھے مگر تھے تو علیؑ و فاطمہؑ کے فرزند، انہوں نے بھی اپنی اپنی روٹی اٹھا دی۔ حضرت فضہ بھی تو آخر اسی گھر کی ایک رکن اور انہی بزرگ ہستیوں کی صحبت یافتہ تھیں۔ ان سے بھی نہ رہا گیا۔ اور انہوں نے بھی اپنی روٹی راہِ خدا میں دے دی۔ سب نے پانی سے روزہ افطار کیا۔ دوسرے دن بھی روزہ رکھا گیا۔ آج فضہ کی باری تھی انہوں نے اون کا حصہ کاتا۔ جو کا ایک حصہ لے کر پیسا۔ اور پھر پانچ روٹیاں تیار کیں۔ روزہ افطار کرنے بیٹھے ہی تھے۔ کہ دروازے سے آواز آئی۔

"اے اہل بیتؑ! ایک یتیم آپ کے دروازے پر کھڑا ہے۔ جس پر کئی وقت سے فاقہ ہے ہو سکے تو اس کی دستگیری کیجئے۔"

آلِ محمد نے جو ایثار کے مجسمے تھے پھر اپنی اپنی روٹیاں اٹھا کر راہِ خدا میں دے دیں۔ اور حضرت فضہ نے بھی ان کا اتباع کیا۔ سب نے پانی سے روزہ کھولا۔ اور تیسرے دن کے روزے کی نیت کر لی۔

تیسرے دن بھی اسی طرح اون کاتا گیا۔ جو کا بقیہ حصہ پیس کر روٹیاں تیار ہوئیں۔ افطار

کا وقت آیا۔ تو سب لوگ کھانے کے لئے بیٹھے۔ یکایک دروازے سے کسی نے پکارا۔

"اے آلِ محمدؐ! ایک اسیر آپ کے دروازے پر کھڑا ہے۔ جس کی روزی کا بندوبست آج آپ کے ذمہ ہے۔"

صدرِ اسلام میں جو لڑائیاں ہوئیں ان میں قیدی گرفتار کر کے لائے جاتے تھے۔ قاعدہ یہ تھا کہ ان کو باری باری مسلمانوں کے گھر سے روٹی ملتی تھی آج اس قیدی کا آذوقہ علیؑ کے گھر سے ملنے والا تھا۔ چنانچہ اس آواز پر حضرت علیؑ نے اپنے سامنے کی روٹی اٹھا دی اور ان کے ساتھ گھر کے دوسرے لوگوں نے بھی اپنی اپنی روٹی اٹھا کر اس قیدی کو دے دی تین دن کے روزے اس طرح گزر رہے اور پھر سارا گھر بھوکا سو رہا تو رسولِ مقبولؐ پر سورۂ "ہل اتی" کا نزول ہوا۔ جس کی حسب ذیل آیتیں قابلِ غور ہیں۔

يُوفُونَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُونَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِيرًا ○ وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ○ إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا ○

(یہ وہ لوگ ہیں جو منت پوری کرتے ہیں اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس کی سختی ہر طرف پھیلی ہوئی ہوگی وہ باوجود اس کے کہ کھانے کی ان کو بھی خواہش ہوتی ہے مسکین، یتیم اور اسیر کو کھانا کھلاتے ہیں (اور یہ کہتے ہیں) کہ ہم تو تم کو محض اللہ کی خوشنودی کے لئے کھانا کھلاتے ہیں۔ نہ ہم تم سے کوئی بدلہ چاہتے ہیں۔ اور نہ شکریہ) اللہ نے علیؑ کے گھرانے کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔ یہ لوگ جب نذر کرتے ہیں تو اس کو پورا کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کے دل میں اس بھیانک دن کا خوف ہے جس کی سختی ہر طرف پھیلی ہوئی ہوگی۔ ہر چند کہ خود بھوکے ہوتے ہیں۔ مگر جب مسکین یا یتیم یا اسیر ان کے در پر آ کر سوال کرتا ہے تو اس کو محروم نہیں کرتے۔ ایثار اور مواسات کا یہی جذبہ ہے جو انسان اور حیوان کے درمیان امتیاز قائم کرتا ہے۔ انسان کی یہی وہ صفت ہے جو افراد اور طبقات کی جنگ کو روک سکتی ہے۔ یہ آئے دن لڑائیاں کیوں ہوتی ہیں؟ صرف اس لئے کہ افراد اور اقوام دوسرے کی ہانڈی اتار کر اپنی ہانڈی چڑھانا چاہتی ہیں۔ دوسرے کے منہ

سے لقمہ چھین کر خود چٹ کر جاتے کی فکر میں رہتی ہیں۔ زمانہ ماقبل تاریخ سے لے کر جب انسان کی ضروریات کم تھیں آج تک جب حرص و آز کی قبر کسی طرح بھرنے ہی نہیں پاتی ساری لڑائیاں اور سارے جھگڑے محض اسی لئے ہوتے آئے ہیں کہ ایک انسان دوسرے کی روزی چھیننا چاہتا ہے۔ ایک طبقہ دوسرے طبقہ کی دولت پر تاک لگائے بیٹھا ہے ایک قوم دوسری قوم کے خام مال اور منڈی پر قبضہ کرنا چاہتی ہے۔ اگر ہم اپنا پیٹ کاٹ کر دوسرے کا پیٹ بھرنے کی عادت ڈال لیں تو یہ سارے جھگڑے آناً فاناً ختم ہو کر رہ جائیں۔ آلِ محمدؐ کے ان تین روزوں کے سلسلے میں ہم کو چند اہم سبق ملتے ہیں۔

(۱) انسان کو حیوانوں سے بلند ہونا چاہیئے۔ اپنے ہم جنسوں کے دُکھ درد میں شرکت کرنی چاہیئے۔ اگر ہم ایثار پیشہ بن جائیں تو سارے معاشی، سیاسی اور طبقاتی جھگڑے ختم ہو سکتے ہیں۔

(۲) ہاتھ سے کام کرنا اور جائز مزدوری حاصل کرنا کوئی عیب کی بات نہیں۔ دیکھو حضرت فاطمہؑ چرخہ چلا کر مزدوری کرتی تھیں۔ کام سے پہلے اس کی اُجرت کو کام میں نہ لاؤ۔ ہاں جب کام کر لو تو اس کی اُجرت استعمال کر سکتے ہو۔

(۳) اس دُنیا میں ہر انسان کے کچھ فرائض ہیں اور کچھ حقوق ہیں۔ یہ مادہ پرست تمدن کا فتنہ ہے کہ حقوق حقوق کے نعرے تو لگ رہے ہیں مگر فرائض کی طرف کسی کو توجہ نہیں۔ طبقاتی جنگ کی آگ مشتعل کرنے والے دیکھیں کہ علیؑ کے گھر میں ایک عادلانہ نظام جاری تھا۔ ایک دن سیّدہ گھر کا کام کرتی تھیں۔ دوسرے دن حضرت فضہ گرہستی سنبھالتی تھیں۔ جب حقوق برابر تھے تو فضہ نے یہ گوارا نہ کیا کہ فرائض میں برابری نہ ہو۔ اس لئے جب سیّدہ طاہرہؑ نے اپنے سامنے کی روٹی اٹھا دی تو فضہ نے بھی اسی طرح کے ایثار کا مظاہرہ کر کے یہ بتایا، کہ مساوات ہے تو حقوق و فرائض دونوں میں مساوات ہونی چاہیئے۔

(۴) لوگوں کا قاعدہ ہے کہ وہ خیرات میں بھی تجارتی پہلو سامنے رکھتے ہیں۔ صدقہ، زکوٰۃ، خمس اُنہی لوگوں کو دیتے ہیں جن پر احسان کرنے سے ان کو کچھ تبادلہ میں ملنے کی

ضرورت ہو۔

مثلاً اگر کسی الیکشن میں کھڑا ہوتا ہے تو خیر و خیرات اس حلقہ میں کرتے ہیں۔ جہاں ہمارے ووٹر کثرت سے رہتے ہوں۔ یا اگر کسی ادارہ کی امداد کے لئے لاٹ صاحب نے اپیل کی ہے۔ تو جلدی سے ایک معقول رقم چندے میں دے دیتے ہیں اور اگر کسی ادارہ کو کسی بڑے افسر یا عہدہ دار کی سرپرستی حاصل نہ ہو تو ہماری جیب سے اس کو کچھ نہیں ملتا۔

ہم کسی یتیم خانہ کو چندہ اس غرض سے دیتے ہیں کہ اخبار میں ہمارا نام شائع ہو جاتا ہے لوگ واہ واہ کرتے ہیں، حریفوں پر دھاک جمتی ہے۔ ہم چشموں میں سربلندی کا موقع ملتا ہے۔

مگر آلِ محمدؐ نے چند گمنام لوگوں کی امداد کر کے ہم کو یہ سبق سکھایا ہے کہ اصل خیرات کسی ضرورت مند کی حقیقی ضرورت کو پورا کرنے کا نام ہے۔ انہوں نے ایسے لوگوں کی امداد کی جن کو نہ اس سے پہلے وہ جانتے تھے نہ بعد میں اُن سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ اگر اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں اُن کے اس ایثار کا ذکر نہ کرتا تو شاید کسی کو کانوں کان بھی اطلاع نہ ہوتی۔ وہ لوگ جو آلِ محمدؐ کے اس ایثار سے مستفید ہوئے مدینہ میں بھی اس قدر گمنام اور غیر معروف تھے کہ کسی کو اُن کا پتہ نہ چلا۔ آج تک یہی کہا جاتا ہے کہ آسمان کے فرشتے تھے جو آلِ محمدؐ کے بذل و سخا کا امتحان لینے آئے تھے۔

(۵) ایثار چھوٹا ہو بڑا اگر کسی کی حقیقی ضرورت پوری کر دے تو اللہ کے دربار میں بھی مقبول ہوتا ہے اور دنیا بھی اس کی قدر کرتی ہے۔

بھوک کے وقت کسی آدمی کو چند روٹیاں دے دینا ان لاکھوں روپیہ کی داد و دہش سے بہتر ہے جو پیٹ بھرے لوگوں کے تعیشات کے لئے وقف ہو کر رہ جاتے انسان کی ہر جبلت سے شاطر لوگوں اور قابو یافتہ جماعتوں نے فائدہ اٹھانا چاہا ہے۔ اور تاریخ کے دَور میں ایسے لوگ گزرے ہیں جنہوں نے نسلِ آدم کو اپنا غلام بنانے یا ان سے مفت کام لینے کے لئے ان کی جبلتوں کے تقاضوں کو استعمال کیا ہے۔ مثلاً بھوک اور

پیاس ہر شخص کو لگتی ہے۔ آدمی کسی حد تک اس کو برداشت کرسکتا ہے۔ لیکن ایک ایک حد ایسی آجاتی ہے جس کے بعد دل و دماغ اور اعضا و جوارح جواب دینے لگتے ہیں۔ ظالم بادشاہوں اور ستم پیشہ ڈاکو پانی بند کرکے اور بھوکا مار کے افراد سے من مانی کراتے رہے ہیں۔ شہروں کی رسد کے ذرائع منقطع کرکے وہاں کے باشندوں کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کرتے رہے ہیں۔ ملکوں کے وسائل آب و دانہ پر قبضہ کرکے ان کو اپنے زیر نگیں لاتے رہے ہیں مگر اسلام نے ان سب اخلاق سوز حرکتوں کو ممنوع قرار دیا ہے

جنگ صفین کا قصہ کس کو معلوم نہیں امیر شام کی فوجیں میدان میں پہلے پہنچ چکی تھیں اور انہوں نے صفین کے گھاٹ پر اس نیت سے قبضہ کرلیا تھا کہ جب علیؑ آئیں گے تو انکے لشکر پر پانی بند کرکے انکو جلدی سے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کردیں گے۔ حضرت علیؑ جب میدان میں پہنچے تو ان کی خدمت میں یہ اطلاع پیش کی گئی۔ آپ نے حکم دیا کہ معاویہ کو لکھا جائے کہ پانی کسی فرد اور جماعت کی ملکیت نہیں۔ وہ اللہ کا فیض عام ہے۔ کافر اور مسلم سب کے لئے کھلا ہوا ہے۔ تم اس غیر اسلامی اقدام اور انسانیت سوز حرکت سے باز آؤ۔ اتنی بڑی فوج کو پانی سے کون روک سکتا ہے۔ تنگ آمد بجنگ آمد۔ ان کو آسانی سے پانی نہ ملے گا تو لڑ بھڑ کر لیں گے۔ اور تمہارا یہ حکم امتناعی چل نہ سکے گا۔

امیر شام نے ایک نہ سنی۔ آخر حضرت علیؑ کو فوج کا ایک دستہ گھاٹ پر بھیجنا پڑا۔ اور اس نے بزور شمشیر گھاٹ خالی کرالیا۔

اب موقع تھا کہ حضرتؑ شام والوں کو اُن کے کیے کی سزا دیتے اور گھاٹ پر قبضہ کرکے اُن پر پانی بند کردیتے۔ حضرت کے ساتھیوں نے یہی رائے دی۔ عبداللہ ابن عباس اور مالک اشتر جیسے جرنیلوں نے یہی کہا کہ چند گھنٹے پانی بند کرکے تو دیکھیے، بڑے بڑے سورماؤں کے چھکے چھوٹ جائیں گے اور لڑائی مہینوں کے بجائے گھنٹوں میں ختم ہوجائے گی۔ مگر رحم مجسم خُلقِ اتم حضرت علیؑ نے نہ مانا۔ اور مانتے کس طرح۔ وہ دنیا میں لڑائیاں جیتنے اور سلطنتوں کی بنیادیں رکھنے کے لئے تھوڑا ہی آئے تھے۔ وہ تو انسانی اقدار اور اخلاقی معیار قائم کرنے کے لئے

بھیجے گئے تھے۔ اگر آج وہ پانی بند کرکے لڑائی جیت لیتے تو شام کا ملک تو آسانی سے فتح ہوجاتا۔ شاید اپنی اولاد کو مدت تک کے لئے ایک سلطنت کا مالک بھی بنا جاتے مگر انسان کا یہ بنیادی حق کہ "وسائلِ آب و غذا کسی فرد کی ملکیت نہیں ہوتے، وہ تو اللہ کا فیضِ عام ہیں" ان کے ہاتھوں پامال ہوجاتا اور آنے والی نسلیں ان کے نقشِ قدم پر چل کر اپنے حریفوں پر "پانی" بند کرکے ان سے من مانی کرا سکتیں۔

یہ صحیح ہے کہ مدینہ میں حضرت عثمان پر جب نرغہ ہوا تو انقلاب پسندوں نے ان پر بھی آب و غذا کی بندش کی تھی مگر حضرت علیؑ نے ان کی اس حرکت کو بالکل پسند نہیں کیا بلکہ حسنؑ و حسینؑ کو جنھیں وہ ہمیشہ تلوار کی آنچ سے بچاتے تھے اور کبھی تیر و نیزے کے قریب نہ جانے دیتے تھے مشکیں دے کر حضرت عثمان کے گھر بھیجا اور پانی پہنچانے کی کوشش میں یہ حضرات زخمی بھی ہوئے۔ ساری دنیا جانتی ہے۔ کہ حضرت علی حسنینؑ کو اپنی نہیں بلکہ رسول مقبولؐ کی اولاد سمجھتے تھے۔ اور اسی لئے ہر جنگ میں ان کی حفاظت اپنا فرض سمجھتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ یہ نہ رہیں گے تو نبیؐ کی نسل ختم ہوجائے گی۔ مجھے تو اللہ نے اور بھی اولاد دی ہے تو ایسی محترم ہستیوں کو حضرت علیؑ نے پانی دے کر حضرت عثمان کے گھر بھیجا کہ پانی کے بغیر کوئی جاندار زندہ نہیں رہ سکتا۔ اور یہ انسان کا بنیادی حق ہے اور اس سے اس کو محروم رکھنے کی کوشش کرنا بے حد معیوب ہے۔ مگر اس کے باوجود نبی امیہ نے صفین میں پانی بند کرنے کی مذموم حرکت کی اور حضرت علیؑ نے گھاٹ پر قبضہ کرکے پھر ایک مرتبہ اپنے عمل سے یہ ثابت کردیا کہ پانی کسی فردِ واحد کی ملکیت نہیں ہوسکتا

یہ سب اتباعِ رسولؐ کا فیض تھا۔ اُنہی کی تعلیم نے ان لوگوں کو اتنا فراخ دل اور سیر چشم بنا دیا تھا۔ کتبِ مقاتل میں لکھا ہے کہ جب امام حسینؑ علیہ السلام کا قافلہ منزلِ شراف سے آگے بڑھنے لگا تو کسی نے تکبیر کا نعرہ بلند کیا۔ حضرتؑ نے کہا۔ "اللہ تو بے شک بڑا ہے مگر تکبیر کہنے کا یہ کیا محل ہے؟" اس نے جواب دیا۔ مجھے دور سے خرمے کے درخت نظر آرہے ہیں۔ حضرت نے ارشاد فرمایا۔ "اس قطعۂ زمین پر خرمے کے درخت کہاں سے آئے؟ غور سے دیکھو شاید تمہاری نگاہیں دھوکا کھا رہی ہیں۔" غور سے دیکھا گیا تو پتہ چلا کہ بلند نیزوں

اور گھوڑے کے کانوں کی کثرت سے نگاہ کے سامنے نخلستان کا منظر قائم کر دیا تھا۔ بہر ذ گرد چاک ہوا تو سواروں کا دستہ نظر آنے لگا۔ یہ حُر کا رسالہ تھا جو کوفہ سے امام حسینؑ علیہ السلام کے سراغ میں بھیجا گیا تھا۔ حضرت نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا، قریب میں کوئی ایسی پہاڑی ہے جس کو پس پشت رکھ کر اہل حرم کو محفوظ کیا جا سکے۔ جواب ملا۔ وہ سامنے "ذو حسم" کی پہاڑیاں نظر آ رہی ہیں۔ حضرت نے اہل حرم کو "ذو حسم" کے قریب بھیج دیا۔ اور خود صف آرا ہو گئے۔ اتنے میں حُر کا رسالہ قریب آگیا۔ دیکھتے کیا ہیں کہ سب پیاس سے جاں بلب ہیں۔ شدت کی گرمی اور دور کی مسافت نے آدمی اور جانور دونوں کو ہلکان اور پریشان کر دیا ہے۔ حضرت امام حسینؑ علیہ السلام نے ابھی پچھلی منزل پر بچوں کے لئے پانی کا ذخیرہ اس لیے کیا تھا کہ آئندہ منزل پر پانی ملنے کی امید نہ تھی لیکن واہ رے خلقِ حسینی اور اللہ رے ایثارِ شبیری جب دشمن کے رسالے پر پیاس کی شدت دیکھی تو حضرت عباسؑ کو حکم دیا "پہلے ان تھکے ماندے سپاہیوں کو پانی پلاؤ۔ ساقی کوثر کے فرزند کے قریب آکر کوئی پیاسا نہ رہ جائے۔ بھری ہوئی مشکیں اور چھاگلیں خالی ہونے لگیں اور ہر سپاہی سیراب ہو کر دعائیں دینے لگا۔ انسان پی چکے تو حکم ہوا اب گھوڑوں اور اونٹوں کو بھی پانی سے محروم نہ رکھا جائے۔

جب سب پانی پی چکے تو مولا نے حُر سے آمد کا سبب پوچھا اس نے نیچی نگاہوں سے جواب دیا۔ "ابن زیاد کا حکم ہے کہ آپ کو اپنی نگرانی میں کوفہ تک لے کر آؤں" پانی پلانے اور گفت و شنید میں ظہر کا وقت آگیا۔ حضرت نے نماز کی تیاری کی اور جب جماعت کے لئے کھڑے ہونے لگے تو حُر سے پوچھا۔ تم اپنی نماز الگ پڑھو گے یا ہمارے ساتھ جماعت میں شامل ہو گے۔ اس نے عرض کی "مولا! زہے نصیب کہ آپ کے ساتھ شریک جماعت ہونے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔ ہم سب اسی جماعت میں شامل ہوں گے"

نماز ہو چکی تو حضرت نے خطوط کے وہ پلندے منگائے جو کوفہ والوں نے طلبی کے لئے بھیجے تھے مگر حُر نے کہا "ہم دعوت دینے والے گروہ میں سے نہیں ہیں، ہم تو حکومت کے نوکر ہیں۔ حکومت کی طرف سے ہم کو یہ حکم ملا ہے کہ آپ کو جہاں پائیں حراست میں لے

کر حاکم کوفہ تک پہنچا دیں۔ اب اس وقت سے آپ اپنے آپ کو سرکاری نگرانی میں سمجھئے" امام حسین علیہ السلام نے فرمایا "یہ نہیں ہو سکتا ہم نقل و حرکت میں آزاد ہیں، کوفہ والوں کے بلانے سے آئے تھے اب اگر تم لوگ ہماری رفاقت سے پھر گئے ہو تو ہم مدینہ واپس چلے جائیں گے۔ مکہ میں جا کر رہیں گے یا کسی دوسری طرف جائیں گے۔ حکومت کے فرستادوں کی حراست میں آنا گوارا نہ کریں گے"

واقعات کو شرح و بسط کے ساتھ بیان کرنا مقصود نہیں کتب مقاتل میں تفصیل موجود ہے۔ اور آپ روزانہ ذاکروں سے سنتے رہتے ہیں۔ مجھے تو یہ بتانا ہے کہ امام حسین علیہ السلام نے انسان کی بنیادی ضرورت کا پاس و لحاظ رکھا اور پانی جیسی چیز سے دشمن کو محروم نہ رکھا۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ حُر اور اس کا رسالہ حضرت کے اخلاق سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ اتباع رسولؐ کا اثر تھا کہ آل محمدؐ پانی کی بندش گوارا نہ کرتے تھے اور وہ جاہلیت کے تظریات تھے جو بنی امیہ کو "آب و غذا" کی مار دے کر حریف کو زیر کرنے کی دعوت دیتے تھے۔ ساتویں محرم کو عبید اللہ ابن زیاد نے عمر ابن سعد کے نام حکمنامہ بھیجا کہ ایسا انتظام کرو کہ حسینؑ ابن علی اور ان کا خاندان دریا سے دور خیمہ انداز ہو۔ اور ان پر پانی بالکل بند کر دو کہ مدینہ میں حضرت عثمان کے ساتھ بھی اسی طرح سلوک کیا گیا تھا"

ہاں یہ صحیح ہے کہ حضرت عثمان پر محاصرہ کرنے والوں نے پانی بند کر دیا تھا مگر کون تھا جو ابن زیاد کو بتاتا کہ یہ علیؑ اور ان کی اولاد ہی تھی جس نے پیاسے خلیفہ تک پانی پہنچایا تھا۔ یہ حسینؑ ہی تھے جو اپنے بھائی کے ساتھ مشکیں لے کر گئے تھے اور محاصرہ کرنے والوں کی صفوں میں سے گزر کر اندر پہنچے تھے۔ اور تاریخ تو یہاں تک بتاتی ہے کہ اس کوشش میں ان کو زخمی ہونا پڑا تھا۔

کیا عبید اللہ ابن زیاد اس بات کو نہ جانتا تھا؟ کیا کوفہ میں کوئی ایسا بھی نہ تھا جو اس کو بتاتا کہ اولادِ علیؑ نے دو مرتبہ بنی امیہ کو پانی کی بندش سے بچایا ہے۔ ایک مرتبہ مدینہ اور دوسری مرتبہ صفین کے موقع پر۔ اگر ان دونوں موقعوں پر اولاد علی خلق محمدیؐ کا

مظاہرہ نہ کرتی تو مسلمانوں کی تاریخ دوسری طرح لکھی جاتی۔ اور برسوں پہلے کی باتیں جانے دو۔ کل ہی کی بات ہے جب حُر کا رسالہ پیاسا تھا تو فرزندِ نبیؐ نے اپنے بچوں کے لئے جو پانی کا ذخیرہ کیا تھا وہ سب کا سب دشمنوں کو پلا دیا۔ آج محرم کی ساتویں تاریخ بنی اُمیہ کے کارندے کوفہ کے سپاہی انسان کو اس کے بنیادی حق سے محروم کر رہے ہیں۔ نہر فرات پر سات سو ہتھیار بند فوجی اس غرض سے متعین کیے جا رہے ہیں کہ آلِ محمدؐ کے خیموں تک پانی نہ جا سکے۔

امام حسینؑ کے خیموں کی طرف نگاہ ڈالو۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہاتھوں میں خالی کوزے لئے کھڑے ہیں اور العطش العطش کا شور برپا ہے۔ نبی زادے کی چھوٹی بیٹی ان بچوں کے ساتھ ہے اور کبھی چچا عباسؑ سے کہہ رہی ہے کہ پانی کا کچھ بندوبست فرمائیے اور کبھی بھائی علی اکبرؑ کو پکارتی ہے کہ ان ننھے ننھے بچوں کی خبر لیجئے۔ یہ کب تک پیاسے رہیں گے۔ ساتویں تاریخ گزر کر جب آٹھویں کی رات آئی تو پیاس کی شدت بڑھ چکی تھی حضرت عباسؑ چند آدمیوں کو لے کر نہر پر پہنچے ان کے ساتھ نافع بن ہلال بجلی بھی تھے اور عمرو بن حجاج سے ان کی رشتہ داری تھی۔ عمرو بن حجاج اس فوجی دستہ کا افسر تھا جو دریا کے گھاٹ کو روکے ہوئے تھا۔ رات کی تاریکیوں میں جب عمرو بن حجاج نے چند آدمیوں کو دریا کی طرف بڑھتے دیکھا۔ تو پکار کر کہا "کون آ رہا ہے اور کیا کام ہے؟" نافع نے کہا "میں ہوں، پیاس نے بے چین کر دیا تھا۔ پانی کی تلاش میں آیا ہوں" اس نے اپنے عزیز کی آواز پہچان کر کہا۔ آؤ شوق سے پانی پیو مگر دیکھنا اس کا کوئی قطرہ حسین بن علیؑ کے خیموں میں نہ جانے پائے۔"

نافع بن ہلال نے کہا "اے حجاج والے ہو۔ ہم لوگ پانی پئیں اور محمدؐ کی اولاد پیاسی مرے۔ کیا اس سے زیادہ کوئی ناانصافی ہو سکتی ہے۔"

کتب مقاتل میں یہ بھی لکھا ہے کہ ایک مرتبہ بریر ہمدانی پانی لینے گئے اور مشکیں لے کر خیمہ تک پہنچ بھی گئے مگر یہ سب کوششیں بچوں کی تشنہ کامی کا علاج نہ بن سکیں اور عاشور کے دن حسینؑ کا گھر کا گھر تین شب و روز کا پیاسا تھا۔ گرمی کا زمانہ، عراق عرب

کی جھلس دینے والی گرمی، آفتاب کی تمازت کے ساتھ ساتھ زمین سے نکلنے والے شعلے کلیجوں کو کباب کئے دیتے تھے۔ سامنے نہر فرات موجیں مارتی نظر آتی تھی مگر پانی تک رسائی کا کوئی امکان نہ تھا۔ جب پیاس کی شدت سے بچے بے ہوش ہو ہو کر گرنے لگے اور دسویں کا آفتاب بلند ہوتے ہوتے نصف النہار پر پہنچ گیا تو حضرت سکینہؑ نے اپنی سوکھی مشک چچا عباسؑ کو لا کر دی اور کہا۔ چچا جان! اب پیاس کی تاب نہیں ہے جس طرح ہو سکے تھوڑا سا پانی لے کر آئیے۔ دیکھئے وہ ننھا سا علی اصغرؑ جھولے میں نڈھال ہے دو دوسرے بچے پیاس کے مارے بیجان سے پڑے ہیں۔ پیاری بھتیجی کے ہاتھ سے مشک لے کر عباس علمدار امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں آئے اور سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔ امام حسین علیہ السلام نے پوچھا "بھیّا کچھ کام ہے؟" فرمانے لگے میں نے کئی مرتبہ میدان کی طرف جانے کی اجازت مانگی مگر آپ نے یہی فرمایا، تم میری فوج کے علمدار ہو۔ مرنے کی جلدی نہ کرو۔ بے نشان کی فوج اور بے علم کا لشکر بھی کہیں لڑتا ہے۔ یہ چھوٹی سی فوج آہستہ آہستہ گھٹتی جا رہی ہے۔ من چلے سورما ایک ایک کر کے دادِ شجاعت دے رہے ہیں اور پھر موت کی آغوش میں سوتے جا رہے ہیں۔ چند ساعت انتظار کرو۔ آخر مرنا تو سب کو ہے ہی۔ مگر ابھی سے اپنے بھائی کی کمر نہ توڑو۔ اور اس کی فوج کو بے نشان نہ کرو۔ کیا مجال جو آپ کے حکم سے سرتابی کروں۔ میں اب تک چپ تھا۔ اور اپنی آنکھوں سے بہادروں کو قتل ہوتے دیکھ رہا تھا۔ مگر یہ دیکھئے۔ یہ سوکھی ہوئی مشک ہے جو میری سکینہ نے مجھ کو لا کر دی ہے۔ اور فرمائش کی ہے۔ کہ نہر پر جا کر پانی لا دیجئے۔

مولا! میں لڑتے نہیں جاتا مجھے پانی لانے کی اجازت دیجئے۔ ورنہ خوف ہے کہ ادھر میدان میں بڑے لڑ بھڑ کر جان دیں گے اور ادھر خیمہ میں پیاس کے مارے بچوں کا دم نکل جائیگا

امام حسین علیہ السلام نے فرمایا۔ بھیّا ہم کو معلوم ہے پانی کی طلب میں تمہارا مشن کامیاب نہ ہو گا۔ اور سکینہؑ کے ساتھ ساتھ دوسرے بچوں کی پیاس بجھ نہ سکے گی مگر تقدیر سے کون لڑ سکتا ہے۔ جاؤ اور پانی لانے کی کوشش کرو۔ مگر دیکھنا باپ کے جلال کو کام میں نہ لانا اور پانی کی خاطر فوجوں سے نہ لڑ بیٹھنا کہ آج غیظ و غضب کے اظہار کا نہیں بلکہ ہمارے

صبر و تحمل کے مظاہرے کا دن ہے۔

ذرا غور سے دیکھیئے۔ حضرت عباسؑ گھوڑے پر سوار ہیں۔ پاؤں نیچے تک لٹک رہے ہیں۔ ایک ہاتھ میں وہ علم ہے جو کبھی بدر و حنین میں بلند ہوا تھا۔ کبھی خیبر و خندق میں نمودار ہوا تھا۔ یہ معمولی علم نہیں ہے۔ یہ انسانی آزادی کا پرچم ہے۔ یہ اقدارِ اخلاقی کا نشان ہے۔ یہ وہ تاریخی جھنڈا ہے جو جعفر طیار کے ہاتھوں میں رہا۔ جس کا پھریرا علی مرتضیٰؑ کے کاندھے پر لہرایا۔

ہاں ہاں بہادر اور شجاع، غیور اور دلیر یہ علم اٹھاتے رہے ہیں۔ یہ کسی میدان سے ناکام واپس نہیں ہوا کسی مہم سے شکست کھا کر نہیں پلٹا۔ ذرا ہاشمی سردار علوی بہادر کی شان دیکھنا تیور بتا رہے ہیں کہ علیؑ کا فرزند ہے شکل و شمائل سے عیاں ہے کہ فاتح خیبر کا لال ہے ؎

وہ معرکے تا حشر نہ بھولے گا زمانہ
خیبر کی طرف حیدرِ کرارؑ کا جانا
مشکیزہ لیے نہر پہ عباسؑ کا آنا
وہ باپ کا قصہ تھا یہ بیٹے کا فسانہ

عباسؑ کا رُخ نہر کی طرف ہے۔ علم کا پھریرا ہوا میں فراٹے بھر رہا ہے۔ کاندھے پر بھتیجی کا مشکیزہ ہے۔ فوجوں میں ہل چل مچ گئی۔ رسالے حرکت میں آئے۔ عمرو بن حجاج کی کمک کے لئے محفوظ دستے آگے بڑھے۔

علی کا فرزند تنہا ہے۔ کاندھے پر مشکیزہ بتا رہا ہے۔ کہ لڑائی کا ارادہ نہیں صرف پانی کی طلب ہے۔ مگر اللہ رے رعب و داب کہ سارا لشکر اپنے آپ کو خطرہ میں محسوس کر رہا ہے اور میمنہ و میسرہ کے ساتھ ساتھ قلب و عقب میں بھی جنگ کی تیاریاں شروع ہو گئی ہیں۔

لیجئے وہ عباسؑ آگے بڑھ کر دریا کے کنارے پہنچ گئے۔ اور عمر بن حجاج سے کہا۔ تم سب کو خبر ہے کہ تمہارے نبی کی آل تین شب و روز سے پیاسی ہے۔ ہم خود سے ادھر نہیں آئے تھے۔ تم کوفہ والوں نے ہم کو خط لکھ کر دعوت دی تھی تم عرب ہو، عربوں کی مہمان نوازی سارے عالم میں مشہور ہے۔ کیا نبیؐ کی آل کی اس طرح مہمان نوازی کر رہے ہو کہ کھانا تو الگ رہا پانی تک میسر نہیں۔ تم بھی صاحبِ اولاد ہو۔ دل پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ اگر تمہارے

چھوٹے چھوٹے بچے اس طرح پیاسے ہوتے تو تم پر کیا گزرتی۔ میدان جنگ میں سپاہی اور لشکری اپنے اپنے جوہر دکھاتے ہیں بچوں اور عورتوں کو کون ستایا کرتا ہے۔ کیا تم عربوں کے سارے چلن بھول گئے۔ اور بہادروں کے سارے طریقے فراموش کر بیٹھے۔ دیکھو تم سب شکم سیر اور سیراب ہو۔ اور نبیؐ کی آل تین دن سے بھوکی پیاسی ہے۔ میں لڑنے نہیں آیا۔ میرے پاس لڑائی کا سامان نہیں ہے۔ میرے آقا نے مجھے پانی کے لئے بھیجا ہے۔ سپاہی تو لڑ بھڑ کر جان دے ہی رہے ہیں جو باقی ہیں وہ بھی جلد یا بدیر میدان میں آکر جان دیں گے۔ مگر بچوں اور عورتوں کو تو بہر حال زندہ رہنا ہے۔ شاید تمہاری حمیتِ عربی بھی یہ گوارا نہ کرے کہ ان کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا جائے پھر ان پر پانی کیوں بند ہے۔ یہ مشکیزہ جو تم میرے کندھے پر دیکھتے ہو میری بھتیجی سکینہؑ نے مجھ کو دیا ہے منزل شراف پر میں نے اس مشکیزہ کا دہانہ کھول کر حُر کے رسالہ کو پانی پلایا تھا۔ حُر کا رسالہ کدھر ہے۔ ان میں کوئی ہے جو مشکیزہ کو بھر دے۔ تاکہ میں پیاسی سکینہؑ کے پاس لے جاؤں اور بتاؤں کہ یہ حُر کے رسالے کے ممنون و متشکر سپاہیوں کا تحفہ ہے جو وہ اپنی ننھی محسنہ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

پتھر بھی ہوتا تو اس تقریر سے پانی پانی ہو جاتا۔ مگر ظالم کوفیوں کے دل نہ پسیجے اور کسی نے عباسؑ کو مشک بھر لینے کی اجازت نہ دی۔ لیکن بہادر عباسؑ بات کا دھنی اور ارادہ کا پکا تھا۔ اس نے دریا میں گھوڑا ڈال ہی دیا۔ اور محافظ دستوں کو اسی طرح للکارا کہ کسی کو پاس آنے کی ہمت نہ ہوئی۔ ہاں دور ہی سے تیر چلاتے رہے۔

حضرت عباسؑ تین روز سے خود بھی پیاسے تھے اور گھوڑے کو بھی پانی نہ ملا تھا۔ رحمدل مالک نے گھوڑے کی عنان ڈھیلی کر دی اور اشارہ کیا کہ کئی پہر سے پانی کا منہ نہیں دیکھا اب سیر ہو کر پی لو۔ عرب کے گھوڑے اپنی برق رفتاری اور وفاداری کے لئے مشہور ہیں۔ وہ جس گھر میں رہتے ہیں اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ حضرت عباسؑ کے راہوار نے بھی پانی کو منہ نہ لگایا۔ بلکہ مڑ کر خیمہ کی طرف دیکھنے لگا۔ شاید یہ اشارہ تھا کہ خیمہ میں تو سب پیاسے ہیں میں پانی پی کر کیا کروں گا۔

اللہ اللہ آلِ محمد کی مظلومی اس حد تک پہنچ گئی کہ حیوان بھی ان پر رحم کھانے

لگے تھے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ جب دریا کی سرد ہوا عباسؑ علمدار کے اس جسم سے مس ہوئی جو زرہ کی کڑیوں سے جلا بھنا جا رہا تھا۔ تو جانباز بہادر نے انگڑائی لی، جھک کر پانی میں ہاتھ ڈالا۔ چلو بھرا، منہ تک لائے مگر سکینہؑ کی پیاس کا خیال آتے ہی چلو سے پانی گرا دیا۔ اور جلدی سے مشکیزہ بھر کر دہانہ باندھ لیا۔

آیئے عباس علمدار کی دریا سے واپسی کا منظر دیکھئے۔ ایک ہاتھ میں لشکرِ اسلام کا علم ہے جس کا پھریرا ہوا میں فراٹے بھر رہا ہے کاندھے پر مشک لٹکی ہوئی ہے۔ دریا کا کنارہ پیچھے ہے اور خیام اہلبیتؑ نگاہ کے سامنے ہیں، سامنے سے نظر آ رہا ہے کہ خیمے کے دروازے پر بچوں کی بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ جو جناب سکینہؑ کی قیادت میں ہاتھ میں خالی کوزے لئے کھڑے ہیں۔ بھولے بھولے چہرے تیز دھوپ میں چمک رہے ہیں اور ان کی منتظر نگاہیں آنے والے بہادر کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ تو بھاگی ہوئی فوج پھر سے اور حسینی لشکر کے علمدار کو گھیر کر مارنے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اب بیچ میں فوجیں حائل ہیں۔ اور بچے صرف ہوا میں بلند پھریرے کو دیکھ سکتے ہیں۔ علمدار کی شکل ان کو نظر نہیں آتی۔ سکینہؑ زور سے چلائیں "میرے چچا کو ظالموں نے گھیر لیا" اور ان کے ساتھ سارے بچے شور مچانے لگے۔

عباسؑ علمدار گھوڑے کو ایڑ لگاتے، مشکیزہ کو تیراندازوں کے نشانے سے بچاتے حسینیؑ پرچم کی حفاظت کرتے آگے بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ خیموں کے قریب کسی ٹیلہ پر امام حسین علیہ السلام کھڑے بھائی کی شجاعانہ بازگشت کا نظارہ کر رہے ہیں۔

عباسؑ کی بہادری میں کسی کو شک ہو سکتا ہے۔ بھائی کی طرف سے لڑنے کی اجازت ہوتی تو سارے ہتھیار سج کر جاتے۔ ان کو تو بس پانی لانے کا حکم ہے۔ جیسے جیسے ظالم آگے بڑھ کر حملہ آور ہوتے ہیں ان کا خون کھول کر رہ جاتا ہے آزاد ہوتے اور اجازتِ جہاد لے کر آتے تو کوفیوں کو ان حرکتوں کا مزا چکھاتے مگر مجبور ہیں۔ امام کی طرف سے صرف یہ اجازت ہے کہ دریا پر جا کر پانی لے آؤ۔ اور مشکیزہ کی حفاظت کرتے ہوئے خیمے تک پہنچو۔ کیا مجال جو اس حکم سے سرتابی کر سکیں اور بیک وقت امام اور سپہ سالار حسینؑ

کی قائدانہ ہدایتوں سے الگ ہٹ کر کوئی اقدام کریں۔ تو اب حسینؑ کو بھی عباسؑ کا چہرہ نظر نہیں آتا۔ صرف ہوا میں لہرانے والا پرچم دکھائی دے رہا ہے۔ کوفی فوجوں کا نرغہ بڑھتا گیا۔ حلقہ تنگ ہوتا گیا۔ عباسؑ علمدار اب بھی گھوڑے پر، مشکیزہ اسی طرح کاندھے پر لٹکا ہوا۔ یکایک کسی نے ایک ہاتھ پر تلوار لگائی۔ قریب تھا کہ اسلام کا علم سرنگوں ہو جائے مگر آپ نے دوسرے ہاتھ سے سنبھالا۔ کسی نے پیچھے سے دوسرے ہاتھ پر ضرب لگائی۔ دونوں ہاتھ کٹ چکے تو علم سرنگوں ہونے لگا۔ بہادر سپاہی نے علم کو سینے سے روکا۔ مشک کا تسمہ دانتوں سے پکڑا مگر کسی ظالم کے تیر نے مشک میں سوراخ کر دیا۔ اور عباسؑ علمدار کے خون کی طرح مشک کا پانی بھی کربلا کی زمین کو تر کرنے لگا۔ اب مایوسی کا عالم تھا۔ فوج قریب آ چکی تھی پھر بھی حسینی فوج کے جانباز علمدار نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور اس امر کی آخری کوشش کی کہ کسی طرح چھدی ہوئی مشک خیمہ تک پہنچانے میں کامیابی حاصل ہو جائے۔ مگر اتنے میں کسی نے سر پر گرز مارا اور علم کے ساتھ عباسؑ بھی زمین سے زمین پر گرے اور گرتے گرتے حسینؑ کو آواز دی "وا سیداہ ادرکنی"

بھائی کی دردناک آواز سن کر امام حسین علیہ السلام کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا آ گیا۔ جواں مرگ کی آواز نے دل پر تیر و تبر کا سا اثر کیا۔ کمر میں ایک جھٹکا سا محسوس ہوا اور بے ساختہ منہ سے نکلا۔ "الآن انکسر ظہری وقلت حیلتی"

بھائی تمہارے قتل نے میری کمر توڑ دی، اور جنگ جاری رکھنے کی راہیں کم ہو گئیں۔

امام حسین علیہ السلام کا صبح سے اب تک یہ معمول تھا کہ جس شہید کی طرف سے "ادرکنی" کی آواز آتی۔ اس کی لاش پر پہنچتے اور عزت و احترام کے ساتھ اس کو میدان سے اٹھا لاتے۔ مرنے والا عزیز و قریب ہی سے ہوتا تو اس کی لاش خیمے میں پہنچا دیتے کہ عورتیں آخری مرتبہ رخصت ہو لیں۔ یاور و انصار میں سے ہوتا تو خیموں کے باہر مردہ مل جل اس کی بے کسی پر چند آنسو بہاتے۔ اور بقیہ شہیدوں کی لاشوں کے پاس لا کر لٹا دیتے

حضرت امام حسین علیہ السلام کو اپنے جان نثار بھائی عباسؑ سے بڑی محبت تھی۔ اور ان کی فداکاری اور جانبازی سے امام عالی مقام ہمیشہ متاثر رہتے تھے۔ اور روزِ عاشور تو اس جوشیلے

سپاہی نے اپنے سپہ سالار کو اپنی کارگزاریوں سے ایسا ممنون و مرہون بنایا تھا کہ ان کے دل میں ان کی ذات اور محبت پہلے سے بھی زیادہ ہو گئی تھی۔

امام حسین علیہ السلام امام تھے، نائب رسولؐ تھے، خلیفۃ اللہ تھے مگر اس کے ساتھ ساتھ انسان بھی تھے پہلو میں ایک دھڑکتا ہوا دل تھا۔ دل میں جذبات پیدا ہوتے تھے، چوٹ کھائے ہوئے اور مصیبت اٹھائے ہوئے دلوں کا حال وہی خوب جان سکتے ہیں جن کو کبھی ایسے حادثوں سے دوچار ہونے کا موقع ملا ہو۔

صبح سے بازارِ جنگ گرم تھا۔ امام حسین علیہ السلام کے ساتھی ایک ایک کر کے ختم ہو رہے تھے۔ بہادر جرنیل اپنے فوجیوں کی کمی سے متاثر ہوتا چلا آ رہا تھا۔ مگر ابھی تک فوج کا نشان سربلند تھا۔ علمدار زندہ تھا۔ جرنیل جب ہوا میں اپنے پرچم کو لہراتا ہوا دیکھتا تو مایوسیوں کی اس کالی گھٹا میں اُمید کی ایک کرن اور اطمینان و امتنان کی ایک جھلک نظر آ جاتی تھی۔ اور اب علم زمین پر پڑا تھا۔ اور علمدار خاک و خون میں ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔

لو وہ حسینی فوج کا سپہ سالار اپنے علمدار کے سرہانے کھڑا ہے۔ علمدار اپنے افسر کو سلامی دینے کے لئے کھڑا ہونا چاہتا ہے۔ مگر ہاتھ پاؤں کام نہیں دیتے۔ سر و گردن پر گرز کی ضرب کا اثر ہے۔ اس میں بھی حرکت کی سکت نہیں۔ ہاتھ تن سے جدا ہو چکے ہیں۔ آنکھوں میں سر سے ٹپکا ہوا خون بھر چکا ہے۔ جرنیل خود جھکا اور مرنے والے سپاہی نے آہستہ سے کہا "میرے آقا! میرے مولا! آنکھوں میں خون بھرا ہے، اگر یہ ہٹ سکتا ہے تو دنیا سے گزرنے والا غلام آپ کے چہرہ پر آخری نگاہ ڈالنے کی سعادت حاصل کر لیتا۔"

امامؑ عالی مقام کا دل بھر آیا، بھائی کی آخری خواہش پوری کرنے کے لئے زمین پر بیٹھ گئے۔ جب آنکھوں سے خون صاف کر چکے اور عباسؑ سے آنکھیں چار ہوئیں تو فرمایا:

"ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ ہم مریں گے تو تم ہمارے آخری مراسم ادا کرو گے
بھیا اتنی جلدی ہمارا ساتھ چھوڑ چلے، اور اس وقت ہم سے منہ موڑ رہے

ہو جب ہم نرغۂ اعدا میں گھرے ہوئے ہیں۔ یار و انصار کی ضرورت تو بڑھتی جا رہی ہے۔ اور یار و انصار ہیں کہ ایک ایک کر کے ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ بھیا اگر نظر کام دے سکے تو دیکھو خیمہ کے در پر سکینہ کھڑی ہے۔ اس کے ساتھ دوسرے پیاسے بچے بھی ہیں۔ ہاتھوں میں خالی کٹورے ہیں اور نظریں میدان کی طرف، نہر کی طرف اور تمہاری طرف لگی ہوئی ہیں۔ بتاؤ میں سکینہؑ کو کیا جواب دوں گا۔ اور پیاسے بچوں کی کس طرح تسلی کر دوں گا۔"

دونوں ہاتھ کٹ چکے تھے، سر پر گرز کا کاری وار لگ چکا تھا۔ خون اتنا بہہ چکا تھا کہ اب بچنے کی کوئی اُمید باقی نہ رہی تھی نبضیں ڈوب رہی تھیں۔ سانس اکھڑ چکا تھا۔ پیشانی پر موت کا پسینہ آ رہا تھا۔ بولنے کی تاب اور کلام کا یارا نہ تھا۔ امام حسینؑ علیہ السلام نے زانو پر سر رکھ کر محبت سے فرمایا:۔

"کوئی آرزو ہو تو بتاؤ، کوئی پیام ہو تو سناؤ۔ ہر چند کہ تمہارے اور زیادہ جینے کی امید نہیں پھر بھی آخری وصیت پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔"

عباسؑ نے کہا:۔

"سکینہ سے شرمندہ ہوں، مشک تیروں کا نشانہ نہ بن جاتی تو ضرور پانی لے کر جاتا، اب خیمہ کی طرف جاتے ہوئے شرم آئے گی۔ مولا! آپ بھی کمزور ہو چکے ہیں۔ صبح سے اب تک جو مصائب پڑے ہیں انہوں نے آپ کو ناتوان کر دیا۔ آپ سے میری لاش اٹھائی نہ جائے گی۔ اس لئے میری یہی گذارش ہے کہ جب روح تن سے مفارقت کرے تو علم لے کر خیمہ کی طرف واپس ہو جایئے۔ اور میری لاش دریا کے کنارے ہی پڑی رہنے دیجئے۔ میری قبر بھی اسی جگہ بنے تاکہ رہتی دنیا تک لوگ یہ کہیں کہ سکینہؑ کا سقا دریا کی ترائی میں پڑا سوتا ہے۔"

یہ کہا اور آخری ہچکی لی اور حسینؑ "بھائی بھائی" کہتے رہ گئے۔ سچ ہے جوان بھائی کی

لاش کیونکر اٹھاتے، لشکر اسلام کا پرچم ہاتھ میں لیا۔ قوتِ بازو کے کٹے ہوئے ہاتھ رومال میں رکھے، چھدا ہوا مشکیزہ دوش پر سنبھالا اور غم سے نڈھال حسینؑ خیمہ کے دروازے پر پہنچا۔ جہاں بچوں کا ایک بھوکا پیاسا گروہ انتظار میں کھڑا تھا دور سے علَم کا پرچم نظر آیا تو سکینہؑ نے کہا شاید چچا جان واپس آرہے ہیں۔ مگر جب حسینؑ کو آتے دیکھا تو سب مایوس ہو گئے۔ اور سکینہؑ نے آگے بڑھ کر باپ سے پوچھا:۔

"میرے چچا جان کہاں رہ گئے؟"

حسینؑ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ایک آہ سرد بھر کر کہا "وہ دریا کی ترائی میں پڑے سو رہے ہیں بیٹی تمہارے ناز اٹھانے والے چچا کی لاش ہم اٹھا کر نہ لا سکے۔ دیکھ رہی ہو کہ تمہارا باپ اب کمزور و ناتواں ہوتا جا رہا ہے۔ عزیزوں کی موت اور دوستوں کی جدائی نے اس کی قوت سلب کر لی ہے۔ دیکھو روکیوں رہی ہو تمہارے چچا اپنے باپ کے پاس گئے ہیں۔ ہمارے نانا رسولِ خدا کے پاس گئے ہیں۔ جب اس دنیا نے ان کی قدر نہ کی تو کیا کرتے۔ اس گھر کی طرف سدھارے جہاں بالآخر ہم سب کو جانا ہے۔"

حضرت نے علَم خیمہ کے دروازے پر گاڑ دیا۔ خشک مشک اور کٹے ہوئے ہاتھ لے کر خیمہ کے اندر داخل ہوئے۔ حضرت عباسؑ کی زوجہ اور بچوں کو آواز دی۔ زینبؑ و امّ کلثومؑ کو پکارا۔ "آؤ عباسؑ کے تبرکات کی زیارت کر لو۔ بوڑھے بھائی کو اس برابر کے بھائی کا پرسا دے دو جو ساری عمر سینہ سپر رہا اور آج جب چاروں طرف سے نرغۂ اعدا ہے تو جان دے کر حقِ رفاقت ادا کر کے دریا کے کنارے پڑا سو رہا ہے۔"

چوتھی مجلس

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ۝ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى اَشْرَفِ الْاَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ وَاٰلِهِ الطَّيِّبِيْنَ الطَّاهِرِيْنَ ۝ اَمَّا بَعْدُ۔ فَقَدْ قَالَ اللّٰهُ سُبْحَانَهٗ تَعَالٰى فِيْ كِتَابِهِ الْمَجِيْدِ وَفُرْقَانِهِ الْحَمِيْدِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا

(پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ کی طرف لے گئی جس کے ماحول کو ہم نے برکت دی ہے تاکہ اس بندے کو اپنی نشانیوں میں سے چند نشانیاں دکھائے)

ہم جب کوئی عجیب چیز دیکھتے ہیں، قدرت کا کوئی عمدہ نمونہ نظر سے گزرتا ہے کوئی زبردست کارنامہ سامنے آتا ہے تو بے ساختہ "سبحان اللہ" منہ سے نکل جاتا ہے یہ تو ہم ناچیز بندوں کا حال ہے۔ مگر زبانِ قدرت جس کارنامے پر "سبحان اللہ" کہے۔ لبِ فطرت جس امر پر مسکرانے لگے اور کائنات جس واقعہ پر "واہ واہ" کی صدا بلند کرے وہ یقیناً کوئی غیر معمولی واقعہ ہوگا۔

حرمت والی مسجد سے جو مکہ معظمہ میں واقع ہے۔ فلسطین کے ہیکل سلیمانی تک کوئی ایسا لمبا چوڑا فاصلہ نہیں ہے کہ قدرت اپنے کسی بندے کو وہاں تک پہنچا کر اس کا ذکر فخر و مباہات کے ساتھ کرے۔ آج تو ہر انسان مکہ سے بیت المقدس تک چند گھنٹے میں سفر طے کر سکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسجدِ اقصیٰ، یہ دور کی مسجد اتنی مسافت پر تھی کہ قدرت بھی اس کارنامے کو تشدد مد سے بیان کرتی ہے

اور اس سرعت رفتار سے اس فاصلے کو طے کرنے کو معمولی واقعہ نہیں سمجھتی۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "اس ذات کے کیا کہنے جس نے اپنے بندے کو راتوں رات حرمت والی مسجد سے دور کی مسجد تک سیر کرائی۔ اس سیر و سیاحت کا مقصد یہ تھا کہ اس عبدِ خاص اور بندۂ پُر اخلاص کو اپنی چند مخصوص نشانیاں دکھا دے۔"

مثل مشہور ہے۔ "فکر ہر کس بقدرِ ہمت اوست" آپ میرے گھر پر آ کر میرے چھوٹے بچے سے پوچھتے کہ تمہارے والد کہاں گئے ہیں تو وہ کہے گا بہت دور گئے ہیں، حالانکہ میں اسی محلے میں کسی دوست کے گھر گیا ہوا ہوں، مگر چھوٹے بچے کے لئے ایک فرلانگ کی مسافت بھی دور ہے۔ میرے منجھلے لڑکے سے دریافت کیجئے تو وہ میرے شہر سے باہر جانے کو کہے گا کہ بہت دور گئے ہیں لیکن سن رسیدہ لوگ کراچی سے لندن جانے کو شاید "بہت دور" سے تعبیر کریں۔ مسجد اقصیٰ "بہت دور کی مسجد" عربوں کی اصطلاح میں ہیکل سلیمانی کا نام ہو، لیکن عرش و کرسی اور ساری کائنات کا پیدا کرنے والا اللہ جس مسجد کو "دور کی مسجد" کہے اور بندۂ خاص کو وہاں تک لے جانے پر ناز کرے وہ مسجد یقیناً بہت فاصلہ پر ہونی چاہیئے۔ اس سے مراد بیت المعمور ہے۔ جہاں ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام انبیاء کو نماز پڑھائی۔

آج سے چند سال پہلے تک انسانی دماغ معراج کے امکان و عدم امکان پر بحث و مباحثہ کیا کرتے تھے۔ کوئی کہتا تھا کہ سخت اور ٹھوس آسمانوں سے گزر کر جانا کیوں کر ممکن تھا۔ کوئی کہتا تھا کہ زمین سے آسمان تک کا طویل فاصلہ کیونکر طے ہو سکتا ہے۔ اور وہ بھی اتنے تھوڑے عرصہ میں کہ زنجیر ہلتی رہے اور بستر گرم رہے۔

کسی کو اس پر اصرار تھا کہ معراج خواب کی حالت میں ہوئی۔ کوئی کہتا تھا کہ معراج کی روایت ہی سرے سے غلط ہے۔ اب اگر یہ مان لیا جائے کہ معراج کا سارا قصہ خواب و خیال ہے تو اس کی اتنی اہمیت کیسے ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو قرآن میں محلِ فخر میں بیان کیا ہے خواب و خیال میں تو ہم اور آپ آئے دن کیا کیا دیکھا کرتے ہیں۔ اور رات کے مختصر لمحوں میں خدا جانے کہاں سے کہاں نکل جاتے ہیں۔ بھارت کے پرانے رشی اور منی بھنگ

کے نشے میں معلوم نہیں کہاں کہاں کی سیر کر لیتے تھے اور معجون فلک سیر کی مدد سے آج بھی لوگ طرح طرح کے کرشمے دیکھ لیتے ہیں "معراج" سے انکار اور واقعاتِ معراج کو استعجاب کی نظر سے وہ لوگ دیکھتے تھے جنھوں نے آسمان، فلک، عرش و کرسی کی تعبیر یونانی مذاق کے مطابق کی تھی ورنہ عصرِ حاضر کے علمِ ہیئت نے تو وہ بہت سی گتھیاں سلجھا دی ہیں اب نہ ٹھوس اور سخت آسمانوں کا تصور ہے جن کے اندر چاند اور سورج لٹکے ہوئے ہیں نہ آسمانوں کو پیاز کی طرح تہ بہ تہ مانا جاتا ہے۔ کہ ان میں سے گزرنا مشکل بلکہ محال ہو اور کسی دروازے یا کھڑکی ضرورت پڑے۔

سرعتِ رفتار کا مسئلہ بھی اسی طرح حل ہو گیا ہے کہ کسی منزل پر کم سے کم مدت میں پہنچنے کو محال نہیں سمجھا جاتا۔

جب حضرتِ انسان کی دست رس کا یہ عالم ہے کہ اپنے بنائے ہوئے سیاروں اور خدنگوں کو لاکھوں میل تک پہنچا سکتا ہے اور ان سیاروں اور خدنگوں میں جاندار کو بخیر و عافیت لاکھوں میل اڑا کر واپس بلانے کا دعویدار ہے تو خالقِ کائنات اگر کسی کو برق رفتار سواری پر بٹھا کر فضا کی سیر کرائے اور بلندیوں پرے جا کر بخیر و عافیت زمین پر واپس کر دے تو اس پر اعتراض کس طرح روا رکھا جا سکتا ہے۔ اللہ رب العالمین ہے۔ زمین پر رہنے والوں کا بھی ربّ ہے۔ اور دوسرے سیاروں میں جو مخلوق بستی ہے ان کا بھی خالق و پروردگار ہے۔ اور ہمارے رسول رحمت العالمین تھے۔ اس لیے جہانوں کے مالک نے چاہا کہ اپنے رسولؐ کو ان جہانوں اور آسمانوں کا معائنہ کرا دے۔ جن پر اس کی رحمت کا نزول ہوتا رہتا ہے اور جہاں کے بسنے والے زمینی مخلوق کی طرح اس کے دامنِ کرم سے وابستہ ہیں۔ "لنریہ من ایتنا" کا یہی مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی کچھ نشانیاں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دکھانا چاہتا تھا۔

حضور صلعم نے ایک دوسرے موقع پر ارشاد فرمایا ہے۔ "الدنیا سجن المومن وجنۃ الکافر" یہ دنیا مومن کا قید خانہ اور کافر کی جنّت ہے۔ عام طور پر اس کا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس دنیا میں ایمان دار آدمی مصیبتیں اٹھاتا ہے۔ اور کافر مزے کرتا ہے

ایک مفلوک الحال یہودی نے حضرت امام حسن علیہ السلام کے گھوڑے کی لگام پکڑ کر یہ اعتراض کیا تھا کہ میرے پھٹے پرانے کپڑے دیکھیے اور اپنے نفیس لباس پر نظر ڈالیے میری فاقہ مستی پر غور کیجیے۔ اور اپنے دسترخوانِ نعمت کی طرف توجہ فرمایئے۔ پھر بتایئے کہ مومن آپ ہیں یا میں۔ یا اپنے جدامجد کی حدیث کا انکار کیجیے یا مجھے مومن مانئے۔ حضرت امام حسن علیہ السلام نے جو جواب دیا اس کا مفہوم یہی تھا کہ مومن کے لئے آخرت میں جو نعمتیں مہیا ہیں اس کے مقابلے میں اس دنیا کی بڑی بڑی آسائش ہیچ ہے۔ اس لئے یہ جہانِ ناپائیدار اس کے لئے قید خانہ سے بدتر ہے۔ اور آخرت میں کافر کے لئے جو تکلیفیں مقدر ہیں اس کے مقابلے پر اس دنیا کی ہر صعوبت ایک جنت ہے۔

انسانی ارتقا کی کوئی حد نہیں ہے۔ وہ ہر لمحہ و ہر آن ترقی کی طرف جارہا ہے۔ اور جیسے جیسے آگے بڑھتا ہے پچھلی ترقیاں گرد ہو کر رہ جاتی ہیں۔ بچہ پیدا ہوتے ہی ماں کی آغوش کو جنت سمجھتا ہے۔ اور اس سے نکلنا نہیں چاہتا اگر کوئی زبردستی اس کو آغوشِ مادر سے جدا کرنا چاہے تو رو دیتا ہے، مچلتا ہے، بلکتا ہے، اور ہر ممکن کوشش کر کے پھر وہیں واپس ہو جانا چاہتا ہے۔ لیکن جب ذرا بڑا ہوتا ہے۔ اور کچھ شعور آنے لگتا ہے۔ تو آغوشِ مادر سے نکل کر سارے گھر میں اور پھر گھر سے نکل کر محلہ کے گلی کوچہ میں کھیلنا باعث راحت سمجھتا ہے۔ اب اگر ماں اس کو بھینچ بھینچ کر آغوش میں رکھنا چاہے تو وہ نہیں رہنا چاہتا۔ گھنٹوں گلی کوچوں میں گھومتا پھرتا ہے اور کھانے کے وقت بھی مشکل سے واپس آتا ہے۔ معلوم ہوا کہ اب جنت بدل گئی۔ کل تک "ماں کی آغوش" جنت تھی اب اس کی دنیا وسیع ہو گئی۔ اور کل کی جنت آج اس کو قید خانہ معلوم ہوتی ہے۔ اب وہ اور بڑا ہو گا تو محلہ کے گلی کوچوں سے گزر سارا شہر اس کی جولان گاہ بنے گا۔ اور اس کی دلچسپیوں کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جائے گا۔ یہاں تک کہ تحصیل سے ضلع اور ضلع کے بعد صوبہ، پھر سارا ملک اور اس کے بعد ساری دنیا اس کی توجہ کو مرکوز کرے گی۔ ہاں جب روحِ انسانی ارتقاء کی طرف اور بڑھتی ہے تو یہ پورا کرۂ ارض بھی تنگ نظر آتا ہے اور روح مزید وسعتیں چاہتی ہے۔

اسی منزل کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے۔ سبحٰن الذی اسریٰ بعبدہ الخ روحِ محمدی اس تنگنائے دنیا میں گھبرا رہی تھی اور مزید وسعتوں کی متلاشی تھی۔ ہم نے اپنے اس خاص بندے کی خاطر کائنات کی سیر کے سامان مہیا کئے۔ اور راتوں رات اس محدود دنیا سے وسیع عالم کی طرف لے گئے اور اس کے سامنے کائنات و مخلوقات کے مناظر پیش کر کے بتایا کہ ع

"ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں"

مسلمان جو نمازوں میں رب العالمین سے دعائیں مانگتا ہے اور اس کے رحمتِ عام اور رحمان ہونے کا اقرار کرتا ہے دوسرے لفظوں میں دنیا والوں کے سامنے یہ اعلان کرتا ہے کہ ہمارا پروردگار کوئی مقامی، علاقائی، ملکی، قبائلی یا کسی خاص نسل کا پروردگار نہیں ہے وہ صرف کرۂ ارض کا پالنے والا بھی نہیں ہے بلکہ ساری کائنات میں اس کی مخلوق پھیلی ہوئی ہے۔ اور وہ بغیر رو رعایت سب کی پرورش کرتا ہے۔ اس کی رحمت سب پر عام ہے۔ وہ سب کے لئے روزی مہیا کرتا ہے۔ سب کی حفاظت، صیانت اور بقاء کے سامان مہیا کرتا ہے۔

نوعِ انسانی جب تک تنگ نظر رہی اس نے اللہ کو بھی اپنی طرح مقامی، علاقائی اور ملکی معبود سمجھا۔ یونان کا خدا الگ سمجھا جاتا تھا۔ اور ایران کا الگ، گوروں کا معبود الگ تھا اور کالوں کا الگ، مگر اسلام نے بتایا کہ ساری کائنات کا خالق اور پروردگار ایک ہی ہے اور اسی نے ہم سب کو پیدا کیا ہے۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ
وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝

"اے رسولؐ، کہہ دے کہ اللہ یکتا ہے، اللہ بے نیاز ہے، نہ اس نے کسی کو جنا ہے نہ کسی نے اس کو جنا ہے اور اس کا کوئی ہمسر نہیں ہے۔"

سورۂ اخلاص نے جس واضح طریقہ پر توحید کا اعلان کیا ہے۔ اس کی نظیر دنیا کے لٹریچر میں دوسری جگہ نہیں ملتی۔ توحید کے خلاف جتنے عقیدے لوگوں میں

رائج تھے ان سب کا رد اس سورۃ کے اندر موجود ہے۔

رومی، یونانی، مصری اور دنیا کے دوسرے مشرک لوگ سینکڑوں خداؤں کے قائل تھے۔ ہر چشمے، سبزہ زار، پہاڑ، شہر، دریا اور سمندر کا الگ الگ خدا تھا وہ اپنے ماننے والوں کی نذر و نیاز کا محتاج اور مدح و ثنا کا بھوکا رہتا تھا۔ اس کے بیوی بچے بھی تھے اور شریک و ہمسر بھی۔

اس چھوٹی سی سورۃ نے صاف الفاظ میں بتا دیا کہ اللہ یکتا ہے اور واحد معبود ہے وہ بے نیاز ہے نہ تمہاری نمازوں اور دعاؤں کا بھوکا ہے نہ نذر و نیاز کا محتاج، نہ اس نے کسی کو جنا ہے کہ اس کا بیٹا بن سکے، نہ کسی نے اس کو جنا ہے کہ اس کا ماں باپ بن سکے، اس کا کفو و ہمسر نہ کوئی تھا اور نہ ہے۔

کرۂ ارض کے رہنے والے کہہ سکتے تھے کہ اللہ کا نظیر و مثیل دنیا میں نہ ہو مگر اسکا کیا ثبوت ہے کہ ساری کائنات میں نہیں ہے۔ ضرورت تھی کہ کوئی ذات ساری کائنات میں چھان بین کرے اور پھر "شاہد" بن کر ہم کو باور کرائے کہ اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے۔ معراج کا منشا یہی تھا کہ فرش سے لے کر عرش تک کھوج لگایا جائے اور کائنات کے چپے چپے اور کونے کونے کا جائزہ لے کر یہ شہادت دی جائے کہ ساری کائنات میں بادشاہی صرف اللہ کی ہے۔ یہاں جو کچھ بھی ہو رہا ہے۔ اس کی ذات سے ہو رہا ہے وہ واحد اور یکتا معبود ہی ہماری اطاعت کا مستحق اور عبادت کا سزا وار ہے۔

رسول کریمؐ جو دوست دشمن سب کے نزدیک امین تھے۔ صادق القول اور لائق اعتماد تھے۔ برق رفتار سواری پر مشاہدہ کائنات کے لئے گئے اور بلند و بالا جہانوں میں جو کچھ دیکھا اس سے اپنے ایمان و ایقان کو تازہ کیا اور جتنا مناسب سمجھا ہم کو آکر بتایا اللہ کی توحید، اس کے کمال و جلال اور اس کی مخلوق کے حال کا یہ عینی شاہد رہتی دنیا تک منکرِ وجود باری کو یہ چیلنج دیتا رہے گا۔ کہ تمہاری بصارت و بصیرت اور کمالِ علمی کی دن دونی اور رات چوگنی ترقی کے باوجود میرا مشاہدہ تم سے آگے ہی رہے گا۔ میں نے فرش سے عرش تک صعود کر کے تم کو یہ راہ بتا دی کہ انسان افلاک تک بھی

سفر کر سکتا ہے۔ اور برقی سواری استعمال کر کے یہ نشاندہی کی کہ برق کی تسخیر سے انسان معراجِ کمال حاصل کر سکتا ہے۔ تم "الکتاب" کی تعلیم حاصل کئے بغیر "حکمت" سیکھتے ہو، اس لئے تمہارے ہر عمل کا نتیجہ تخریب و فساد ہے۔ بدامنی اور بے چینی ہے میں "الکتاب" کی تعلیم پہلے دیتا تھا اور "حکمت" سے بعد میں روشناس کراتا تھا۔ (یعلمھم الکتاب والحکمۃ) اس لیے میرے مدرسۂ خیال کے تعلیم یافتہ دنیا میں تعمیر و تخلیق، امن و سلامتی نظم و سکون کے قائم کرنے والے بن کر رہے۔ اور جب تک دنیا میری بتائی ہوئی راہ پر چلی خود غرضی اور زر پرستی کی وہ لعنت نوع انسانی کے سر پر سوار نہ ہو سکی جس نے آج اس معمورۂ عالم کو "مسلخ اقوام و ملل" بنا رکھا ہے۔ "الکتاب" یعنی آسمانی صحیفہ ہی امنِ عالم کا ضامن اور عدل و توازن کا قائم کرنے والا بن سکتا ہے فلسفہ اور سائنس کی تعلیم سے پہلے آدمی کو انسان بننے کے گُر سیکھنے کی ضرورت ہے۔ اس کے نفس کا تزکیہ کرنا ضروری ہے (یزکیھم) ورنہ دل و دماغ کے پرانے زنگ اور ماحول و معاشرے کے حریصانہ و خود غرضانہ جذبات اس کو نمرود، فرعون، ہٹلر اور مسولینی بنا کر چھوڑیں گے۔

سائنس کی مدد سے انسان کی قوت میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور اگر اسی قوت کی عنان الہامی تعلیم اور الٰہی ہدایت کے ہاتھ میں نہ ہو تو انجام تباہی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

———— اور حقیقت بھی یہی ہے کہ بیسویں صدی میں اپنے علم و فضل اور تسلط و اقتدار کی بلندیوں پر فائز ہونے کے بعد بھی انسانی فطرت کے اندر وحشت و بربریت کا امتزاج موجود ہے۔ جب وہ پستی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ تو جنگل کے خونخوار درندوں سے نیچے جا گرتا ہے۔ یہ کتابِ خدا اور سیرتِ انبیاء و آئمہ ہی ہے جو اس کو عدل و توازن کی راہ پر قائم رکھتی ہے۔

جن لوگوں نے تاریخ کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ انبیاء و آئمہ علیہم السلام انسانیت کے بہترین نمونے تھے اور اگر ان مقدس ہستیوں کی رہنمائی اور ہدایت ہماری

مشعلِ راہ نہ ہو تو ہم ظلم و ستم کی ظلمتوں میں گم ہو کر رہ جائیں از منۂ وسطیٰ میں جب شخصی حکومتوں کا دور دورہ تھا اور انسان کو انسان پر حاکمانہ تسلط حاصل تھا جب کسی فرعون کے منہ سے نکلی ہوئی بات "قانون" سمجھی جاتی تھی اور کسی قیصر و کسریٰ کا ہر عمل عین انصاف شمار ہوتا تھا، نوعِ انسانی کو جابر و قاہر حاکموں اور سر پھرے فوجی افسروں کی چیرہ دستیوں سے بچانے میں انبیاء و آئمہ کی تعلیم نے بڑی مدد دی۔ اور آج بھی جب ایٹم بم، ہائیڈروجن بم اور مصنوعی سیاروں کی ایجاد نے اقوام و افراد کو فرعون مزاج اور نمرود خصال بنا دیا ہے۔ انہی مقدس حضرات کی سیرت کی تعلیم نوعِ انسانی کو ہلاکت سے بچا سکتی ہے۔ انسانی مزاج کو اعتدال پر رکھنے اور زیر دستوں کے ساتھ شفقت و محبت سے پیش آنے کی مثال اس واقعے سے ملتی ہے۔ جو تھوڑے سے تغیر کے ساتھ امام حسن علیہ السلام، امام حسین علیہ السلام اور امام زین العابدین علیہ السلام کے ساتھ پیش آیا تھا کہتے ہیں کہ ایک دن حضرت کھانا کھا رہے تھے کہ گرم گرم شوربا کسی کنیز کے ہاتھ سے آپ کے جسم پر جا پڑا کنیز خوف کی وجہ سے کانپنے لگی اور امام عالی مقام کی طرف دیکھ کر یہ آیت پڑی۔

والکاظمین الغیظ والعافین عن الناس واللہ یحب المحسنین ○

(اور غصّہ کے پی جانے والے، لوگوں سے درگزر کرنے والے اور اللہ اچھا سلوک کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے)

جب کنیز کے منہ سے پہلا جملہ ادا ہوا۔ تو حضرت نے کہا میں نے غصہ ضبط کر لیا۔ جب اس نے دوسرے جملے کو پڑھا "لوگوں سے درگزر کرنے والے" تو آپ نے فرمایا۔ میں نے تجھ کو معاف کیا، جب اس کے منہ سے تیسرا جملہ نکلا "اللہ اچھا سلوک کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے" تو آپ نے فرمایا۔ "جا میں نے تجھ کو راہِ خدا میں آزاد کیا۔"

اس زمانہ میں جب کنیزوں اور غلاموں کے ساتھ وحشیانہ سلوک روا رکھا جاتا تھا، جب آقا کے حقوق مسلّم تھے اور اس کے ظلم و ستم کی کہیں داد فریاد نہ تھی

انہی آئمہ دین کا اسوۂ حسنہ تھا جس نے مسلمانوں کو رواداری اور حُسنِ سلوک کے سبق سکھائے۔ اور معاشرہ کو انسانی مساوات کا خوگر بنایا۔ امام رضا علیہ السلام کا مشہور واقعہ ہے۔ جب آپ مرو میں مقیم تھے اور عباسی خلیفہ مامون الرشید کے ولی عہد سمجھے جاتے تھے ایک سفیر بلخ سے آکر شاہی مہمان ہوا۔ ایک دن امام عالیمقام نے بھی اس کو کھانے پر بلایا۔ جب دسترخوان بچھا اور کھانے چنے گئے تو بلخی مہمان کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ حضرت کے دسترخوان پر ان کا سائیس، خدمت گار اور حبشی غلام بھی شریکِ طعام ہے انسانی برابری اور مساوات کا یہ نظارہ اس نے کہاں دیکھا تھا۔ چیں بجبیں ہو گیا اور حضرت کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ "ان لوگوں کو تو علیحدہ بٹھایا ہوتا۔" امام عالی مقام نے مسکرا کر فرمایا۔ "سب آدم کی اولاد ہیں اور اعمال کے لحاظ سے صالح ہیں۔"

اخوت و مساوات کا یہی درس تھا جس کا مظاہرہ کربلا کی جنگ میں ہوتا ہے۔ جونؑ رومی حبشی نسل اور رومی علاقہ کے باشندے تھے۔ ابوذر غفاری کی غلامی میں رہ چکے تھے پھر اہل بیت کے گھرانے سے توسّل حاصل کیا تھا۔ جب میدان کربلا میں امام حسین علیہ السلام نرغۂ اعدا میں گھر گئے اور صبح سے لے کر دوپہر تک سارا گھر موت کے گھاٹ اتر گیا تو جونؑ رومی کے بڑھاپے نے بھی جوانوں کی طرح انگڑائی لی اور خمیدہ کمر سیدھا کر کے وہ آقا و مولا کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ عرض کیا۔ آپ پر جو مصائب گزر چکے ہیں ان کے دیکھنے کے لئے بڑے دل گردے کی ضرورت ہے دیکھتے دیکھتے بھرا گھر خالی ہو گیا۔ گود کے کھلائے موت کی آغوش میں جا سوئے۔ جن کے بیاہ کے دن تھے وہ عروسِ مرگ سے ہمکنار ہو گئے۔ ہر چند کہ بوڑھا ہوں خون کی حدت مدت ہوئی ختم ہو چکی ہے مگر نبیؐ کے گھرانے کی تباہی دیکھی نہیں جاتی اجازت دیجئے کہ میں بھی میدانِ جہاد میں جاؤں اور جان دے کر دونوں جہاں کی سعادت حاصل کر دوں۔

امام عالی مقام بوڑھے وفادار کی ہمت و شجاعت سے بہت متاثر ہوئے۔ فرمایا۔ "جونؑ! اسلام کی بہت خدمت کر چکے ہو۔ راہِ خدا میں کافی جہاد کئے ہیں۔ اب تمہارے آرام کا وقت ہے۔ بوڑھے لوگوں سے جہاد ساقط ہے۔"

ـرمی کے دن تھے، دھوپ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ زمینِ کربلا کے ذرّے اڑ اڑ
کو بھونے ڈالتے تھے۔ جونؔ حبشی نے دست بستہ ہو کر عرض کیا۔

مولا! میں سیاہ فام ہوں، حبشی غلام ہوں، آپ نہیں چاہتے کہ میرا خون بنی ہاشم
ن کے ساتھ قصرِ شہادت کی تعمیر میں کام آئے۔"

سادات پر در اور نسلی امتیازوں کو مٹانے والے امامؑ پر یہ بات اثر انداز ہوئی۔
وں نے جونؔ کو جہاد کی اجازت دے دی۔

ن! اے عزادارانِ حسینؑ!! ذرا جونِ رومی کی رخصت کا نظارہ دیکھیے۔ ابوذر غفاری
ھا غلام کمر کو پٹکے سے کسے ہوئے کس آن بان سے جا رہا ہے۔ یہ اسلام کا پرانا سپاہی
ـض روایتوں سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ حضرت ابوذر کے ساتھ رسولِ اکرمؐ کا زمانہ
کھ چکا ہے۔ حضرت علیؑ کے ساتھ جمل، صفین اور نہروان کے معرکے سر کر چکا ہے
اس کی شان نرالی ہے۔ تین روز کی بھوک پیاس نے حوصلوں کو پست کرنے کے
ہمت کو اور بڑھا دیا ہے۔ وہ اس لڑائی کو ایک مقدس فریضہ اور وفاداری کا ایک
ظاہرہ سمجھتا ہے۔ وہ امامؑ کی قدم بوسی سے فارغ ہو کر فوجِ مخالف کی طرف بڑھ
ے جسم پر ہتھیار برائے نام ہیں۔ دل میں شہادت کا ولولہ اور جان نثاری کا جذبہ
جو اس کے ناتواں جسم کو آگے بڑھائے چلا جا رہا ہے۔ آنکھوں کے سامنے
ں آ رہے ہیں جب وہ پہلی مرتبہ خاندانِ نبوت کی خدمت میں آیا تھا۔ امام حسنؑ اور
ین علیہ السلام ابھی چھوٹے چھوٹے تھے۔ سر پر عمامے، تن پر قبائیں اور چہرہ پر
، کیا پیاری پیاری صورتیں تھیں اور بھولی بھالی مورتیں تھیں جو کبھی رسولِ اکرمؐ کی
ں میں کبھی ان کے کاندھے پر نظر آتی تھیں۔ اس کو وہ دن یاد آیا جب دونوں بھائی
ـیں ٹھوکر کھانے لگے تھے اور رسول مقبولؐ نے منبر سے اتر کر گود میں اٹھا لیا تھا
ـس کی نگاہوں کے سامنے وہ منظر آ رہا تھا جب رسولِ خدا سجدے میں تھے
م حسینؑ ان کی پشت پر سوار ہو گئے تھے۔ اور انہوں نے سجدہ کو اس قدر طول
کر ستر مرتبہ "سبحان ربی الاعلیٰ و بحمدہٖ" کہنا پڑا تھا۔ امام حسین علیہ السلام

کا اللہ اور اس کے رسولؐ کے ہاں کتنا وقار تھا۔ علیؑ و فاطمہؑ ان سے کتنی محبت کرتے
تھے۔ عہدِ رسالت کے مسلمان ان کی خاکِ قدم آنکھوں سے لگانا سعادت سمجھتے تھے اور
آج رسولؐ کی آغوش کا پلا، علیؑ کا فرزند، فاطمہؑ کا لاڈلا وہی حسینؑ تھا کہ تیر و تیغ کا نشانہ
بنایا جا رہا تھا۔ بچوں کے لئے پانی طلب کرتا تھا اور کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔ ان ہی
خیالوں میں ڈوبے ہوئے جونؔ اعدا کی صفوں کے سامنے پہنچے اور للکار کر کہا:

"مجھے پہچانتے ہو میں کون ہوں، میں تمہارے نبیؐ کے مخلص صحابی
ابوذر غفاری کا غلام رہ چکا ہوں۔ اور اب عرصہ سے فرزندِ رسولؐ کے
ہمرکاب ہوں۔ میری عمر کا آفتاب یوں بھی ڈھل چکا ہے اور آج نہیں
تو کل یہ جسدِ خاکی روح سے جدا ہونے کو ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ مرنے
سے پہلے تم سب کو کہ مسلمان کہلاتے ہو اور نبیؐ کا کلمہ پڑھتے ہو مخلصانہ
نصیحت کر دوں اور تم مانو یا نہ مانو، میں اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں
دیکھو! امام حسین علیہ السلام بلاشبہ رسول مقبولؐ کے جانشین ہیں
ان کی اطاعت ہر مسلمان پر واجب ہے، رسولؐ نے ان کے فضائل و
مناقب میں بہت کچھ فرمایا اور ساری اسلامی دنیا ان کے مرتبہ سے واقف
ہے۔ تم میں سے جو ان کے حقوق سے واقف نہ ہو وہ مجھ سے سن لے اور جو
واقف ہے وہ جان بوجھ کر سیّد کے خون میں ہاتھ نہ رنگے۔ یہ دنیا چند
روزہ ہے۔ اس کے حصول کے لئے آخرت کو ہاتھ سے نہ دینا چاہیئے۔"

جونؔ رومی یہ کہہ ہی رہے تھے کہ فوجِ مخالف میں سے کسی نے ان پر حملہ کر دیا۔
بہادر سپاہی بڑے دم خم سے لڑا مگر تین روز کا بھوکا پیاسا بوڑھا کب تک دادِ شجاعت
دیتا۔ آخر وہ وقت آ ہی گیا جب کسی کے بھرپور وار نے امامِ مظلوم کے اس مخلص جان
نثار کو موت سے قریب کر دیا۔ بوڑھے نے امام کو پکارا۔

"اے میرے سیّد و سردار! جس سعادت کی تمنا تھی، جس عزت پہ جان
دیتا تھا۔ وہ حاصل ہو رہی ہے۔ آیئے آخری دیدار دکھا دیجئے۔"

صبح سے کراب تک امام حسین علیہ السلام کا یہ معمول تھا کہ یاور و انصار کی آخری آواز سن سن کر ان کی طرف بڑھتے تھے اور جس طرح بن پڑتا تھا ان کی لاشیں اٹھا کر لاتے تھے۔ جونؑ کی آواز سنی تو کسی نہ کسی طرح لاش کے قریب پہنچے۔ دیکھا بوڑھا سپاہی خاک و خون میں لوٹ رہا ہے۔ پیشانی پر موت کا پسینہ آ چکا ہے۔ آنکھیں بند ہوتی جا رہی ہیں، حضرت کے قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی تو آنکھیں کھولنے کی کوشش کی آخری سلام کر کے الوداع کہا۔ امام عالی مقامؑ نے زانو پر ان کا سر رکھا اور پیشانی پر بوسے دیئے اور فرمایا:۔

"جونؑ! ہم تم سے بہت شرمندہ ہیں۔ تم بھوکے پیاسے ہمارے گھر سے رخصت ہو رہے ہو۔"

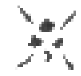
جونؑ نے کہا:۔

"نہیں نہیں، آپ گھبرائیے نہیں، آپ کے جدِ امجد اور پدرِ بزرگوار مجھے لینے کے لئے آئے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں پانی کے سرد جام ہیں، فرما رہے ہیں حسینؑ سے کہہ دو زندگی کا سفر تمام ہوا، اب تم بھی تھوڑی دیر میں ہمارے پاس آکر کوثر و تسنیم کے سرد جام پیو گے۔"

اتنا کہا اور کلمہ پڑھ کر جان دے دی۔

عزادارانِ حسینؑ! اب تاریخ وہ ورق سامنے لا رہی ہے جس پر مساواتِ انسانی تاقیامت فخر و ناز کرے گی وہ ہاتھ جنھوں نے علی اکبرؑ کی لاش اٹھائی، عونؑ و محمدؑ کو میدان سے خیمہ تک پہنچایا۔ علی اصغرؑ کی ننھی سی قبر بنائی بوڑھے جونؑ کی میت اٹھانے میں مشغول ہیں۔ ہاں اے حبشہ کی سرزمین اپنے اوپر ناز کر، ابی سینیا کے ریگستانو فخر و مباہات کرو کہ سرورِ عالم کے نواسے نے تم کو سربلند کیا۔ اور تمہارے ایک فرزند کی خون آلودہ لاش کو زخمی ہاتھوں سے اٹھا کر حبشی اور ہاشمی خون کو یکجا کر دیا۔ اب رہتی دنیا تک انسان یہ کہتے رہیں گے۔ کہ اسلام کی مساوات پروری کی بدولت حبشی اور ہاشمی خون آپس میں مل جُل گئے اور رنگ و خون کا امتیاز دُور

ہو گیا۔ جونؑ حبشی کی لاش پر رونے والا کون تھا۔ ان کے خاندان کے افراد کربلا کی سرزمین پر کہاں تھے۔ مگر امام حسین علیہ السلام اور ان کے گھرانے نے اس پردیسی کی لاش اسی احترام و اہتمام سے اٹھائی اور ان کی شہادت کی خبر سن کر اہلبیتؑ نے اسی طرح صفِ ماتم بچھائی کہ کوئی یہ نہ کہہ سکا کہ یہ ایک پردیسی اور بے خانماں کی موت ہے۔ مبارک ہے وہ مرنے والا جو حق کی راہ میں جان دے جس کو امامؑ کے سامنے موت آئے جس کا ماتم نبی کے گھرانے والے کریں۔ اور جو بہترین شہداء کی فہرست میں شامل ہو کر حیاتِ ابدی حاصل کرے۔



پانچویں مجلس

أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ط

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى اَشْرَفِ الْاَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ وَاٰلِهِ الطَّيِّبِيْنَ الطَّاهِرِيْنَ ۔ اَمَّا بَعْدُ ۔ فَقَدْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ

اَلْحَسَنُ وَالْحُسَيْنُ سَيِّدَا شَبَابِ اَهْلِ الْجَنَّةِ

رسُولِ مقبول کا ارشاد ہے:-

"حسنؑ و حسینؑ جنّت کے جوانوں کے سردار ہیں"۔

درخت اپنے پھلوں سے پہچانا جاتا ہے۔ رسول مقبولؐ کو پہچاننا ہو تو حضرت فاطمہ صلوات اللہ علیہا کی سیرت پر نظر ڈالیے۔ امام حسن اور امام حسین علیہما السلام کے کردار اور کارناموں پر غور کیجئے۔ یہ دونوں شہزادے سچ مچ رسول مقبول کی تعلیم کا عملی نمونہ ہیں اور اسلام کی صداقت کا جیتا جاگتا نشان ہیں۔

علمائے نفسیات کہتے ہیں کہ کسی جاندار کو بنانے یا بگاڑنے میں دو چیزیں اثر انداز ہوتی ہیں۔ توارثؔ اور ماحولؔ۔ فطرتؔ اور تربیتؔ، تخم کی تاثیر بھی اپنا رنگ لاتی ہے۔ اور صحبت کا اثر بھی نمایاں ہو کر رہتا ہے۔ ہمارے یہ دونوں شہزادے ہر اعتبار سے خوش قسمت اور بختاور تھے۔ نسلی سلسلہ ابراہیمؑ و اسماعیلؑ سے جا ملا تھا۔ اور ماحول ایسا میسّر آیا تھا۔ کہ شاید ہی دنیا میں کسی اور کو نصیب ہو سکے۔ حضرت فاطمہؑ جیسی ماں کی آغوش میں پلے، حضرت علیؑ کے زیر سایہ نشوونما پائی۔ حضرت محمد مصطفٰےؐ کے سینہ پر کھیلے، دوش پر

سوار ہوئے۔ اور ان کے دہن اقدس سے نکلی ہوئی مقدس ہدایتوں سے بہرہ مند ہوئے۔

اللہ اللہ وہ زمانہ کس قدر متبرک و مقدس تھا جب دنیا کا سب سے بڑا داعیٔ توحید اپنا انقلابی پیام سنا رہا تھا۔ عرب ہی نہیں سارے عالم کے در و دیوار اس کی شرکشن اور اسلام آفرین تبلیغ سے گونج اٹھے تھے۔ بتوں کا دور ختم ہو رہا تھا۔ توحید کا علم سربلند ہوتا جاتا تھا۔ رسولِ اکرمؐ مسجد نبوی کے منبر پر وعظ و نصیحت اور حکمت و عظمت کے دریا بہاتے تھے اور امام حسنؑ و حسینؑ کبھی گود میں بیٹھ کر اور کبھی منبر کے قریب تشریف فرما ہو کر ان علمی مضامین کو سماعت فرماتے تھے۔

ہزاروں سال سے تبلیغ و ہدایت نوحؑ، ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ کے گھرانے کی میراث ہو کر رہ گئی تھی۔ اور سارے عالم میں دین کے چراغ اسی دودمانِ عالی کی بدولت روشن ہوئے تھے۔ اور اب محمد مصطفٰےؐ، علی مرتضٰیؑ اور فاطمہ زہراؑ اپنے بعد لوگوں کی ہدایت کے لئے ان دو داعیوں، مجاہدوں اور مبلغوں کو تیار کر رہے تھے۔ تاریخ کے صفحات اٹھا کر دیکھیے۔ اسلام کی جو کچھ روشنی دنیا میں پھیلی وہ انہی دو معصوموں کی بدولت پھیلی۔ ٹمبکٹو[1] سے لیکر چونگنگ[2] تک اور سائبیریا[3] کے حدب سے لے کر جاوا اور سماٹرا[4] تک جہاں جہاں شہیدوں کے مزار اور تبلیغ کے مرکز ملتے ہیں وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ حسنؑ یا حسینؑ ہی کی اولاد سے اپنا سلسلہ ملاتے اور رشتہ جوڑتے ہیں۔ جنّت کے جوانوں کے یہ دونوں سردار، دنیا کے مردانِ کار اور صف شکن جوانمردوں کے بھی سردار ہیں۔

افریقہ کے تنگ و تاریک جنگل، لق و دق صحرا عرب کے ریگستان، عراق کے نخلستان، وسط ایشیا کے سبزہ زار، ہند و پاکستان کے مردم خیز خطّے اور بحر ہند کے جزائر نے اسلام کی تعلیم سے آشنا ہونے کے لئے اسی گھرانے

[1] افریقہ کا ایک شہر [2] چین کا ایک شہر [3] روسی ایشیا کا شمالی علاقہ [4] انڈونیشیا کے دو جزیرے

کا دامن پکڑا ہے۔ رسولِ اکرمؐ نے اپنے چھوٹے نواسے کی بابت فرمایا تھا۔

"حسین منی وانا من الحسین"

"حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں"

ہر بیٹا اپنے وجود میں آنے کے لئے اپنے آباء و اجداد کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔ مگر رسولِ اکرمؐ فرماتے ہیں کہ "حسینؑ تو مجھ سے ہے ہی، میں بھی حسینؑ سے ہوں۔"

یارسول اللہؐ! کیا اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ آپ کی اصل زندگی آپ کا مشن تھا۔ حسینؑ نے جان دے کر آپ کی تعلیمات کی حفاظت کی۔ دینِ اسلام کو تباہ و برباد ہونے سے بچالیا۔ اور اس طرح وہ آپ کی ذات کی بقا کا باعث ہوئے۔ جن لوگوں کو اللہ نے بصیرت دی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ رسولِ عربیؐ کی بعثت سے پہلے ساری دنیا جہالت کی تاریکی میں لپٹی ہوئی تھی۔ ایران کے آتش کدے علم کی روشنی سے محروم ہو چکے تھے۔ ہندوستان میں شرک و کفر کے علاوہ کچھ نظر نہ آتا تھا۔ یورپ کا بڑا حصہ تو خود گمنامی میں پڑا تھا۔ کہیں کہیں حضرت عیسیٰؑ کی مسخ شدہ تعلیم کے دیئے جلتے دکھائی دیتے تھے۔ مگر جابر بادشاہوں اور خدا ناشناس راہبوں نے سازش کر کے نسلِ انسانی کی غلامی کی بندشوں کو اور کس دیا تھا۔ امریکہ اور آسٹریلیا کا تو ان دنوں کوئی نام بھی نہ جانتا تھا۔ افریقہ صرف غلاموں کی برآمد کی منڈی سمجھا جاتا تھا۔

حضرت رسولِ مقبولؐ کی بعثت نے ساری دنیا میں توحید کا پرچم سربلند کیا انسانوں کو ان کے چھنے ہوئے حقوق واپس دلائے۔ مرد و عورت کا دائرہ عمل متعین کیا۔ یتیموں، بیواؤں اور اپاہج لوگوں کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے کا سبق پڑھایا۔ اسراف سے روکا۔ بخل سے باز رہنے کی ہدایت کی۔ فسق و فجور، بدکاری اور بد اخلاقی سے پرہیز کرنے کا حکم دیا۔

آپ کی بعثت سے پہلے عورت کو کوئی قانونی درجہ حاصل نہ تھا۔ باپ کے

گھر وہ باپ کی کنیز تھی۔ شادی کے بعد شوہر کی ملکیت بن جاتی اور اس کے مرنے پر اولاد کی ماتحت رہتی۔ اسلام نے اس کو ایک علیحدہ قانونی وجود بخشا۔ اس کے حقوق و فرائض مقرر کیے بتایا کہ مرد و عورت انسانی گاڑی کے دو پہیے ہیں سماج اور معاشرہ کی عمارت کے دو ستون ہیں۔ مرد کے جسم کی ساخت اور قویٰ کی مضبوطی اس کو گھر سے باہر کے کاموں کے لئے موزوں بناتی ہے۔ عورت کے نرم و نازک قویٰ اس کو گھر کے اندر کی ذمہ داریوں کا اہل ٹھہراتے ہیں۔

اسلام نے تقلید و تناسی کی غرض سے عالم کے سامنے مکمل انسانیت کے پانچ نمونے پیش کیے۔

(۱) رسولِ مقبولؐ جن کی زندگی کمالاتِ انسانی کا بہترین نمونہ تھی۔ جو عبادت و ریاضت کے ساتھ ساتھ تاہلی زندگی اور خانگی ذمہ داری کا پورا بوجھ اٹھائے ہوئے تھے۔ ان کی نمازیں ان کے عائلی فرائض میں حائل نہ تھیں۔ اور ان کی تمدنی و سیاسی ذمہ داریاں ان کو عبادتِ الٰہی سے نہ روکتی تھیں۔ وہ کسی کن بیٹھے بیراگی یا دنیا سے بیزار راہب کی طرح گھر چھوڑ کر جنگل میں جا بیٹھے تھے۔ انہوں نے گھر بنایا تھا۔ شادیاں کی تھیں۔ اولاد کی پرورش میں حصہ لیا تھا۔ ایک سے زیادہ بیویوں کے ساتھ شادی کر کے ان کے درمیان عدل کر کے دکھایا تھا۔ وہ دوست احباب سے ملتے ضرورت کے وقت انکے کام آتے علالت اور بیماری کے موقعوں پر انکی عیادت کرتے شادی غمی میں ان کے شریک حال رہتے خوشی کے موقعوں پہ باغ باغ نظر آتے۔ رنج و غم کے محل پر انکے ساتھ ہمدردی کرتے منصب کی بلندی نے انکو انسانوں سے دور نہ کر دیا تھا اور نبی و رسول بن کر وہ زمین ہی پر رہے تھے آسمانوں پر بیٹھ کر باتیں نہ کرتے تھے۔

۲- علی مرتضیٰؑ جو رسول مقبولؐ کے عم زاد بھائی اور داماد تھے شجاعت میں ان کا نظیر نہ تھا۔ بہادری ان کے قدم چومتی تھی۔ زندگی بھر جس سے لڑنے کے لئے میدان میں نکلے اس کو مغلوب کئے بغیر واپس نہ ہوئے۔ بدر و حنین

خیبر و خندق، جمل و صفین کے میدان ان کا لوہا مانے ہوئے تھے۔ اس سب کے باوجود لڑائی ان کا پیشہ نہ تھا۔ زندگی کے صلح جو یانہ مشاغل میں بھی وہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے عسکری زندگی نے ان کے اندر شقاوتِ قلب خونریزی اور قساوت پیدا نہ کی تھی۔

اپنی گھریلو زندگی میں وہ عائلی ذمہ داریوں اور سماجی حقوق کو خیر و خوبی کے ساتھ ادا کرتے تھے۔ عورتوں کے درمیان عدل، اولاد کے ساتھ حسن سلوک، رفقا کار کے ساتھ اخلاق کا برتاؤ کر کے انہوں نے ایک ایسی مثال قائم کی تھی۔ جو رہتی دنیا تک ہماری رہنمائی کرے گی۔ میدانِ جنگ کا ہیرو بزمِ صلح کا بھی پیشوا تھا۔ اور جس جرأت کے ساتھ وہ نیزہ و شمشیر چلاتا تھا اسی مہارت کے ساتھ نوکِ قلم سے بھی کام لینا جانتا تھا۔ لوگوں نے خیبر و صفین میں ان کی ذوالفقار کے کارنامے بھی دیکھے تھے اور منبر پر ان کی فصیح و بلیغ زبان کو پھولوں اور موتیوں کی بارش کرتے بھی دیکھا تھا۔ ایک طرف اگر انہوں نے عربوں کو جم کے لڑنا صف بندی کر کے دشمن کا مقابلہ کرنا، قلعہ بند فوجوں پر حملہ کرنا سکھایا تھا تو دوسری طرف ان کو ذوقِ علمی سے بھی آشنا کیا تھا۔

"لَافَتیٰ اِلَّا عَلِیٌّ لَا سَیْفَ اِلَّا ذُوالْفِقَار" سے رسول اکرمؐ نے ان کے ایک جوہر کا اعتراف کیا اور "اَنَا مَدِیْنَةُ الْعِلْمِ وَ عَلِیٌّ بَابُهَا" سے دوسرے کمال کی داد دی۔

۳۔ تیسرا نمونہ حضرت فاطمۃ الزہراؑ تھیں۔ دنیا سمجھتی تھی کہ رشد و ہدایت کا منبع اور تبلیغ دین اور اعلائے کلمۃ الحق کا وسیلہ صرف مرد ہی ہیں مگر صدیقہ طاہرہؑ کی ذات نے عورتوں کے مرتبہ کو چار چاند لگا دیئے۔ ان کا علم و فضل، زہد و ورع، اطاعت شوہر اور تربیتِ اولاد کے ساتھ ساتھ امورِ خانہ داری کی پوری نگہداشت ببانگ دہل یہ اعلان کر رہی ہے کہ عبادت اور ادائے حقوق دین اور دنیا میں کوئی منافات نہیں ہے۔ لیجیے

خود مولائے کائنات کی زبانی فاطمہ زہراؑ کی مکمل اور قابلِ تقلید زندگی کا واقعہ سنیئے:-

حضرتِ علیؑ فرماتے ہیں ایک مرتبہ فاطمہ زہراؑ کو سخت بخار تھا۔ ساری رات آنکھ نہ لگی اور برابر کراہنے کی آواز آتی رہی۔ صبح سویرے جب میں نماز کیلئے اٹھا تو دیکھا کہ فاطمہؑ وضو کر کے نماز کیلئے جا رہی ہیں میں مسجد سے واپس آیا تو آنکو چکی پیستے دیکھا میں نے کہا بنت رسولؐ اپنی حالت پر رحم کیجیئے ساری رات آپ بخار میں مبتلا رہیں صبح سویرے اٹھ کر نماز پڑھی ہے۔ اب ذرا آرام کر لیجیئے چکی پیسنے کی کیا جلدی تھی جناب سیدہؑ نے فرمایا "سویرے اٹھ کر نماز ادا کی ــــ وہ اللہ کا فریضہ تھا۔ اب چکی پیس رہی ہوں ــــ یہ آپ کے اور آپ کے بچوں کی خدمت کا فریضہ ہے"

یہ تھی جامع صفات" فاطمہؑ" جنہوں نے اپنی زندگی اس طرح گزاری کہ دینداری اور دنیاداری دونوں کے حقوق ادا ہوتے رہے۔ نہ وہ بالکل راہبہ بن کر رہ گئیں اور نہ گھر بار کے پیچھے خدا کو بھلا دیا یہی وجہ ہے کہ رسول مقبولؐ جیسا خدا رسیدہ اور فرض شناس باپ ان کی تعظیم کے لئے کھڑا ہو جاتا تھا۔ اور اُن کے ساتھ وہ سلوک کرتا تھا جو بزرگوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ عالم نسواں کی اس ملکہ نے رسولِ اکرمؐ سے خراجِ تحسین و آفرین وصول کر کے اپنی صنف کا نام روشن کیا۔ اور بتایا کہ حسنِ عمل اور بلند کرداری ہو تو عورت بھی سربلند ہو سکتی ہے

آپ کی سیرت دنیا جہاں کی عورتوں کے لئے قابلِ تقلید نمونہ ہے۔ انہوں نے عالم نسواں کے سامنے علم و عمل کی شاہراہ کھول دی ہے۔ ان کی امن پسندانہ زندگی، گھریلو مشاغل، تربیتِ اولاد اور تدبیر منزل کے کارنامے عورتوں کو ان کے صحیح اور جائز فرائض یاد دلاتے ہیں۔ بے شک ان کو زندگی بھر کسی فوج کی کمان کرنے کا موقع نہیں ملا۔ مگر تیماردار کی حیثیت سے انہوں نے میدان جنگ میں کام کر کے بتا دیا کہ عورت کا کام زخم لگانا نہیں بلکہ مرہم پٹی کرنا ہے۔ اس کی آغوش ہونے

رسول مقبولؐ کے بعد جب یزید نے دورِ جاہلیت کا پھر سے احیاء کرنا چاہا اور اخلاقی اقدار کو ٹھکرا کر حیوانی جبلتوں پر تمدن کی بنیاد رکھنی چاہی۔ تو اسی گھرانے سے امام حسین علیہ السلام کا ظہور ہوا جنہوں نے اپنا سب کچھ کھو کر انسانیت کو قعرِ مذلت میں گرنے سے بچا لیا۔

اربابِ نظر جانتے کہ نسلِ ابراہیمی انسانی تاریخ میں ایک مخصوص اہمیت کی مالک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:۔

ان اللہ اصطفیٰ ادم و نوحا و الِ ابرٰھیم و الِ عمران علی العالمین

(بے شک اللہ نے آدمؑ، نوحؑ، آلِ ابراہیمؑ اور آلِ عمران کو سارے عالموں کے مقابلہ میں منتخب کر لیا تھا۔)

نسلِ انسانی حضرت آدمؑ اور حضرت نوحؑ کے ذریعہ سے پھیلی ہے۔ آلِ ابراہیمؑ اور آلِ عمران نے بھی اس کرۂ ارض کی آبادی میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ پہلے پہل اللہ تعالیٰ نے اپنے پیام کے لئے افراد کو چنا تھا۔ پھر پوری کی پوری نسلوں کو یہ شرف بخشا کہ وہ برگزیدہ بندے بن کر اللہ کے احکام دنیا میں پھیلائیں اور اپنی سیرت کو نوعِ انسانی کی ہدایت کا ذریعہ بنائیں۔ امامت اس دینی قیادت کا نام ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان صالح بندوں ملتی ہے۔ جو عصمت، طہارت، علم و فضل اور اخلاقِ حسنہ کی بدولت اپنے زمانے کے ممتاز ترین افراد ہوتے ہیں۔

وجعلنا منھم ائمۃ یھدون بامرنا لما صبروا۔ (اور ہم نے ان میں سے کچھ امام بنائے جو ہمارے حکم سے ہدایت (کا کام) کرتے تھے (اور یہ عہدہ ان کو اس وقت ملا) جب انہوں نے صبر (کا مظاہرہ کیا) قرآن کا مطالعہ بتاتا ہے کہ صبر کی دولت اللہ کی طرف سے عطا ہوئی ہے۔ اللہ صبر کرنے والوں کا ساتھ دینے کا وعدہ کرتا ہے (ان اللہ مع الصابرین) امت کی امامت اور قیادت کا منصب صابروں ہی کے لئے مخصوص ہے۔ اس کے بغیر نہ فرد کی ترقی ہوتی ہے۔ نہ قومیں فلاح پاتی ہیں، بزم اور رزم دونوں میں اسی صفت کے مالک کامیابی سے ہمکنار ہوتے ہیں۔

والعصر ۝ ان الانسان لفی خسر ۝ الا الذین امنوا وعملوا الصٰلحٰت وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر ۝

(زمانہ شاہد ہے کہ بلاشبہ سارے انسان گھاٹے میں ہیں سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور جنہوں نے عمل صالح کیے اور آپس میں ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے)

زمانہ کی شہادت آثارِ قدیمہ، تواریخ اور کتبِ آسمانی کے ذریعہ سے ہم تک پہنچی ہے۔ قدیم تمدن اور گذشتہ تہذیبیں اور ثقافتیں جو آئے دن کھد کر ہمارے سامنے آتی ہیں۔ ان سے ثابت ہوتا ہے کہ نسلِ انسانی کے صرف وہی افراد اور گروہ کامیاب رہے ہیں جن میں صبر و استقامت اور تحمّل و برداشت کا مادہ تھا اور جو خود بھی سچائی پر ثابت قدم اور دوسروں کو بھی حق پر قائم رہنے کی ہدایت کرتے تھے

انسان بلا کا جلد باز اور تھڑدلا ہے، وہ ہتیلی پر سرسوں جمانا چاہتا ہے اور عمل کے نتائج نکلنے میں کسی تاخیر کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اس کائنات کا کاروبار صبر پر چل رہا ہے۔ یہاں سعی و جد وجہد کے نتائج جلد نہیں دیر سے برآمد ہوتے ہیں۔ جلد باز بازی ہار جاتا ہے اور صابر رہتی دنیا تک اپنا نقش چھوڑ جاتا ہے۔ خاصانِ خدا اور مامور من اللہ لوگوں کی زندگی کے کارنامے ہم کو یہی سکھاتے ہیں کہ کوشش کرنا ہمارا کام ہے اور اس کوشش کو پروان چڑھانا اللہ کے فضل و احسان پر موقوف ہے۔ نسلِ ابراہیمی کی پوری تاریخ صابروں کے کارناموں سے بھری پڑی ہے جنہوں نے مسلسل جد وجہد اور منظم تدبیر و تدبّر کے ذریعہ سے نسلِ انسانی کو ترقی کی راہوں پر گامزن رکھا ہے۔ اور برسوں نہیں بلکہ صدیوں کے بعد ان کے مساعی جمیلہ کے نتائج کی بنا پر نوعِ انسانی تدریجاً ترقی کرتی گئی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے پیارے فرزند اسماعیلؑ کو مکہ کی وادیٔ غیر زرعہ میں لاکر آباد کیا۔ اور بحرِ ہند کے کنارے سے لے کر بحیرۂ روم تک جانے والی شاہراہ

والے جرنیلوں اور سپہ سالاروں کی تربیت گاہ بن سکتی ہے۔ مگر ہتھیار لگا کر فوجی پیش قدمی کرنا اس کے مادرانہ جذبات کے منافی ہے۔ ان کا مدینہ میں رہ کر باپ اور شوہر کے کھانے کا بندوبست کرنا اور گھر کو سنبھالنا یہ بتا رہا ہے کہ گھر کے محاذ HOME FRONT کی نگرانی بھی بہت ضروری ہے۔ اگر گھر کا محاذ خالی رہ جائے تو دشمن آسانی سے ہم کو مغلوب کر سکتا ہے۔ کسی جنگ کی پہلی حفاظتی صف FIRST LINE OF DEFENCE گھر ہی ہو سکتا ہے۔ اگر یہ کمزور ہو تو پھر مار کھانا آسان ہے اور اگر یہ مضبوط ہو تو پیچھے ہٹتی ہوئی صفوں کی محافظ اور معاون ثابت ہو سکتی ہے۔

۴ و ۵۔ رسولِ اکرمؐ کے بھرے گھر میں ہر قسم کی ہدایت کے نمونے موجود تھے۔ اگر فاطمہ زہراؑ عورتوں کے لئے نمونہ تھیں تو حسنؑ و حسینؑ بچوں اور نوجوانوں کے لئے مشعلِ راہ تھے۔

ہوتا یہ ہے کہ بڑے آدمیوں کے بچے اکثر لاڈ پیار میں بگڑ جاتے ہیں اور باپ دادا کے نام کو بلند کرنے کے بجائے ان کے لئے ننگ و عار کا باعث بن جاتے ہیں۔ مگر رسولِ مقبولؐ، علی مرتضیٰؑ اور فاطمہ زہراؑ کے یہ بچے ساری دنیا کے لئے ہدایت کا نمونہ تھے۔ جب تک لڑکپن رہا۔ نانا کی آغوش میں پلے بڑھے پروان چڑھے۔ نانا نے آنکھ بند کی تو ماں باپ کے بتائے ہوئے نیکی کے راستے پر چلے۔ باادب ایسے کہ احکامِ دین کی تبلیغ کے وقت بھی حفظِ مراتب کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ اور جری اتنے کہ ننھی سی عمر میں بھی کبھی بے جا بات کو برداشت نہ کیا۔ آپ نے وہ واقعہ ضرور سنا ہوگا۔ کہ کسی چشمے کے کنارے ایک بوڑھا عرب وضو کر رہا تھا۔ مگر ارکانِ وضو صحیح طور پر ادا نہ ہو رہے تھے حسنؑ و حسینؑ ادھر سے گزرے۔ عمر کم تھی مگر دین کی ذمہ داری کے احساس نے مجبور کیا۔ کہ اس کی اصلاح فرمائیں۔ چنانچہ انہوں نے یہ کیا کہ خود بھی اس چشمے کے کنارے جا بیٹھے اور عرب سے مؤدب طریقہ پر کہنے لگے کہ ہم دونوں بھائی

وضو کرتے ہیں آپ دیکھ کر بتائیے کہ غلط تو نہیں ہے؟ عرب نے جب ان دونوں شاہزادوں کو وضو کرتے دیکھا تو کہا۔

"بچو تم صحیح طور پر وضو کر رہے ہو، غلطی پر میں ہی تھا، اللہ تم کو اجر دے تم نے مجھ بوڑھے کو آج وضو کرنے کا صحیح طریقہ سکھا دیا۔"

حسنین علیہما السلام کی تبلیغ کا یہ طریقہ ان تلخ گفتار واعظوں اور دل آزار خطیبوں اور مبلغوں کے لئے ایک اسوۂ حسنہ ہے جو نشترِ زبان کے کچوکے دے کر دینِ حقہ کی اشاعت کرنا چاہتے ہیں۔

رسولِ مقبولؐ کی تعلیم و تربیت نے سچ مچ دونوں بھائیوں کو اخلاق و ادب علم و فضل اور تہذیب و تعلیم کا ایک نمونہ بنا دیا تھا۔ اور اخلاقِ محمدی اور فضائلِ احمدی کا یہی وہ نمونہ تھے جن کو آنحضرت نے اُمّت کی ہدایت کے لئے چھوڑا تھا۔ حق بات یہ ہے کہ اگر ہم مسلمان" انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ وعترتی واھل بیتی ما ان تمسکتم بھما لن تضلوا بعدی" کو اپنا لائحہ عمل بناتے تو ملت کا سفینہ کبھی کا ساحلِ مراد پر پہنچ چکا ہوتا رسول مقبولؐ جیسے حکیم، مدبر اور مامور من اللہ کا یہ ارشاد کہ" میں تم لوگوں میں اپنے بعد دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جاتا ہوں۔ ایک اللہ کی کتاب اور دوسری میری عترت یعنی میرے اہل بیت جب تک تم ان دونوں سے متمسک رہو گے میرے بعد ہرگز ہرگز گمراہ نہ ہو گے۔ سرسری طور پر سننے اور پڑھنے کے لئے نہیں بلکہ بڑے غور و فکر کا محتاج ہے

آنحضرت نے بڑی سخت کاوش اور کوشش کے بعد احکام اسلام کی اشاعت کی تھی۔ ان کی تعلیم و تبلیغ اور سعی و جد و جہد سے جو ملت وجود میں آئی تھی، جو سماج قائم ہوئی تھی اس کے اندر اچھی عادتیں ابھی کما حقہٗ راسخ نہیں ہوئی تھیں۔ ۲۳ سال سال کا عرصہ اتنا زیادہ نہیں ہوتا کہ کسی قوم کو پورے طور پر نئے آداب و قوانین سے آشنا بھی کر دے۔ اور ان پر قائم اور استوار کر کے اس قابل بھی بنا دے کہ راہ سے ہٹ جانے کا خدشہ ہی باقی نہ رہے۔ جس طرح مالی کو اپنے باغ سے کسان

کو اپنی فصل سے اور استاد کو اپنی درسگاہ سے محبت ہوتی ہے۔ اسی طرح آنحضرتؐ کو اپنی امت کا بڑا خیال تھا۔ اور فاطمہؑ، علیؑ، حسنؑ اور حسینؑ کی تربیت انہوں نے اسی انداز سے کی تھی کہ آگے چل کر وہ ان کے لگائے ہوئے باغ اور بنائے ہوئے معاشرے کی نگرانی کا مقدس فرض ادا کرسکیں۔ ان مقدس حضرات نے آنحضرتؐ کی امیدوں اور آرزوؤں کو حسن و خوبی کے ساتھ پورا کیا اور رسول مقبولؐ کے اس دنیا سے گزر جانے کے بعد اپنے اپنے حلقۂ عمل میں اللہ کے پیام کو پھیلایا۔ لوگوں کو احکام اسلام کا عادی بنایا۔ اور اپنا سب کچھ قربان کر کے "دین حق" کی بنیادیں مضبوط کیں ان مقدس ہستیوں میں سے آخری یعنی امام حسین علیہ السلام نے تو دین حق کی حمایت میں وہ کام کیا کہ رہتی دنیا تک ان کا نام رہے گا۔ اور قیامت تک لوگ ان کی عدیم المثال قربانی پر تحسین و آفرین کرتے رہیں گے۔ یزید ابن معاویہ اپنے زمانہ کا بہت بڑا بادشاہ تھا۔ اس کے پاس فوجیں تھیں۔ خزانے تھے۔ اموی گھرانے سے وراثت میں ملا ہوا جوڑ توڑ اور سیہ کاری اور سفاکی کا سلیقہ تھا۔ وہ بلا کا بے باک اور پرلے سرے کا صاف گو تھا۔ اپنے اعمال کو خوشنما الفاظ اور مصالح کے پردوں میں چھپانے کا عادی نہ تھا۔ جو دل میں تھا وہی زبان پر تھا۔ اپنے پیشرو حکمرانوں کے برخلاف اس نے کھلے طور پر محمدؐ و آل محمدؐ کی مخالفت کی اور برسرِ عام کہہ دیا:۔

لعبت بنو هاشم بالملک فلا
نبی جاء ولا وحی نزل

(بنی ہاشم نے ملک کے ساتھ یہ ایک کھیل کھیلا تھا۔ ورنہ نہ کوئی نبی آیا نہ کوئی وحی نازل ہوئی تھی)

امیر معاویہ مصلحت کے پتلے اور ڈپلومیسی کے بادشاہ تھے۔ انہوں نے ساری عمر اپنے عمل کو تاویلوں اور توجیہوں کے نقاب سے ڈھانپے رکھا اور دنیا کو مشکل سے یہ پتہ لگ سکا کہ ان کی حکمتِ عملی کا دھارا کس کے خلاف بہہ رہا ہے۔ مگر یزید

نے باپ کے مرتے ہی یہ حکم جاری کردیا کہ امام حسینؑ اگر بیعت کرسکتے ہیں تو ان کو ہمارے زیر سایہ زندہ رہنے کا حق حاصل ہے۔ اگر وہ بیعت کرنے پر آمادہ نہ ہوں تو ان کا سر کاٹ کر بھیج دیا جائے۔

یزید کا یہ حکم حکمتِ عملی کے اعتبار سے کتنا ہی ناعاقبت اندیشی پر مبنی ہو مگر ان خفیہ سازشوں اور پس پردہ کارروائیوں کی نقاب کشائی کررہا تھا۔ جو عرصہ سے بروئے کار آرہی تھیں۔ اور جن کا واحد مقصد یہ تھا کہ دنیا سے بنی ہاشم کے اقتدار، اثر اور رسوخ کو کلیتہً ختم کر دیا جائے۔ اگر بنی ہاشم کا مقابلہ اس حیثیت سے کیا جاتا کہ وہ بنی اُمیہ کا حریف قبیلہ ہے تو یہ چنداں قابلِ اعتنا بات نہ ہوتی۔ مگر صورتِ حال یہ تھی کہ اس وقت بنی ہاشم اسلام کے مبلغ اور پیامِ حق کے حامل تھے۔ وہ عرب کی صدیوں کی جہالت کو مٹانے کا کام کر رہے تھے۔ کفر و نفاق کا قلع قمع کرنے کے لئے کھڑے ہوئے تھے۔ ان کا مقابلہ کرنا گویا حق و صداقت کا مقابلہ کرنا تھا اموی اور ہاشمی رقابت رسولِ عربیؐ کی رحلت کے بعد کفر و اسلام اور باطل و حق کی معرکہ آرائی بن کر رہ گئی تھی۔

یزید، نمرود، فرعون اور ان تمام فساد پسند طاقتوں کا نمائندہ اور جانشین تھا۔ جنہوں نے دنیا میں ہمیشہ حق سے نبرد آزمائی کی تھی۔ امام حسین علیہ السلام اپنے منصب، موقف اور صلاحیتوں کے اعتبار سے آدمؑ، نوحؑ، ابراہیمؑ، اسماعیلؑ اور نبی آخرالزماںؐ کے وارث نظر آتے تھے۔ اور جس طرح اپنے اپنے وقت میں ان گزرے ہوئے انبیاؑ نے شیطانی طاقتوں سے مقابلہ کیا تھا اسی طرح آج امام حسین علیہ السلام کے نام پر یہ قرعۂ فال نکلا تھا۔ کہ وہ یزید کے چیلنج کو قبول کرکے وہ فرض ادا کریں جس کا ادا کرنے والا اس وقت کوئی اور نظر نہ آتا تھا۔

کربلا کی جنگ میں جس نے ساری مہذب اور متمدن دنیا کو سوگوار بنا دیا ہے جس کے غم میں چودہ سو سال سے صفِ ماتم بچھتی چلی آئی ہے، ظلم و ستم اور صبر و تحمل دونوں کے انتہائی نمونے پیش کرتی ہے ظلم کی انتہا تھی کہ ننھے ننھے بچے پیاس

سے بے چین ہیں۔ چمنِ فاطمہؑ کے پھول پانی نہ ملنے کی وجہ سے کمھلائے جا رہے ہیں۔ زخمی شہید جلتی ریت پر خاک و خون میں لوٹ رہے ہیں۔ پیشانی پر موت کا پسینہ ہے۔ نبضیں ڈوب رہی ہیں۔ گلا خشک ہے۔ مگر کوئی رحم نہیں کھاتا دریا بہہ رہا ہے مگر ایک گھونٹ پانی بھی میسر نہیں آتا۔ ہائے عباسؑ جیسے بہادر، علی اکبرؑ جیسے ہم شبیہ پیغمبرؐ اور علی اصغرؑ جیسے کمسن بچے جان پر کھیل گئے اور اعداء نے پانی کے بدلے تیر اور تلوار سے ان کی پیاس بجھائی۔

دنیا کی کسی قوم نے اپنے نبی کے نواسے، اپنے امام اور ایسے مجسمۂ خلق و اخلاص کو اس بے دردی سے قتل کیا ہے؟

عزادارانِ حسینؑ! فرات کا پانی موجیں مار رہا تھا۔ اور آپ کے نبیؐ کا نواسہ کافروں کے درمیان نہیں بلکہ کلمہ پڑھنے والوں کے نرغے میں بھوکا پیاسا تیروں کا نشانہ بنا ہوا تھا۔

کوئی تلوار مارتا تھا، کوئی نیزے سے زخم لگاتا تھا، ہزاروں دشمن ایک طرف تھے۔ اور اسلام کا یہ مبلغ اور سیرتِ محمدی کا یہ مجسم نمونہ دوسری طرف، کہتے ہیں، کہ جب سارا تن بدن زخموں سے چور ہو گیا تو حسینؑ گھوڑے سے زمین پر گر پڑے، فوجِ مخالف میں خوشی کے باجے بجنے لگے اور مسرت و انبساط کے نعرے بلند ہوئے عمر بن سعد نے لوگوں سے کہا کوئی ہے جو جا کر حسینؑ کا سر کاٹ لے۔ پے در پے کئی آدمی اس قتل کے ارادے سے آگے بڑھے مگر کوئی آپ کی مظلومی سے متاثر ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ کسی کی طرف آپ نے اس طرح نظر اٹھا کر دیکھا کہ وہ تاب نہ لا سکا۔ ایک کوفی جو آپ کے سر تن سے جدائی کے اقدام پر بالکل آمادہ ہو چکا آپ کا یہ فقرہ سن کر واپس آ گیا۔

”میرے جسم سے خون بالکل نکل چکا ہے۔ اے عرب اب میں چند لمحوں کا مہمان ہوں۔ موت سر پہ کھڑی ہے۔ بھوک اور پیاس کی شدت اور زخموں کی کثرت مجھے جانبر نہ ہونے دے گی۔ مگر میرا دل نہیں

چاہتا کہ تو میرے قتل کا ذمہ دار ٹھہرے اور رہتی دنیا تک لوگ تجھ پر نفرین کرتے رہیں جا دور چلا جا اور اپنے آپ کو اس لعنت کا مستحق نہ بنا۔“

حسینؑ جیسے رہنما، حسینؑ جیسے مظلوم اور بے کس کے قتل کی جرأت دنیا میں ہر شخص نہیں کر سکتا تھا۔ اس جرم کے ارتکاب کے لئے بڑی شقاوت قلبی کی ضرورت تھی مشہور یہ ہے کہ بالآخر شمر نے یہ کلنک کا ٹیکہ اپنی پیشانی پر لگایا۔ اور بھوکے پیاسے زخمی عزیزوں کے غم سے نڈھال امام کو اپنے خنجر سے قتل کر ڈالا۔ قتل سے پہلے امام عالیمقامؑ نے نماز ادا کرنے کی مہلت مانگی۔ پانی کہاں تھا، جو وضو کرتے زخمی ہاتھوں سے جلتی زمین پر تیمم کیا اور نماز میں مشغول ہو گئے۔

کربلا کی زمین قیامت تک اس عزت و سعادت پر ناز کرے گی کہ امام حسین علیہ السلام کا تاریخی سجدہ اس کے دامن پر ثبت ہوا تھا۔ اور رہروِ راہِ عشق کو آخری منزل اس کی خاک پر نصیب ہوئی تھی۔

ابھی سجدۂ آخر تمام نہ ہوا تھا کہ خنجر گلے پہ چلنے لگا۔ اور دم کے دم میں دنیا تاریک ہو گئی۔ آندھیاں آئیں، آفتاب گہنا گیا۔ اور چاروں طرف " الا قتل الحسین بکربلا " کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ جب یہ آوازیں خیمہ میں پہنچیں تو اہلِ حرم کی امیدیں مایوسیوں سے بدل گئیں۔ بچے بڑوں سے لپٹ کر رونے لگے۔ اور بڑے گریہ و بکا اور آہ و فغاں میں مصروف ہو گئے۔ سامنے دیکھئے حسینؑ کا سر نیزے پر بلند ہے۔ اور فوج شام جسم اقدس کو پامال کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہے امام زین العابدین علیہ السلام خیمہ کا پردہ اٹھا کر میدانِ قتال کا نظارہ فرما رہے ہیں۔ اور باپ کے قتل اور ان کے سر کے نیزے پر بلند ہونے کا منظر دیکھ کر غش کھا کر گر رہے ہیں۔

اللہ اللہ وہ نظارہ بھی کس قدر ہولناک تھا۔ سیاہ آندھیاں چل رہی تھیں۔ آفتاب گرد و غبار میں منہ چھپائے ہوئے تھا۔ کوفی لشکر فتح کے شادیانے بجا

رہا تھا۔ اور نبیؐ کی آل اپنے حال پر آنسو بہا رہی تھی۔ اب حق بظاہر مغلوب اور باطل بظاہر غالب نظر آتا تھا۔ اہلِ حرم کی آس ٹوٹ چکی تھی اور اہلِ کوفہ کے حوصلے بڑھ چلے تھے۔ لوگھوڑوں کی ٹاپوں سے میدان گونجنے لگا۔ فوج کا ایک دستہ خیام اہلِ بیت کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ارے غور سے دیکھو انہوں نے امام کے حرم محترم کا ذرا بھی پاس نہیں کیا۔ وہ خیموں میں آگ لگا رہے ہیں۔ اور شعلے ایک کے بعد دوسرے خیمے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ اہلِ حرم جلتے ہوئے خیموں سے نکل کر اس خیمے میں پناہ لے رہے ہیں جو ابھی تک آگ کے شعلوں سے محفوظ ہے۔ بالآخر سب خیمے راکھ ہو گئے۔ آخری خیمہ میں امام زین العابدینؑ بستر پر پڑے ہیں۔ شعلے ان کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اور حضرت زینبؑ بھتیجے کو بیدار کر کے فرما رہی ہیں۔

"امام زمانہ! اب کیا حکم ہے۔ ہم سب خیمے سے نکلیں یا یہیں جل کر جان دے دیں"

فرمایا جان کا بچانا ضروری ہے۔ زینبؑ نے کہا تو پھر اُٹھیے اور آپ بھی باہر چل کر خاک پر آرام فرمائیے۔

عزادارانِ حسینؑ!

خیمے جل چکے۔ اب شام بھی ہو چلی ہے۔ ہلکا ہلکا اندھیرا چھانے لگا ہے۔ دن بھر کے تھکے ماندے بچے اور بڑے راکھ کے ڈھیر پر آ بیٹھے ہیں اور اپنے پچھلے جاہ و جلال اور موجودہ حالِ زار پر آنسو بہا رہے ہیں۔

چھٹی مجلس

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمدللہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ اشرف الانبیاء والمرسلین وآلہ الطیبین الطاہرین۔ امّا بعد۔

فقد قال اللہ سبحانہ تعالیٰ فی کتابہ المجید وفرقانہ الحمید۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ واذابتلیٰ ابراھیم ربہ بکلمات فاتمھن فقال انی جاعلک للناس اماما قال ومن ذریتی قال لاینال عھدی الظالمین ۝

(وہ وقت یاد کرو جب ابراہیمؑ کا ان کے رب نے چند کلموں کے ساتھ امتحان لیا۔ اور وہ ان میں پورے اُترے تو اللہ نے فرمایا بے شک میں تم کو آدمیوں کا امام مقرر کرنے والا ہوں۔ ابراہیمؑ نے پوچھا اور میری اولاد کو؟ ارشاد ہوا ہمارا عہدہ ظلم و زیادتی کرنے والوں کو نہیں پہنچیگا)

حضرت احدیت نے اپنے مخصوص بندے ابراہیمؑ کا امتحان لیا۔ اور وہ امتحان میں کامیاب ہو گئے تو ان کو ساری دنیا کا امام بنا دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی درگاہ سے عہدے اُنہی کو ملتے ہیں، جو امتحانوں میں کامیاب ہوتے ہیں اور آزمائشوں میں پورے اترتے ہیں۔ امامت اور قیادت کا منصب جلیل اتنا سستا اور اس قدر معمولی نہیں ہے کہ راہ چلتے لوگ اس پر فائز ہو جائیں۔ یہ منصب اللہ کی ہی طرف سے عطا ہوتا ہے۔ اور بڑی جانچ پڑتال اور ابتلاء و آزمائش کے بعد عطا ہوتا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ یکے بعد دیگرے بہت سے عہدوں پر فائز ہوئے۔ اللہ نے ان کو متعدد منصب عطا فرمائے۔ نبوت ملی۔ رسالت عطا ہوئی۔ خلیل کا لقب مرحمت

ہوا۔ مگر کبھی یہ خواہش نہیں کی "خدایا اس بخشش میں میری اولاد کو بھی شامل کیا جائے" اور رہتی دنیا تک میری نسل اس نعمت سے بہرہ مند ہوتی رہے۔ نبوت اور رسالت کے عہدے کتنے جلیل القدر اور مہتم بالشان ہیں۔ جب اللہ نے ان کو یہ منصب عطا کیا تھا تو فطری طور پر ان کا خیال اولاد کی طرف جانا چاہیئے تھا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ خلیل اللہ جانتے تھے کہ نبوت اور رسالت کے عہدے ختم ہونے والے ہیں۔ امامت وہ منصب ہے جو قیامت تک باقی رہیگا۔

اللہ اللہ وہ بھی کیسا مبارک وقت ہوگا۔ جب ابراہیمؑ امتحان میں کامیاب ہو کر امامت کے منصب پر فائز ہو رہے ہوں گے۔ ساری دنیا کی قیادت کا عہدہ ان کو تفویض کیا جا رہا ہوگا اور وہ دربارِ احدیت میں مؤدبانہ عرض کر رہے ہوں گے۔ کہ پالنے والے یہ عہدہ محض میرے لئے نہ ہو۔ بلکہ میری نسل میں بھی چلے میری اولاد دنیا کی امامت کرے اور تیرے دین کو زمین کے گوشوں تک پھیلائے"

اللہ نے ارشاد فرمایا "ابراہیمؑ مطمئن رہو۔ ہم تمہاری نسل میں بھی اس عہدے کو باقی رکھیں گے۔ مگر یہ منصب جلیل بے جا کام کرنے والوں کو نہیں ملے گا۔ تمہاری اولاد میں جو لوگ ظلم و زیادتی کرنے والے ہوں گے وہ اس منصب پر فائز نہ ہو سکینگے"

حضرت ابراہیم علیہ السلام اگر جمہوریت پسند ہوتے تو اللہ سے یہ دعا مانگتے کہ یہ منصب عامۃ الناس کو دیا جائے۔ ہر کس و ناکس اس کا اہل قرار دیا جائے۔ لیجئے وہ تو صرف اپنی ذریت کے لئے دعا مانگ رہے ہیں۔ اور اللہ خالق کائنات رب العالمین ہے، کالے گورے سب کا روزی رساں ہے، عرب و عجم سب کا پروردگار اور رب ہے یہ نہیں کہتا کہ "ابراہیمؑ کیا غضب کر رہے ہو، اس منصب جلیل کو صرف اپنی اولاد کے لئے طلب کر کے تنگ نظری اور محدود خیالی کا ثبوت نہ دو۔" بلکہ جواب دیتا ہے، کہ تمہاری اولاد میں بھی سب کو نہیں ملے گا۔ صرف وہ لوگ اس کے حقدار ہوں گے جو ہر بے جا کام سے پرہیز کریں گے۔ ظلم صرف قتل و غارت ہی کا نام نہیں ہے۔ ظلم کے معنی ہیں "وضع الشئی فی غیر محلہ" کسی چیز کو ایسی جگہ رکھنا جہاں اس کا محل نہ ہو۔ ٹوپی کو پیر میں پہننے اور جوتے کو سر پہ رکھنے والے بھی ظالم ہوتے ہیں

معلوم ہوا کہ امام وہ ہوگا جو کوئی بے جا کام نہ کرے۔ اور ہر عمل میں عصمت و عدل کے دائرہ سے باہر قدم نہ رکھے۔

اب تاریخ اٹھا کر دیکھیے کہ نوعِ انسانی کی دینی قیادت کرنے والے لوگ ابراہیمؑ ہی کی نسل سے پیدا ہوئے ہیں اور یہی وہ گھرانا ہے جس نے وقت پڑنے پر نسل انسانی کی ہر طرح مدد کی ہے۔ قدیم زمانے میں کلدانیہ کے وسیع میدانوں پر نظر ڈالیے۔ بابل نینوا، اُر جیسے تمدن کے مرکزوں کا جائزہ لیجئے۔ اشوری نسل کے حالات پڑھیے۔ نمرود کے ظلم و استبداد سے دنیا چلا اٹھتی تھی۔ ستارہ پرستی اور ہیکل ...... کے پردے میں بادشاہ اور پروہت عامۃ الناس کو غلام بنائے ہوئے تھے۔ کہ یکایک غیرتِ حق جوش میں آئی اور تاریخ کے گھر میں حضرت ابراہیمؑ پیدا ہوئے جنہوں نے توحید کا ڈنکا بجا کر سوئی ہوئی مخلوق کو بیدار کیا۔ اور جھوٹے خداؤں کا طلسم توڑ کر رکھ دیا۔ یہی ابراہیمؑ کنعان و شام کی سرزمین پر انسانی قلوب و اذہان کو توہمات سے رہائی دلانے کا باعث ہوئے اور انہی ابراہیمؑ نے حجاز میں اس معبد کی بنیاد رکھی جو آج تک توحید الٰہی اور انسانی آزادی کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ ہاں جب فرعون نے خدائی کا دعویٰ کیا اور آدمی کو آدمی کا غلام بنا کر نوعِ انسانی کی توہین کا سامان کیا تو اسی ابراہیمؑ کے گھرانے سے موسیٰؑ و ہارونؑ اُٹھے اور انہوں نے فرعون کے غرور کو خاک میں ملا کر رکھدیا۔ اس کی ساری عظمت پانی میں ڈوب گئی۔ اور اقتدار ختم ہوگیا۔

اسی طرح فلسطین، عراق اور مصر میں ہر زمانے اور ہر عہد میں ظلم و ستم کے لئے نسلِ ابراہیمی سینہ سپر ہوتی رہی اور جب عرب کی سرزمین پر کفر و نفاق کی تاریکی حد سے گزر گئی تو حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور حضرت علی علیہ السلام نے ہدایت کی روشنی پھیلائی۔ اور گمراہ انسانیت کو پھر راہِ مستقیم پر لگا دیا۔

پر توحیدِ الٰہی کا مرکز قائم کیا۔ اور اسی امید سے قائم کیا کہ ایک دن یہاں اللہ والوں کی ایک بڑی بستی قائم ہو جائے گی۔ یہاں تعلیم الٰہی کا بہت بڑا مرکز بن جائے گا۔ بحر عرب اور بحر قلزم کی بندرگاہوں سے تجارتی مال لے کر جو قافلے شمال کی طرف بڑھیں گے۔ وہ مکے کی منڈی میں مبادلہ اجناس کے ساتھ ساتھ دینی خیالات اور مذہبی تصورات کا بھی سرمایہ حاصل کریں گے۔ اور یوں معارف و مکارم کی کھیپیں شمال کی طرف منتقل ہو جائیں گے اور شمالی بندرگاہوں اور شہروں سے آنے والے قافلے یہ دولت خداداد جنوب و مشرق کے شہروں اور ساحلوں تک لے جائیں گے

حضرت ابراہیمؑ سے پہلے ساری دنیا کفر کی تاریکیوں میں لپٹی ہوئی تھی۔ ہر طرف ستاروں بتوں اور چلتے پھرتے انسانوں کی پرستش ہوتی تھی۔ یہ ابراہیمؑ کا صدقہ ہے کہ دنیا اُن دیکھے، واحد، قادر اور حکیم خدا سے آشنا ہوئی اور عامۃ الناس تک نے توہمات کے مقابلہ میں ایک منظم اور ترقی پذیر دین سے تعارف حاصل کیا۔

جدید علمی تحقیقات نے یہ پتہ لگایا ہے کہ سامی نسلوں کا قدیم وطن عرب ہے وہاں سے نکل کر یہ نسل آس پاس کے ملکوں میں آباد ہوتی رہی۔ اشوریا، کلدانیہ بابل، کنعان اور مصر میں اس نسل کی شاخوں نے آباد ہو کر بڑے بڑے تمدنوں کی بنیادیں رکھیں اور تہذیب و ثقافت کو بہت بلندی پہ پہنچایا۔ کلدانیہ میں انہوں نے علم نجوم و علم ہیئت کو ترقی دی اور بحر روم کے کنارے فنقیہ میں رسم الخط کو نشو و نما دے کر علم و فن کو حیاتِ جاوید بخشی۔ مصر میں جا کر تعمیر و سنگ سازی کے معجزے دکھلائے اور کنعان و شام میں "آسمانی پیام" کے حامل بن کر دنیا کو "امن و امان" کی دعوت دی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سامی نسل کے چشم و چراغ تھے۔ ان کا مولد "اُر" تھا۔ جس کے آثار عراق کی سرزمین پہ اسی صدی میں کھود کر نکالے گئے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کو "پیام توحید" کا داعی اور اسلام کا قدیم منادسمجھا جاتا ہے۔ (ملۃ ابیکم ابراھیم ھو سمّٰکم المسلمین)

اللہ تعالیٰ عربوں کو مخاطب کر کے فرمایا ہے: "یہ تمہارے دادا ابراہیمؑ کا دین

ہے۔ اس نے تمہارا نام مسلمان رکھا تھا" قرآن شریف کی شہادت سے معلوم ہو گیا۔ کہ دین الٰہی کا نام "اسلام" ابراہیمؑ کے عہد سے پڑا۔ اسلام کے معنی ہیں "گردن نہادن" "سرِ تسلیم خم کرنا" آیئے تاریخ کی ورق گردانی کریں۔ قرآنی آیات پر نظر ڈالیں۔ ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کا کونسا واقعہ ہے جس میں "گردن نہادن" اور "سرِ تسلیم خم کردن" کی مثال نمایاں طور پہ ملتی ہے۔

فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ۝ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ؕ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ؗ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۤءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ۝ وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۝ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝

(تو ہم نے ابراہیمؑ کو ایک نرم دل لڑکے کی بشارت دی۔ (وہ پیدا ہوا اور نشو و نما پا کر) اپنے باپ کے ساتھ دوڑ دھوپ کرنے لگا۔ تو (ایک دن) باپ نے بیٹے سے کہا، میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تم کو ذبح کر رہا ہوں، تو تم سوچ بچار کر کے بتاؤ کہ اس میں تمہاری رائے کیا ہے؟ اسماعیلؑ نے جواب دیا (مرضی مولا از ہمہ اولیٰ) جو آپ کو حکم ہوا ہے (بے تامل) کر گزریئے) انشاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے۔ پھر جب دونوں نے (اللہ کے حکم کے سامنے) سرِ تسلیم خم کر دیا اور باپ نے بیٹے کو (ذبح کرنے کے لئے) ماتھے کے بل لٹا دیا تو ہم نے ابراہیمؑ کو آواز دی۔ اے ابراہیمؑ تم نے تو سچ مچ خواب کی تصدیق عمل سے کر دی (اب تم دونوں بڑے مرتبوں پر فائز ہو گئے۔ بے شک ہم اچھے کام کرنے والوں کو یوں ہی بدلہ دیا کرتے ہیں)

اولاد کی محبت سے کون واقف نہیں اور پھر اولاد بھی کیسی جو برسوں کی دعاؤں کے بعد ملی ہو۔ مگر واہ رے ابراہیمؑ تو فطری جذبے پر غالب آ گیا۔ اور اللہ کے حکم کے سامنے سر جھکا دیا۔ تیرا یہ سرِ تسلیم خم کرنا یعنی اسلام اللہ کو اتنا پسند آیا کہ اس نے

دینِ الٰہی کو اسلام کا خطاب دے دیا اور کہہ دیا آج سے اللہ کا دین "اسلام" کے نام سے موسوم ہوگا اور یہ نام رہتی دنیا تک ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کے بے مثال جذبۂ قربانی کی نقابت کرے گا۔ اور قیامت تک اس دین کے ماننے والوں میں جذبۂ قربانی کو زندہ رکھے گا۔

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِیْنُ ○ وَفَدَیْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ ○ وَتَرَكْنَا عَلَیْهِ فِی الْاٰخِرِیْنَ ○

"یقیناً یہ (بڑا سخت اور) صریح امتحان تھا۔ ہم نے اس قربانی کا فدیہ ایک ذبحِ عظیم کو قرار دیا۔ اور ان کا اچھا چرچا بعد کو آنے والی نسلوں میں باقی رکھا۔"

حضرت ابراہیمؑ نے بیٹے کی قربانی کے وقت اسلام (گردن نہادن) کا مظاہرہ کرکے جس بلند جذبۂ ایثار کا مظاہرہ کیا تھا۔ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نواسے امام حسین علیہ السلام نے کربلا کے میدان میں اس کو اور بھی سربلند کر کے دکھا دیا۔ اور یوں نسل ابراہیمی نے اسلام کو چار چاند لگائے مگر واقعات وحالات کے لحاظ سے ابراہیمؑ کی قربانی اور امام حسین علیہ السلام کے ایثار کا مقابلہ ہی نہیں کیا جاسکتا۔

حضرت ابراہیمؑ ہدیۂ عقیدت پیش کرنے کے لئے بڑھے تو تین روز کے بھوکے پیاسے نہ تھے جسم زخموں سے چور نہ تھا۔ روح فرطِ غم سے مضمحل نہ ہو چکی تھی۔ اس کا کھٹکا نہ تھا کہ اشقیاء خیموں میں آگ لگا دیں گے اور اہلِ حرم کو لوٹ لیں گے۔ مگر حسینؑ جب میدانِ ابتلا اور جولانگاہِ آزمائش میں اترے تو از سرتاپا زخمی تھے بھوک پیاس نے نڈھال کر رکھا تھا۔ اور عزیزوں کے داغ قلب وجگر کو چھلنی کر چکے تھے مگر اللہ اللہ حسینؑ نے صبر وشکیبائی سے سنتِ ابراہیمی کا احیا کیا اور جذبہ قربانی کو کس قدر بلند کر کے دکھایا۔ علی اکبرؑ کی شہادت کو کس صبر وتحمل سے قبول کیا۔ علی اصغرؑ کو کس طمانیت کے ساتھ راہِ خدا میں نثار کر دیا۔ اور پھر کس سکونِ

نفس کے ساتھ خود خنجر کے نیچے سر رکھ دیا۔

محرم کا چاند دیکھتے ہی ساری دنیا جو سوگ نشین ہو جاتی ہے۔ عزا خانے آباد اور عاشور خانے آراستہ ہونے لگتے ہیں یہ تو اسی پیشین گوئی کا اثر ہے جو ابراہیم علیہ السلام کے لئے کی گئی تھی کہ تمہارا ذکرِ خیر رہتی دنیا تک رہے گا۔ اور تمہارے عزم وایثار کا چرچا آنے والی نسلوں میں ہوتا رہے گا۔

اے عزادارانِ حسینؑ!

حسینؑ کی قربانی ذبحِ عظیم ہے۔ اور تم جو محرم کے ایام میں اس قربانی کا ذکر تازہ کرتے ہو تو ابراہیمؑ ونسلِ ابراہیمؑ کے فداکارانہ طرزِ عمل کو دنیا تک پہنچاتے ہو۔

ہاں ہاں، علی اکبرؑ کے عزمِ جوان کی یادگار قائم کرو، علی اصغرؑ کے معصومانہ انداز قربانی کو دنیا کے سامنے پیش کرو۔ دیکھنا سکینہؑ کا خالی کوزہ ان کے پیاسے ہونٹوں کی خشکی فراموش نہ ہو جائے۔

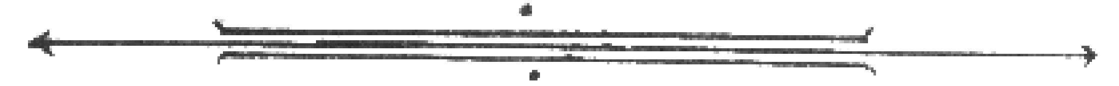
دنیا کی ہر سوسائٹی عیش وطرب کی تربیت دے سکتی ہے۔ آرام سے زندگی بسر کرنے کے طریقے سکھا سکتی ہے۔ مگر یہ دکھ بھری دنیا مصائب وآلام جھیلنے کا گُر نہیں جانتی۔ یہاں کوئی ایسی درسگاہ نہیں ہے جو صبر وتحمل اور تشکر وامتنان کے جذبے کو ابھارنے اور ظلم رسیدہ مخلوق کو صبر وشکر کرنے کی تعلیم دے

تم دنیا کی نرالی قوم ہو۔ تمہارے پاس مجالس عزا کا سا مفید ادارہ ہے۔ یہ ادارہ ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے والوں کو تربیت دیتا ہے۔ مظلوموں سے ہمدردی کرنے کی عادت پیدا کرتا ہے۔ مصائب وآلام کو صبر وشکر کے ساتھ انگیز کرنے کا طریقہ بتاتا ہے۔ وہ صبر وشکر نہیں جو ظالم کی اعانت کرے اور ظلم کی رسی کو دراز کر دے بلکہ وہ صبر وشکر جو فرد وقوم میں شجاعت اور بہادری کے جذبات پیدا کرتا ہے اور ظلم کو منظم طور پر نیست ونابود کرنے کی داغ بیل ڈالتا ہے۔

ہاں اے عزادارانِ حسینؑ!

اُٹھو اور دنیا کو "حسینی مشن" سے آگاہ کرو۔

بچوں کو علی اصغرؑ کی پیاس یاد دلاؤ۔ جوانوں کو علی اکبرؑ کی جوانی کے کارنامے سناؤ۔ بوڑھوں کو حبیب ابن مظاہر کے واقعات سے متاثر کرو۔ ہاں شانِ قیادت دکھانی ہو تو امام حسین علیہ السلام کی تنظیم، ترتیب اور حسنِ ترتیب کے واقعات سناؤ عورتوں کے سامنے حضرت سکینہؑ حضرت زینبؑ، حضرت ام کلثومؑ کے حالات بیان کرو۔ شاید تمہارا مسلسل بیان دُنیا کو محمدؐ و آلِ محمدؐ کی طرف متوجہ کر دے۔ اور یوں ذکرِ حسینؑ کی بدولت یہ دکھ درد کی ماری نوعِ بشر سکون و راحت سے ہمکنار ہو جائے۔



ساتویں مجلس

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ ط

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی اَشْرَفِ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ وَآلِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاہِرِیْنَ۔ اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی فِیْ کِتَابِہِ الْمَجِیْدِ ۝

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْکِتٰبَ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْھُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِہٖ وَمِنْھُمْ مُّقْتَصِدٌ وَمِنْھُمْ سَابِقٌ بِالْخَیْرٰتِ

"پھر ہم نے الکتاب کا وارث اپنے بندوں میں سے منتخب ہستیوں کو بنایا کہ ہمارے بندے (تین قسم کے ہیں) ان میں سے کچھ تو اپنے نفسوں کے حق میں ظلم کرنے والے ہیں اور کچھ ان میں سے درمیانی راہ پر چلتے ہیں اور ان میں سے بعض نیکیوں کی طرف سبقت کرنے والے ہیں"

کائنات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اصطفٰے Natural Selection کا قانون جاری ہے پیدا ہونے کو سبھی پیدا ہوتے ہیں۔ مگر بقا صرف اسی وجود کو نصیب ہوتی ہے۔ جو اَنْفَعْ اور اَصْلَحْ ہوتا ہے یعنی جس کے اندر نفع پہنچانے کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔ اور جس کے اندر بقا اور فائدہ رسانی کی صلاحیتیں زیادہ ہوتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ ایک مقام پر فرماتا ہے:۔

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِیَۃٌ بِقَدَرِھَا فَاحْتَمَلَ السَّیْلُ زَبَدًا رَّابِیًا ط وَمِمَّا یُوْقِدُوْنَ عَلَیْہِ فِی النَّارِ

ابتغاء حلیۃ او متاع زبد مثلہ ط کذالک یضرب اللہ الحق والباطل ط فاما الزبد فیذھب جفاء ج واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض (۱۳: ۱۷)

" اس (اللہ) نے آسمان سے پانی برسایا تو ندی نالوں میں جس قدر سمائی تھی۔ اس کے مطابق وہ بہہ نکلے اور جس قدر کوڑا کرکٹ جھاگ بن کر اوپر آگیا تھا اسے سیلاب بہا لے گیا۔ اسی طرح جب زیور یا اور کسی طرح کا سامان بنانے کیلئے دھاتوں کو، آگ میں تپاتے ہیں تو اس میں بھی جھاگ سا اٹھتا ہے اور میل کچیل کٹ کر نکل جاتا ہے۔ حق اور باطل کی مثال اللہ تعالیٰ بیان کرتا ہے۔ جھاگ رائیگاں ہو جاتا ہے (کہ بے فائدہ چیز ہے) ہاں جس چیز میں انسان کے لئے نفع ہوتا ہے وہ زمین پر باقی رہ جاتی ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دو مثالیں دی ہیں۔ جب موسلا دھار پانی برستا ہے تو ندی نالے بہہ نکلتے ہیں کوڑا کرکٹ، خس وخاشاک جو بیکار چیزیں ہے بہہ جاتا ہے۔ اور جو چیزیں نفع بخش ہیں یعنی بیج وہ زمین سے پھوٹ نکلتے ہیں۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے کھیتیاں لہلہانے لگتی ہیں اور میوہ دار پودے سربلند ہو جاتے ہیں۔ کل تک جہاں خاک اڑتی تھی۔ وہاں بارش کے چھینٹے کی بدولت سبزہ زار نظر آنے لگتا ہے۔

اسی طرح جب دھاتوں کو گلاتے ہیں تو ان کے اندر بھی جو میل کچیل ہوتا ہے۔ وہ آگ کی حرارت پاکر جدا ہو جاتا ہے۔ اور خالص دھات باقی رہ جاتی ہے۔ ہوشیار سنار اچھی دھات کو نکھار کر، صاف کر کے، زیور بناتا ہے۔ یہی قانون کائنات کے چپے چپے اور کونے کونے میں رائج ہے۔ انسان بھی سینکڑوں نسلوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ قدرت ان کو بھی اسی کسوٹی پر کستی ہے۔ اور اسی معیار پر پرکھتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

ان اللہ اصطفیٰ ادم و نوحا وال ابراھیم وال عمران علی العالمین۔

" **بلاشبہ اللہ نے آدمؑ کو، نوحؑ کو، آل ابراہیم کو اور آل عمران کو سارے عالموں کے مقابلے میں منتخب کر لیا۔"**

پھر ارشاد ہوتا ہے: ثم اورثنا الکتاب الذین اصطفینا من عبادنا الخ

" پھر ہم نے الکتاب کا وارث اپنے بندوں میں سے ان لوگوں کو بنایا جن کو ہم نے منتخب کر لیا تھا" کہ بندے تین قسم کے ہوتے ہیں۔ اپنے نفس کے حق میں ظلم کرنے والے، میانہ رو، اور نیکی کی طرف سبقت کرنے والے۔ الکتاب کے معنی ہی وہ مخصوص نوشتہ قانون، احکام نامہ جو اللہ نسل آدم کی ہدایت کے لئے نازل فرماتا ہے۔ اس کتاب کے حقیقی وارث اور مالک وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو نیکی کی طرف سبقت کرنے والے ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی لئے فرمایا تھا۔

انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ و عترتی اھل بیتی۔ ما ان تمسکتم بھما لن تضلوا بعدی۔ بلاشبہ میں تمہارے اندر دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جاتا ہوں۔ ایک اللہ کی کتاب اور دوسرے اپنی عترت یعنی اہل بیت۔ جب تک تم ان دونوں سے متمسک رہو گے میرے بعد ہرگز گمراہ نہ ہو گے۔"

اللہ نے دنیا کی ہدایت کے لئے قرآن شریف بھیجا تھا۔ وہ احکام الٰہی کا خزانہ ہے۔ مگر کتاب ہدایت کے لئے کافی نہیں ہوا کرتی۔ انسان حیوان نقال ہے وہ بغیر مثال دیکھے ہدایت نہیں حاصل کیا کرتا۔

قرآن شریف کے ساتھ ساتھ ہادیوں کی ایک جماعت کی ضرورت تھی جو یکے بعد دیگرے اپنی مثال پیش کر کے نوع انسانی کو سعادت کی راہ پر چلا سکے۔ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے اور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا احسان ہے کہ ہم کو اپنی ہدایت کے لئے علیؑ۔ فاطمہؑ، حسنؑ، حسینؑ اور ان کی اولاد میں نو امام جیسے روحانی پیشوا اور دینی قائد نظر آتے ہیں۔

یہ بزرگ ہستیاں راہب، سنیاسی اور جوگی نہ تھیں کہ تمدن و ثقافت کی بیخکنی کر کے خانقاہ، جنگل اور پہاڑوں کو آباد کرتیں اور مدنی، عائلی اور اجتماعی نظام کو برباد کر کے خود غرضانہ طریقہ پر ذاتی نجات کے تصور میں مگن رہتیں۔ انہوں نے زندگی کے ہر شعبہ اور حیات کے ہر موڑ پر ہماری رہنمائی کی۔

اگر یہ حضرات شادی بیاہ نہ کرتے اور گھر گرہستی اور بال بچوں کی ذمہ داری کا بار نہ اٹھاتے تو آج عائلی زندگی اور سماجی حالت کی اصلاح کے لئے ہم کہاں سے ہدایت حاصل کرتے۔ حضور سرورِ کائناتؐ کی مقدس زندگی پر نگاہ ڈالیے تہذیب نفس کے کمالات کے ساتھ ساتھ ان کے حالاتِ خانگی اور معاشری عدل کا بھی مظاہرہ کرتے ہیں۔

ایک سے زیادہ بیویاں تھیں، مگر عدل و مساوات کا یہ عالم تھا کہ کسی کو شکایت کا موقع نہیں ملا۔ آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اتفاق سے رسول اللہ کو خدیجہ جیسی خوش اخلاق اور صاحبِ ایثار بیوی میسر آ گئی تھی کہ خانگی کشمکش پیدا نہیں ہو سکی۔ آنحضرتؐ کے حرمِ محترم میں مختلف المزاج عورتیں تھیں۔ نرم بھی اور گرم بھی مگر آپ کے حسنِ سلوک نے سب کو صلح و صفائی کے ساتھ رکھ کر خانگی امن کا ایک قابلِ تقلید نمونہ پیش کیا۔ اولاد کے معاملے میں آنحضرت سخت امتحان کی منزل سے گزرے۔ نرینہ اولاد زیادہ دن تک زندہ نہ رہ سکی۔ وفات حسرت آیات کے وقت فاطمہؑ ہی موجود تھیں ان کی جدائی کا بیحد قلق تھا۔ ان کے مستقبل کی طرف سے فکرمند تھے اور بار بار تسلی اور دلاسہ دیتے تھے۔ حضرت فاطمہؑ نے جب باپ کو بخار کی شدت میں کروٹیں بدلتے دیکھا تو بے چین ہو گئیں اور "یا ابتاہ" "یا ابتاہ" کہہ کر رونے لگیں۔ رسول مقبولؐ نے فرمایا:-

لَاکَرْبَ عَلٰی اَبِیْكِ بَعْدَ الْیَوْم (بیٹی آج کے بعد تمہارے باپ پر کوئی کرب ہوگا)

حضرت رسول مقبولؐ کی وفات کسی ایک آدمی کی وفات نہ تھی، دین، سیاست، اخلاق، تمدن اور تہذیب کے مروج اور حامی کی وفات تھی۔ سارے مدینہ نے سارے

عرب نے، سارے عالمِ اسلام نے ان کی جدائی کو محسوس کیا۔ مگر حضرت فاطمہؑ کے دل پر جو گزری اس کو وہی خوب جانتی تھیں۔ ان کے لئے رسول مقبولؐ کی وفات ایک ایسا سانحہ تھی جس نے ان کی زندگی کو بالکل بے کیف بنا دیا۔ دن بھر روتی۔ رات بھر آنسو بہاتی تھیں اور فرمایا کرتی تھیں۔

صُبَّتْ عَلَیَّ مَصَائِبُ لَوْ اَنَّھَا

صُبَّتْ عَلَی الْاَیَّامِ صِرْنَ لَیَالِیَا

[(آپ کے بعد) مجھ پر ایسی مصیبتیں پڑیں کہ دنوں پر پڑتیں تو رات (کی طرح کالے) ہو جاتے]

مجھے نہیں معلوم کہ باپ کے مرنے کے بعد بیٹی پر کیا بیتا پڑی، امت کے ہاتھوں رسولؐ کی بیٹی نے کیا ظلم سہے۔ ہاں تاریخ کے پردوں سے جھلک کر اتنا تو نظر آجاتا ہے کہ یا تو وہ زمانہ تھا کہ مملکت اسلامیہ کا سربراہ، دولتِ الٰہیہ کا حکمران نماز کے بعد اپنی بیٹی فاطمہؑ کے در پر سلام کرنے کیلئے آتا تھا۔ اور کہتا تھا۔ اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا اَھْلَ بَیْتِ النُّبُوَّۃ یا باپ کے مرنے کے بعد دنیا نے وہ رخ موڑا کہ یہی دروازہ جو مہبط ملائکہ اور مرکز انوارِ الٰہیہ تھا پولیس ایکشن (Police Action) کا محاذ بن کر رہ گیا۔

کل تک حسنؑ و حسینؑ شہزادے تھے۔ دولتِ اسلامیہ کے نازپروردہ تھے۔ آغوشِ رسالت میں پلتے اور پروان چڑھتے تھے، ان کی ہر فرمائش پوری کی جاتی تھی، ان کی ہر تمنا تکمیل سے ہمکنار ہوتی تھی۔ آج وہ بے یار و مددگار ہیں بدلتی ہوئی دنیا کے ہر جبر کو آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور کچھ نہیں کر سکتے۔ انہوں نے اپنے دروازے پر آگ آتی ہوئی دیکھی یہ دھمکی بھی سنی کہ اگر لوگوں نے ہمارا کہنا نہ مانا تو اس گھر کو آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کے حوالے کر دیا جائے گا۔ فاتح خیبر کو رسن بستہ پولیس کی حراست میں بھی دیکھا۔ اور آسمان کی طرف نظر کر کے رہ گئے۔

لیکن اولادِ رسولؐ کے یہ مصائب اور ان کا یہ صبر بھی ہمارے لئے تعلیم و ہدایت کا ایک ذریعہ تھا ایک امن پسند شہری سے اسلام جو توقعات رکھتا ہے۔ ان کا مظاہرہ دیکھنا ہو تو آلِ محمدؐ کے اس رویہ پر غور کیجئے جو انہوں نے آنحضرتؐ کی وفات کے بعد اختیار کیا تھا جب ہم کسی سماج کے رکن کسی معاشرہ کے شریک اور کسی نظامِ حکومت کے شہری بن جاتے ہیں تو ہم کو اس کے احکام و قوانین کو کسی حد تک ضرور ماننا چاہیئے جب تک جان خطرے میں نہ ہو۔ ایمان پر آنچ نہ آتے اصول مٹائے نہ جا رہے ہوں۔ اس وقت تک کسی نظامِ مجلسی کے خلاف بغاوت نہیں کی جا سکتی۔ اگر بات بات پر نیام سے تلوار نکالنے کی اجازت دے دی جائے۔ اور ہر نظری اور علمی اختلاف جہاد کی ترغیب و تحریص دینے لگے۔ تو عالم کا امن و امان کس طرح باقی رہ سکتا ہے

علیؑ اور اولادِ علیؑ نے ملک کے قیامِ امن کے ذمہ دار ادارہ کو چیلنج نہیں کیا۔ اور آنے والی نسلوں کے لئے یہ نظیر قائم کی کہ گو بادشاہ بن کر حکومت چلانا مشکل ہے مگر اس سے بھی زیادہ مشکل یہ ہے کہ انسان کسی ملک کا شہری بنے اور اپنے فرائض ذمہ داری اور صلح جوئی کے ساتھ ادا کرے۔

دنیا نے میدانِ جنگ میں علیؑ اور اولادِ علیؑ کے کارنامے دیکھے ہیں۔ سارا زمانہ ان کی تلوار کا لوہا مانے ہوئے ہے۔ مگر نظم و ضبط کو قائم رکھنے کے لئے اپنے حقوق و دعاوی سے صرف نظر کر کے امن پسندی کا ثبوت دینا اس سے بڑھ کر کارنامہ ہے۔ یہ کہنا کہ علیؑ اور اولادِ علیؑ کو اپنے عہد کی حکومتوں سے کوئی اختلاف نہ تھا۔ تاریخ کا منہ چڑانا ہے، وہ اپنے آپ کو پورے طور پر جہانبانی اور حکمرانی کا اہل سمجھتے تھے اور اس کا اکثر و بیشتر اعلان بھی کرتے رہتے تھے۔ مگر جب حالات کا رُخ ان کے خلاف ہوا تو انہوں نے فتنہ و فساد کے بجائے امن و آشتی کی راہ اختیار کی۔

الکتاب کے یہ وارث اور خدا کے یہ برگزیدہ بندے ہم کو دنیا میں رہن سہن کا طریقہ سکھانے اور آخرت میں کامیابی حاصل کرنے کی راہیں بتانے آئے تھے انہوں نے تہذیبِ نفس، تدبیرِ منزل، سیاستِ مدن اور بین الاقوامی تعلقات کے

گُر سکھائے۔ انسان کو حیوان مطلق سے ممتاز کرنے والی جبلتوں کو ارتقا و اعتلاء (Sublimate) کی منزل تک پہنچا کر بتایا کہ گھاس کھانے والے چرندوں اور گوشت خور درندوں کی طرح زندگی بسر نہ کرو۔ بلکہ انسانی خصائص کا مظاہرہ کر کے اپنی برتری ثابت کرو۔

دیکھو بھوک ہر جاندار کو لگتی ہے مگر جو پیٹ کے دوزخ کو بھرنے کیلئے ہر اچھے بُرے اقدام پر آمادہ ہو جائے وہ جانور ہے اور جو بھوک کو برداشت کرنے کی عادت ڈالے اور اپنے سامنے کی روٹی اٹھا کر دوسرے کا پیٹ بھر دے اور ضرورت ہو تو خود بھوکا سو رہے۔ وہ انسان ہے، آؤ ہم کو دیکھو تین دن روزے رکھتے ہیں اور ہر شام کو اپنے بجائے سائل کے پیٹ بھرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّہٖ مِسْکِیْنًا وَّیَتِیْمًا وَّاَسِیْرًا (دھر)

(اور وہ لوگ مسکین، یتیم اور اسیر کو کھانا کھلاتے ہیں، باوجود اس کے کہ ان کو بھی اس کھانے کی اشتہا ہوتی ہے)

یہی وہ لوگ ہیں جن کا تذکرہ تاریخ انسانی کا مرتبہ رکھتا ہے۔ ورنہ بادشاہوں سپہ سالاروں اور کشورکشاؤں کا ذکر تو ڈاکوؤں کا افسانہ اور حیوانوں کا قصہ ہے۔ تاریخ کے نام سے جو چیز ہمارے مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہے وہ تو قصاب کی دوکان کی کہانی اور "مسلح اقوام" کے واقعات کا مجموعہ ہے۔ آدمی کا انسان بننا آسان نہیں ہے اور حق یہ ہے کہ محمدؐ و آلِ محمدؐ ہی کی وہ ہستیاں ہیں جنہوں نے انسانیت کے صحیح نمونے پیش کئے ہیں۔

پھر کسی انسان کا خانقاہ میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنا آسان ہے۔ پہاڑوں کے غاروں میں دھونی رمانا بھی مشکل نہیں۔ تمدنی ذمہ داریوں سے گریز کرنا اور سماج کی دی ہوئی نعمتوں سے بہرہ اندوز ہونا، تن آسانی اور سہل انگاری کا مظاہرہ ہے یہ جوگی، سادھو، درویش اور فقیر جو "ھُو حق" کے نعرے لگاتے پھرتے ہیں، اصل میں زندگی کی جد وجہد میں ناکام رہ چکے ہیں یا کارزارِ حیات میں مقابلہ کرنے کی

تاب ہی نہیں رکھتے۔

زاہد نہ داشت تاب جمالِ پری رخاں!

گوشہ گرفت یاد خدا را بہانہ ساخت

محمدؐ وآلِ محمدؐ بھی اگر ایسے ہی ہوتے تو ان کا اسوۂ حسنہ بیسویں صدی کی روشنی کی تاب نہ لا سکتا تھا۔ اور دنیا کے دوسرے مذاہب کے رجالِ کبیر کی طرح عمل کی کسوٹی اور کامیابی کے معیار پر پورا نہ اترتا۔

مگر غور سے دیکھو اور ہر پہلو سے دیکھو۔ محمدؐ وآلِ محمدؐ علی انسان تھے۔ اور باعمل لوگوں کی قیادت کے لئے آئے تھے وہ کسی کرشن کی طرح محض بانسری بجا کر دل خوش کرنا نہ جانتے تھے۔ مستِ شباب من چلوں کو دعوتِ حرب وضرب دیکر امن سوزی کے سامان مہیا نہ کرتے تھے۔

نہ گوتم بدھ کی طرح راج پاٹ تج کے گھر بار چھوڑ کر جنگل آباد کرنے کے قائل تھے۔ انہوں نے خاندانوں کی بنیاد رکھی جو تمدن و معاشرت کے واحدے ہیں، شادیاں کیں، اولاد پیدا کی، گھر کو عدل و مساوات کی کارگاہ بنایا۔ اولاد کو بہترین تعلیم و تربیت دے کر انسانوں کے لئے نمونہ عمل قائم کیا۔

ہاں ہاں دنیا کے کروڑوں آدمی کرشن، گوتم بدھ اور حضرت عیسیٰؑ کو مانتے ہیں۔ تاریخ نے ان لوگوں کے حالات زندگی کو جس شکل میں ہمارے سامنے پیش کیا ہے اس سے عائلی، خانگی اور تمدنی حلقوں میں نوعِ انسانی کو کسی قسم کی رہنمائی نہیں ملتی۔ ہاں ایٹم بم کی مدد سے مغربی کرۂ ارض کو جس منزل پر پہنچانا چاہتا ہے وہ بات ضرور حاصل ہو سکتی ہے۔ یعنی مہا بھارت کی جنگ، گوتم کے تیاگ اور حضرت مسیح کے ترکِ دنیا کے نتائج دنیا کو نیست و نابود کر کے ایک سکونِ مطلق تک پہنچا سکتے ہیں۔ محمدؐ وآلِ محمدؐ کی کوششیں تدبیر منزل پر آ کر ختم نہیں ہو گئیں بلکہ انہوں نے سیاستِ مدن کی گتھیوں کو بھی سلجھایا۔

ہر موڑ پر معاشرے کی خدمت کی، ہر مشکل کے وقت حکمرانی اور جہانبانی کی

قابلیت کے جوہر دکھائے۔ میدانِ رزم میں حرب وضرب، رسد کی فراہمی اور زخمیوں کی نگرانی اور معالجہ کے کمالات دکھائے۔ بزمِ صلح میں انسانی رواداری کا مظاہرہ کیا اور امن کے زمانے میں دوست و دشمن کے ساتھ منصفانہ سلوک کر کے حسنِ معاشرت اور رہن سہن کے نمونے پیش کئے۔

مسلمان جو ہر کشور کشا کے گن گاتے ہیں اور ہر سپہ سالار سے مرعوب ہیں جن کو متعع پرست لوگوں کے ان کاموں سے دلچسپی ہے جن کو استعماری اور سامراجی اصطلاح میں خواہ کتنا ہی خوشنما الفاظ سے یاد کیا جاتا ہو۔ مگر اصل میں وہ اس بیماری کے ظہور کا پتہ دیتے ہیں جس کو جوع الارض کہا جاتا ہے۔ ایسے مسلمان اگر ٹھنڈے دل سے غور کریں تو صحیح انسانی خدمت اور اسلامی تعلیم کے نمونے محمدؐ وآلِ محمدؐ کی زندگی کے سوا دوسری جگہ مشکل سے ملیں گے۔ کربلا کا معرکہ جو اپنی غیر معمولی اثر خیزی کے لئے "تاریخِ عالم میں معروف و مشہور ہے۔ خاندانِ رسالت کی صلاحیتوں کا آئینہ دار ہے۔

شروع سے اس کا اہتمام تھا کہ شر انگیزی اور فتنہ خیزی سے بچا جائے۔ امام حسین علیہ السلام مدینہ میں رہ کر بھی یزید کی فوجوں کا مقابلہ کر سکتے تھے۔ فتح و شکست تو اللہ کے ہاتھ ہے۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ مدینہ میں آپ کے حمایتی اور طرفدار یقیناً کربلا کی مختصر فوج سے زیادہ ہوتے۔ رسولِ اکرمؐ کے زمانے سے لیکر ۶۰ سنہ ہجری تک عمر کا بڑا حصہ اس شہر میں گزرا تھا۔ اعزا و اقربا تھے۔ دوست احباب تھے، عقیدتمند و ارادت کیش تھے۔ مصیبت کے وقت ہر شخص کام آتا رسولِ مقبولؐ کے روضے، فاطمہ زہراؑ کے مزار، حسنِ مجتبیٰؑ کے مرقد کی خاموش اپیل لوگوں کو بقیہ پنجتن کی مدد کے لئے اکسانی رہتی۔ مدینہ کے آس پاس رہنے والے قبیلوں میں بھی اہل بیت کا کچھ کم اثر و رسوخ نہ تھا۔ اگر فرزند رسولؐ طلب فرماتے تو کس کی مجال تھی، کہ لبیک نہ کہتا۔

لیکن امام حسین علیہ السلام کو لڑائی منظور نہ تھی، وہ صلح و آشتی کے سارے

ذریعے اور وسیلے فراہم کرنا چاہتے تھے تاکہ یہ فتنہ ٹل جائے اور مسلمان خانہ جنگی سے بچ جائیں۔ مدینہ سے مکہ جانے کا اصل سبب یہی تھا کہ خانۂ خدا میں بیٹھ کر ایک طرف حکومتِ وقت کو مطمئن کردیں کہ ہم فساد کے درپے نہیں ہیں۔ اور دوسری طرف حکومت کے ظلم و جور سے محفوظ رہیں۔ اگر امام حسین علیہ السلام کی یہ تمنا برآتی اور یہ آرزو پوری ہو جاتی تو آج مسلمان قوم کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔ مگر یزید کے دل میں نہ اسلام کا احترام تھا۔ نہ کعبہ کی تعظیم۔ اس نے حاجیوں کے لباس میں قاتلوں کو مکہ بھیجنا شروع کر دیا تاکہ وہ عین حج کے موقعہ پر امام عالیٰ مقام کا قصہ تمام کر دیں۔

امام حسین علیہ السلام کو اپنی جان سے زیادہ حرمتِ کعبہ کا خیال تھا۔ وہ اس بات کے روادار نہ تھے کہ ان کی وجہ سے حرم محترم کا تقدس برباد ہو اور آئندہ کیلئے مسلمان اس دارالامن کی برکات سے محروم ہو جائیں۔ اس لئے انہوں نے کوچ کا ارادہ کرلیا۔ گرمی کے دن تھے۔ لو چل رہی تھی۔ ریگستانوں کا سفر تھا۔ سنگلاخ میدانوں سے گزرنا تھا عورتیں ساتھ تھیں، بچے ہمراہ تھے۔ عرب کے ریگستانوں کا سفر سچ مچ سقر کے اندر چھلانگ لگانے کے برابر ہے کوسوں پانی کا نشان نہیں ملتا۔ میلوں سبزہ نظر نہیں آتا۔ بادِ سموم کے تھپیڑے قافلوں کو خاک و گرد میں دفن کر دیتے ہیں۔ سیاہ آندھی دن کو رات سے بدل دیتی ہے۔ اگر زندہ بھی رہ جائے تو راستہ بھول کر آدمی خدا جانے کہاں سے کہاں جا نکلتا ہے۔ اس گرمی، لو اور بے سروسامانی کے عالم میں امام عالی مقام نے یہ سفر اسی لئے اختیار کیا کہ کعبہ کی حرمت باقی رہ جائے اور مسلمان کسی ایسی خانہ جنگی کے شکار نہ ہو جائیں۔ جس سے ان کی اجتماعی قوت ختم ہو جائے۔ مکہ سے نکلے تو کوفہ کا رخ کیا۔ کہ وہاں کے مسلمان چشم براہ تھے۔ اور ایک دو نہیں ہزاروں پیام آچکے تھے کہ امیر معاویہ کے بعد ہم اسی معاہدہ کے پابند ہیں جو آپ کے بھائی امام حسن علیہ السلام نے کیا تھا۔ کہ معاویہ زندگی بھر اس حکومت کے سربراہ رہیں گے۔ اور ان کے مرنے کے بعد یہ عہدہ امام حسن علیہ السلام کو یا اگر وہ

زندہ نہ ہوتے تو امام حسینؑ کو مل جائے گا۔ وہ لکھ رہے تھے کہ ہم کو ایک ہادی کی ضرورت ہے۔ ہم امام وقت کے فیوض و برکات سے محروم ہیں۔ کوفہ آپ کے باپ اور بھائی کا مرکز ہے۔ معاہدہ کی رو سے آپ نظام حکومت چلانے کے حق دار ہیں لہٰذا جلد تشریف لائیے اگر دیر کی تو موقع ہاتھ سے نکل جائے گا۔ اور آپ اللہ کے سامنے مسئول ہوں گے۔

جب حرمت کعبہ خطرہ میں آگئی تو آپ نے یہی طے کیا کہ کوفہ والوں کی درخواست قبول کرکے مکہ کو خالی کر دینا چاہیئے مگر ازراہِ احتیاط مسلم بن عقیل کو سفیر بنا کر پہلے روانہ کر دیا۔ اور تاکید کر دی کہ کوفہ جا کر وہاں کے حال دیکھو اور مجھے اطلاع دو۔ یہ صحیح ہے کہ کوفہ کی وفاداری ہمیشہ مشکوک رہی ہے۔ وہ وعدوں میں حاتم[1] اور ان کے ایفا میں عرقوب[2] رہے ہیں۔ مگر حالات و واقعات کا جائزہ لے کر بتایئے کہ اس صورت میں امام حسین علیہ السلام کے لئے چارۂ کار کیا تھا۔ موت چاروں طرف منڈلا رہی تھی۔ دشمن ہر طرف سے گھیرے ہوئے تھے جدھر جاتے ادھر حکومت کے کارندے آپ کے درپے آزار ہوتے کوفہ جانے کی صورت میں بہر حال یہ اُمید تھی کہ کامیابی کی راہ نکل سکتی ہے۔ مایوسیوں کی گھنگھور گھٹا میں امید کی اس کرن کو حسینؑ نے اگر سہارا بنایا تو کیا غلطی کی۔

دیکھئے: اب حسینؑ مکے سے نکل رہے ہیں۔ وادی غربت میں قدم رکھ رہے ہیں۔ یار و انصار اعزا و اقربا سے کہہ رہے ہیں کہ میں کسی ملک کے فتح کرنے کیلئے نہیں کسی بادشاہی کی امید میں۔ کسی لوٹ مار کی غرض سے سفر نہیں کر رہا۔ بلکہ میں نے خواب میں اپنے نانا کو دیکھا ہے۔ فرما رہے ہیں کہ "اے حسینؑ موت کی طرف بڑھو اور اپنے اہل حرم کو بھی ساتھ لے جاؤ۔ کہ مشیتِ ایزدی یہی ہے کہ تم اور تمہارے یار و انصار شہید ہوں اور عورتیں بندی بنائی جائیں"۔

ساتھیوں سے فرما رہے ہیں" تم اپنے آپ کو خطرہ میں نہ ڈالو۔ اپنی اچھی بھلی جانوں

[1] عرب کے مشہور سخی　[2] عرب کا بدنام جھوٹا

کو مصیبت میں نہ ڈالو۔ مجھ کو تنہا سفر کرنے دو۔" اب جو لوٹ مار کے خواہاں تھے۔ ان کے قدم ڈگمگا گئے جو شریکِ سلطنت بننے کے لئے ساتھ ہو لیے تھے وہ بہانے کر کے رخصت ہونے لگے مگر جنھوں نے امام حسینؑ کے ساتھ زندہ رہنے اور ان کے ساتھ مرنے کی ٹھانی تھی۔ وہ اب بھی جمے رہے۔ منزلیں آئیں اور گئیں۔ اور اب یہ قافلہ مکّہ سے بہت دور نکل گیا۔ راستے میں کوفیوں کی بدعہدی کی خبر بھی ملی۔ مسلم بن عقیلؑ کے قتل ہونے کی اطلاع بھی سنی مگر قدم آگے ہی کی طرف بڑھتا رہا لوٹتے تو کدھر جاتے؟ اور پلٹتے تو کہاں پناہ لیتے؟

مسلم بن عقیلؑ کی سنائی آئی تو دوستوں اور عزیزوں کو جمع کیا۔ کوفہ کے حالات سنائے اور پوچھا "اب تم لوگوں کی کیا رائے ہے۔" "آگے بڑھیں یا یہیں سے لوٹ چلیں" ابھی کسی نے جواب نہیں دیا تھا کہ مسلمؑ کے فرزند کھڑے ہوتے اور کہنے لگے "ہم تو باپ کے خون کا بدلہ لیے بغیر کہیں نہ جائیں گے۔" امام عالی مقامؑ نے فرمایا۔ "ان بہادروں کو چھوڑ کر اب ہم کہاں جا سکتے ہیں۔"

شب و روز گزر رہے ہیں۔ قافلہ آگے بڑھتا جا رہا ہے۔ کوفہ میں گورنری اب عبیداللہ ابن زیاد کے ہاتھ میں ہے۔ اس نے شہر میں مارشل لا جاری کر دیا ہے۔ مکّہ سے آنے والی راہوں پر پہرے بٹھا دیتے ہیں۔ ہر طرف منادی کرادی ہے کہ جو فرزندِ رسولؐ سے محبت کا اظہار کرے گا۔ وہ حکومت کا باغی سمجھا جائے گا۔ اس کی جاگیر ضبط ہوگی اور مکان کھدوا کر پھینک دیا جائے گا۔ لوگ ڈر کے مارے گھروں میں چھپے ہوئے ہیں اور ابن زیاد کے ظلم و ستم سے تنگ ہیں دوسری طرف حبیب ابن مظاہر مسلم بن عوسجہ، بریر ہمدانی ایسے من چلے بھی ہیں جو جان پر کھیل کر فرزندِ رسولؐ کی حمایت کے لئے نکل کھڑے ہوئے ہیں۔

اب امام عالی مقامؑ اس منزل پر پہنچ گئے جہاں حُر کے رسالے نے آپ کو محاصرہ میں لے لیا ہے اور ابن زیاد کی طرف سے یہ حکم سنایا ہے کہ اب آپ اپنی مرضی سے کسی طرف نہیں جا سکتے۔ لیکن امام حسینؑ نے نہ مانا۔ اور بالآخر یہ طے ہوا کہ

نہ آپ مکّے واپس جائیں نہ کوفہ کی طرف بڑھیں بلکہ کوئی درمیانی راہ اختیار کریں۔

یہ درمیانی راستہ فرزندِ رسولؐ کو کربلا کی سرزمین پر لے آیا۔ نہرِ فرات کا خنک و خوشگوار پانی موجیں مار رہا ہے۔ ایک طرف ہری بھری کھیتیاں نظر آ رہی ہیں۔ دوسری طرف قبیلہ بنی اسد کے افراد خیمہ زن ہیں۔ امام حسین علیہ السلام اس سرزمین کو پسند فرماتے ہیں۔ اور نہر کے کنارے پڑاؤ ڈالنا چاہتے ہیں۔ مگر حُر کا رسالہ مانع ہوتا ہے اور رفع شر کے لئے امام عالی مقامؑ نہر سے ہٹ کر خیمے نصب کراتے ہیں۔ غنیم کی فوجی طاقت اس وقت تک زیادہ نہ تھی۔ امام حسین علیہ السلام اگر چاہتے تو فیصلہ کن جنگ کر سکتے تھے۔ مگر آپ تو صلح و صفائی کے خواہاں تھے۔ اور امن پسند شہری کا صحیح کردار ادا کر رہے تھے تاکہ دنیا آپ کی ذات و صفات سے سبق لے اور منظم حکومتوں کے زیرِ سایہ زندگی گزارنے کے طریقے سیکھے۔

دنیا جانتی ہے کہ حضرت عباسؑ کا جوان خون کھول گیا۔ دوسرے ساتھیوں نے بھی اصرار کیا۔ کہ آپ کو نہر کے کنارے سے ہٹانے کی جرأت کر کے حُر کے رسالے نے خطرہ کا الارم بجا دیا ہے۔ اب لڑنے میں دیر نہ کیجئے۔ اس مختصر سے رسالے کو مار بھگانا آسان ہے۔ کل سے کمک آنی شروع ہو جائے گی۔ اور پھر مقابلہ سخت ہوگا۔ مگر آنحضرت رحمۃ اللعالمینؐ کے نواسے تھے۔ وہ اپنی طرف سے جنگ میں پہل کرنا نہ چاہتے تھے۔ انہوں نے مصالحانہ رویہ اختیار کیا اور نہر کا کنارہ چھوڑ کر ہٹ گئے محرم کی تاریخیں تیزی سے گزرتی گئیں۔ اور کمک آنی شروع ہوئی۔ ۹ محرم تک میدانِ جنگ سپاہیوں سے بھر گیا۔ ادھر ۷۲ پیاسے گلے تھے جو کٹنے کے لئے تیاریاں کر رہے تھے۔ ادھر ہزاروں شمشیر بکف سپاہی تھے۔ جو اپنے نبیؐ کے نواسے کا خون بہانے کے لئے آمادہ تھے۔ ساتویں تاریخ سے پانی بند ہوا۔ بچے، جوان، بوڑھے، عورت و مرد پیاس سے جاں بلب ہوگئے۔ مگر ان کے حال زار پر کسی نے رحم نہ کھایا نو محرم کی رات عبادت میں گزری، دسویں کی صبح موت کا پیغام اور قتل کا اعلان لے کر آئی۔

امام حسین علیہ السلام نے جنگ کو ہر طرح ٹالنے کی کوشش کی، عمر سعد
...ں کوشاں تھا کہ یہ کلنک کا ٹیکہ اس کے ماتھے پر نہ لگے۔ مگر شمر ذی الجوشن نے
...بید اللہ ابن زیاد کو یہ پٹی پڑھائی کہ حسینؑ خدا جانے کس طرح اس لق و دق بیابان
...ں گھر گئے ہیں۔ اب اگر نکل گئے تو پھر کہیں ہاتھ نہ آئیں گے۔

عبید اللہ ابن زیاد نے قاصد پہ قاصد دوڑائے اور عمر سعد سے کہا کہ فرزندِ رسولؐ
...تل کرنے میں جلدی کرو۔ تاکہ حکومت چین سے بیٹھے۔ اور دوسرے امور کی طرف توجہ
...ے۔ بالآخر عمر سعد کو لڑائی شروع کرنی پڑی۔ اور اس کے ہولناک نتائج آج تک
...درد مند دل کو خون کے آنسو بہانے پر مجبور کر رہے ہیں۔

کافی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے:-

قَالَ امیرالمومنین علیہ السلام اَوَّلُ مَا یُبْدَأُ بِہٖ
...الْاٰخِرَةِ صَدَقَةُ الْمَآءِ یعنی الْاَجْر۔

...حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن جب اعمال کا بدلہ
دیا جانے لگے گا۔ تو ابتداء اس شخص سے کی جائے گی۔ جس نے دنیا میں
کسی کو پانی پلایا ہوگا"

...جعفر صادق علیہ السلام کا خود یہ قول ہے۔

اَفْضَلُ الصَّدَقَةِ اِبْرَادُ کَبِدٍ حَرّٰی "سب سے بہتر خیرات
...ہے کہ آدمی کسی جلے بھنے جگر کو ٹھنڈا کر دے، یعنی پیاسے کو پانی پلا دے"

ایک مرتبہ امام جعفر صادقؑ سفر فرما رہے تھے، دھوپ کا وقت تھا۔ لُو چل
...تھی۔ سامنے دیکھا کہ کوئی آدمی بے ہوش پڑا ہے۔ اپنے ساتھی سے کہا۔ "اس
...کی خبر لو۔ شاید پیاس کے مارے نڈھال ہے۔" ساتھی آگے بڑھا تو دیکھا کہ
...نصرانی ہے جو پانی نہ ملنے کی وجہ سے بے ہوش ہو گیا ہے۔ واپس آکر حضرت کو
...ی۔ فرمایا جلد جاؤ۔ اس کو پانی پلا کر ہوش میں لاؤ۔ ساتھی نے کہا۔ حضرت
...پر آپ احسان فرما رہے ہیں۔ وہ مسلمان نہیں نصرانی ہے۔

فرمایا: پیاس سے جان بلب ہے، پانی نہ ملنے کی وجہ سے مر رہا ہے، یہاں نصرانی اور مسلمان کا سوال نہیں انسانی جان کا بچانا واجب ہے"

اللہ اللہ جس اسلام کی یہ تعلیم ہو کہ انسان کی جان محترم ہے اور اس کا بچانا ثواب ہے۔ اسی اسلام کے ماننے والوں نے کربلا میں فرزند رسولؐ کو تین شبانہ روز پیاسا رکھا۔ اور ان کے بچوں تک کو ایک قطرہ پانی نہ دیا۔

مقتل ابو مخنف میں لکھا ہے کہ جب پیاس کی شدت بڑھتی تو حضرت فوجِ مخالف سے فرماتے ہیں:-

یَاقَوْمُ هٰذَا مَاءُ الْفُرَاتِ یَلُوْحُ کَاَنَّهٗ بُطُوْنُ الْحَیَّاتِ یَشْرَبُهُ الْیَهُوْدُ وَالنَّصَارٰی وَالْکِلَابُ وَالْخَنَازِیْرُ وَاٰلُ رَسُوْلِ اللّٰهِ یَمُوْتُوْنَ عَطَشًا۔

(اے قوم یہ نہر فرات کا پانی اس طرح چمک رہا ہے جیسے اژدھوں اور سانپوں کے پیٹ چمکا کرتے ہیں یہود، نصاریٰ، کتے اور سور سب ہی اس سے سیراب ہو رہے ہیں۔ مگر کیا قیامت ہے، کہ رسولِ خدا کی اولاد پیاسی مر رہی ہے۔)

کسی شاعر نے کہا ہے:-

لَمْ اَنْسَ سِبْطُ الْمُصْطَفٰی وَهُوَ ظَامِیٌ
یُذَادُ مِنَ الْمَاءِ الْمُبَاحِ وَیُحْرَمُ

"مجھے سبطِ رسولؐ کا وہ حال ہمیشہ یاد آتا ہے کہ وہ پیاس سے نڈھال تھے اور وہ پانی جو سب کے لئے مباح تھا، ان پر بند کر دیا گیا تھا"

وَقَدْ صُرِعَتْ اَنْصَارُهٗ وَهُوَ مُفْرِدٌ
یُنَادِیْ اَلَا هَلْ رَاحِمٌ یَتَرَحَّمُ

"ان کے یاور و انصار کی لاشیں ان کے گرد بکھری پڑی تھیں اور وہ خود یکہ و تنہا کھڑے تھے اور فریاد کر رہے تھے۔ کہ کوئی رحم دل ایسا ہے۔ جو ہمارے حال پر رحم کرے؟"

فَقَالُوْا لَہٗ اِنْ شِئْتَ تَرْجِعُ سَالِمًا
وَتُسْقٰی مِنَ الْمَاءِ الزُّلَالِ وَ تُطْعَم

"وہ اشقیا کہنے لگے کہ اے حسینؑ! اگر آپ چاہتے ہیں کہ صحیح سالم واپس جائیں اور صاف پانی اور عمدہ کھانا میسّر آجائے۔"

فَبَایِعْ بِطَوْعٍ لِلْاَمِیْرِ مُسَالِمًا
وَاِلَّا فَحَدُّ السَّیْفِ فِیْکَ مُحَکَّمٗ

"تو برضا و رغبت حاکم کی بیعت کر لیجئے، ورنہ تلوار کی دھار آپ کے معاملات کا فیصلہ کرے گی۔"

فَقَالَ لَھُمْ لَا تَزْعُمُوْنَ بِاَنَّنِیْ
اُبَایِعُ رَھْبًا خِیْفَۃَ الْمَوْتِ فَاعْلَمُوْا

(بیعت کا نام سن کر حضرت کو جلال آگیا) اور فرمانے لگے۔ یہ نہ سمجھو کہ میں موت سے ڈرتا ہوں اور خوف کے مارے بیعت کر لوں گا۔ سمجھ لو کہ۔

وَمَا ھِیَ اِلَّا سَاعَۃٌ ثُمَّ اَلْتَقِیْ
بِجَدِّیْ وَ اُحْظٰی بِالْجِنَانِ وَاَنْعَمٗ

"بھوک اور پیاس کی یہ شدّت تھوڑی دیر رہے گی پھر میں اپنے جدِّ امجد سے جا ملوں گا، اور وہاں کی نعمتوں سے بہرہ اندوز ہوں گا۔"

فَصَالَ عَلَیْھِمْ صَوْلَۃً عَلَوِیَّۃً
فَکَانُوْا کَضَانٍ صَالَ فِیْھِنَّ ضَیْغَمٗ

"اس کے بعد آپ حیدری انداز سے ان پر حملہ آور ہوئے اور وہ لوگ مثل بھیڑ بکری کے ہوگئے جن پر شیر نے حملہ کیا ہو۔" مگر تین روز کا بھوکا پیاسا کب تک لڑتا، آخر اشقیاء کے ہجوم اور زخموں کی شدّت نے زمین پر گرا دیا۔

فِدَاکَ رُوْحِیْ یَا حُسَیْنُ وَعِتْرَتِیْ
وَاَنْتَ عَفِیْرٌ فِی التُّرَابِ جَدِیْلٗ

"اے حسینؑ میں اور میری اولاد آپ پر فدا ہو کہ آپ زمینِ کربلا پر لوٹ رہے تھے۔"

وَجِسْمُکَ عُرْیَانٌ طَرِیْحٌ عَلَی الثَّرٰی
عَلَیْکَ خُیُوْلُ الظَّالِمِیْنَ تَجُوْلُ

"آپ کا جسم مبارک عریاں تھا۔ (کہ ظالم سب لباس اتار کر لے گئے تھے) اور جلتی خاک پر پڑا تھا، اور ظالموں کے گھوڑے اس کو پامال کر رہے تھے۔"

آٹھویں مجلس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی اشرف الانبیاء والمرسلین وآلہ الطیبین الطاہرین۔ اما بعد فقد قال اللہ تعالیٰ فی کتابہ المجید وفرقان الحمید ۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِھدِنَا الصِّرَاطَ المُستَقِیمَ صِرَاطَ الَّذِینَ اَنعَمتَ عَلَیہِم غَیرِ المَغضُوبِ عَلَیہِم وَلَا الضَّالِّینَ ۰

اللہ تعالیٰ نے جو دعا ہم کو تعلیم کی ہے اور جس کو ہم شب و روز نمازوں میں دہراتے ہیں وہ یہ ہے :-

(اے خدا ہم کو سیدھے راستے پر قائم رہنے کی توفیق دے، ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا ہے۔ نہ (ان لوگوں کا راستہ) جن پر غضب نازل ہوا ہے اور نہ گمراہ لوگوں کا راستہ)

ہدایت کے دو معنی ہیں "اراءۃ الطریق" (راستہ دکھا دینا) اور ایصال الی المطلوب (مطلوب و مراد تک پہنچا دینا) ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہم پر یہ احسان ہے کہ ہم راہ راست پر لگ چکے ہیں۔ اور ہماری یہ مراد بر آچکی ہے تو اب ہمارے لئے ہدایت کے تیسرے معنی ہیں اور وہ یہ کہ "ہم کو سیدھے راستے پر قائم رکھ" اے اللہ ہم کو ان لوگوں کی راہ پر لے چل جن پر تو نے اپنی نعمتیں نازل کی ہیں، جن کو تو نے انعامات سے مالا مال کیا ہے۔ نعمت سے یہاں کیا مراد ہے؟ رنگ برنگ کے پھل، مزے دار میوے کام و دہن کی تواضع کرنے والے، کھانے . . . .

تو گویا ہم نمازوں میں یہ دعا مانگتے ہیں کہ خدایا ہم کو عبداللہ کنجڑے اور لال خاں میوہ فروش کی راہ پر چلا۔

اگر نعمت سے مراد لذیذ کھانے ہیں تو پھر ہماری دعا کا مطلب یہ ہوگا۔ کہ اے اللہ! ہم کو ہوٹل والے پٹھان کی راہ دکھا جو شامی کباب، سموسے اور شیرمال بیچتا ہے۔

یہ نہ سہی تو نعمت سے مراد عمدہ عمدہ لباس اور نفیس پوشاک ہوگی۔ اس صورت میں آپ کسی بزاز یا تیار شدہ پوشاک بیچنے والے کی راہ پر چلنے کی دعائیں مانگتے ہیں۔ اور اگر نعمت سے مراد روپیہ پیسہ اور سونا چاندی ہے تو پھر آپ کی دعا کا مطلب یہ ہے کہ خدایا ہم کو برلا کے راستے پر چلا، ڈالمیا کی راہ دکھا۔ یا ہنری فورڈ اور راک فیلر کے نقش قدم پر چلا۔

آپ کہیں گے نعمت ان گھٹیا چیزوں کا نام نہیں۔ نعمت اس سامراجی قوت اور شہنشاہی جاہ و جلال کا نام ہے جو ایک دفعہ ہاتھ آجائے تو ستر پشتوں تک اُجالا کر دے۔ اس صورت میں آپ کی دعاؤں کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ ہم کو قیصر جرمنی، زارِ روس اور کسرائے ایران کی راہ پر چلا۔ منقول ہے۔ کہ کسی نے معصومؑ سے دریافت کیا۔ کہ "ثُمَّ لَتُسئَلُنَّ یَومَئِذٍ عَنِ النَّعِیم" (پھر اس دن تم سے نعمتوں کی بابت ضرور سوال کیا جائے گا) کیا مطلب ہے؟ یہ کونسی نعمتیں ہیں جنکی باز پرس قیامت کے دن ہوگی معصومؑ نے فرمایا۔ عام مسلمان اس آیت کی کیا تفسیر کرتے ہیں۔ جواب دیا گیا۔ وہ تو یہ کہتے ہیں۔ کہ روز قیامت جب تخت عدالت بچھے گا اور مخلوق کو اللہ کے دربار میں پیش کیا جائیگا۔ تو وہ ہر ایک سے یہ سوال کرے گا۔ کہ تم نے عمر بھر کیا کھایا؟ کیا پیا؟ کیا پہنا اور کیا اوڑھا؟ قیامت کے دن کا آفتاب پوری حدت اور تپش کے ساتھ چمک رہا ہوگا۔ اور مخلوق کھانے پینے کے حساب میں مصروف ہوگی۔

معصومؑ نے ارشاد فرمایا: "منعم کی یہ شان نہیں ہے کہ دے اور پھر اس کا

حساب لیتا پھرے ۔" پوچھا گیا، پھر یہ نعمتوں سے کیا مراد ہے؟ فرمایا۔ وہ نعمتیں ہم ہیں جن کی بابت روزِ قیامت سوال کیا جائے گا۔

واسبغ علیهم نعمه ظاهرة و باطنه اور اس نے ان پر اپنی نعمتیں پھیلا دی ہیں۔ جو ظاہر بھی ہیں اور باطن بھی، کھانے پینے، پہننے، اوڑھنے کی چیزیں بھی نعمت ہیں۔ لیکن ان سے بڑی نعمت سلسلۂ ہدایت ہے جس کی بدولت انسان حیوان سے ممتاز بن گیا ہے۔ دوسرے مقام پر ارشاد فرماتا ہے:۔

وَمَن یُطِعِ اللہَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللہُ عَلَیْھِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ (اور جو لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت کرتے ہیں تو ایسے لوگ ان (مقبول) لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا ہے۔ یعنی انبیاء، صدیقین شہداء اور صالحین)

تو اب واضح ہو گیا کہ جس راہ پہ چلنے کی دعائیں مانگی جاتی ہیں، وہ نبیوں کی راہ ہے۔ صدیقوں کی راہ ہے شہیدوں کی راہ اور صالحین کی راہ ہے۔ اللہ ہم سب کو ان کی راہ پر چلنے اور قائم رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔

ان آیتوں کو غور سے پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ انسان کیلئے دو راہیں کھلی ہوئی ہیں۔ ایک سیدھی راہ ہے جس پہ اللہ کے مخلص بندے چلتے رہے ہیں۔ یہ راہ آزمائشوں، مصائب و آلام، ضبط و نظم کی وادی سے ہو کر گزرتی ہے مگر یہی وہ چیزیں ہیں جو آدمی کو انسان بناتی ہیں۔ اور بالآخر نجات سے ہمکنار کر دیتی ہیں۔ انسانی فطرت کچھ کھو کر جو چیز حاصل کرتی ہے۔ اس سے اس کو قلبی اطمینان اور روحانی سکون حاصل ہوتا ہے اس کی شخصیت تکمیل حاصل کرتی ہے اور اس کو پائیدار سرور حاصل ہوتا ہے صراطِ مستقیم اس سیدھے راستے کا نام ہے جو ہے تو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز منزلِ مقصود پر پہنچنے کی سب سے نزدیک راہ یہی ہے۔ دنیا کے سارے کامیاب انسان اسی راہ سے گزرے ہیں۔ کامیاب انسانوں سے ہماری مراد بادشاہ، جرنیل،

سرمایہ دار اور شاعر نہیں ہیں بلکہ انبیاء و شہداء اور صالحین ہیں۔ جن کی ہدایت، شہادت اور نیک کرداری نے انسانی قافلے کو ترقی کے سفر میں آگے بڑھنے میں مدد دی ہے۔ اور جن کی انتھک کوششوں کی وجہ سے انسان حیوانی خصائل کا تصفیہ اور تزکیہ کر کے معراجِ انسانی پر فائز ہوا ہے۔

دوسرا راستہ بظاہر عیش و عشرت سے بھرپور نظر آتا ہے۔ مگر حیوانی جذبات کو ابھارنے اور انسانیت سوز اخلاق کے پھیلانے میں مدد دیتا ہے۔ دنیا کے سارے نیرو (NERO) ہینی بال (HANIBALL) فرعون، یزید، چنگیز اور ہلاکو اسی راہ پر چلے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ نام نہاد تاریخ نے انہی گمراہوں کا ذکر دھوم دھام سے کیا ہے۔ اور ان کی سیہ کاریوں کو خراجِ تہنیت ادا کیا ہے۔

سیدنا امام حسین علیہ السلام اور یزید بن معاویہ کی جنگ دراصل انہی دو مسلکوں کی معرکہ آرائی تھی۔ ایک طرف حسینؑ تھے جو دنیا کو صراط مستقیم کی طرف دعوت دے رہے تھے۔ وہ صراطِ مستقیم جس پر اللہ کے سارے مقرب بندے چلتے رہے ہیں اور جس نے کسی رہرو کے ساتھ آج تک دغا نہیں کی دوسری طرف یزید تھا، جو نوعِ انسانی کو نمرود، فرعون، نیرو اور ہنی بال کے راستے پر چلنے کے لئے آواز دے رہا تھا۔

کربلا کے میدان میں یہ دونوں قوتیں صف آرا ہوئیں:۔

موسیٰؑ و فرعون و شبیرؑ و یزید　　　این دو قوت از حیات آید پدید
زندہ حق از قوتِ شبیریؑ است　　　باطل آخر داغِ حسرتِ میری است

باطل نے سپاہ اور دولت کی کثرت وسائل و رسد کی وسعت کے بل بوتے پر حق کو شکست دینے کا تہیہ کر لیا ہے۔ مگر حق نے استقامت و صبر کا بے مثال مظاہرہ کر کے بتایا کہ فوجوں کی کثرت اور رسد کی فراوانی فتح و کامرانی کی ضامن نہیں ہوا کرتی۔ ہاں جس کے پاس صبر و استقامت کی دولت ہو جو مفید خلائق اور اعلیٰ مقاصد کے لئے جدوجہد کرنے کے لئے اٹھے۔ کامیابی

اس کے قدم چومتی ہے۔

فرات کے کنارے حق و باطل، صبر و ظلم نے جو یادگار مقابلہ کیا وہ دنیا کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہے۔ اکتوبر کا آفتاب پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ زمین انگارے اُگل رہی تھی۔ ایک طرف تازہ دم کوفیوں کا ٹڈی دل اُٹ کر تھا۔ جو تیر و تبر، تیغ و خنجر، نیزہ و گرز سے غرض ہر قسم کے ہتھیاروں سے مسلح تھے۔ لذیذ کھانا اور ٹھنڈا پانی افراط کے ساتھ میسر تھا۔ رسد اور کمک کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ان کے حوصلے بڑھا رہا تھا۔ خاتمہ جنگ کے بعد جاگیر، ترقی عہدہ اور ہر طرح کے انعام و اکرام کی امید تھی۔ دوسری طرف امام حسین علیہ السلام تھے جنہوں نے خود اپنے ساتھیوں کو رخصت ہونے کی اجازت دے دی تھی۔ جو صاف صاف کہہ چکے تھے کہ ہم مرنے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ اور جو ہمارے ساتھ رہے وہ یہ سمجھ لے کہ میں حق پر جان دے رہا ہوں۔ جان بوجھ کر موت کو دعوت دے رہا ہوں۔

فوج بہتر مجاہدوں پر مشتمل تھی۔ جس میں حبیب ابن مظاہر جیسے بوڑھے اور علی اصغرؑ جیسے شیرخوار بھی تھے۔ تین روز سے آب و دانہ بند تھا۔ وسائل محدود اور سامانِ حرب مختصر سا تھا۔ مگر صبر و استقامت کی دولت اور ایمان و ایقان کا سرمایہ اتنا تھا کہ حسینؑ کو اپنی فتح کا بالکل یقین تھا۔ صبح سے لے کر عصر کے وقت تک امامؑ عالی مقام تاریخ کا بے نظیر مظاہرہ دنیا کے سامنے پیش کرتے رہے۔

کہتے ہیں کہ عورتیں جذبات سے مغلوب ہو جایا کرتی ہیں مامتا کی ماری مائیں اولاد کی جان بچانے کے لئے ہر جتن کر ڈالتی ہیں۔ صبر و تحمل کی دولت ان کے پاس زیادہ نہیں ہوتی۔ جنگ کے وقت اور مصیبت کی گھڑی میں ان کا ساتھ ہونا ــ بڑا ہمت شکن ہوتا ہے۔ لیکن آیئے کربلا کے میدان میں رسولؐ کے گھرانے اور علیؑ و فاطمہؑ کے خاندان کی عورتوں کے محیر العقول کردار

کردار کا معائنہ کیجئے۔ اس فاطمی البم میں ایک دو نہیں بیسیوں مخدراتِ عصمت و طہارت کی تصویریں ہیں۔ اس مرقع میں کمسن لڑکیاں بھی ہیں۔ وہ خواتین بھی ہیں جو شباب کی منزل میں داخل ہو چکی ہیں۔ وہ مخدرات بھی ہیں جن کی عمر زندگی کی بہت سی بہاریں دیکھ کر خزاں میں داخل ہو چکی ہے۔ کچھ ہاشمی نسل سے ہیں، کچھ اس گھرانے میں بہو بن کر آئی ہیں، کچھ آلِ محمدؐ کی خدمت کے سلسلے میں ساتھ ہیں۔

اللہ اللہ اس مقدس گھرانے کی تعلیم و تربیت نے سب کو ایک سانچہ میں ڈھال دیا تھا۔ ہر خاتون ضبط و نظم کا مجسمہ اور صبر و تحمل کا مرقع بن کر رہ گئی تھی۔ نہ گھبراہٹ تھی نہ سراسیمگی، نہ پریشانی تھی نہ بدحواسی۔ سارے اہل حرم مشین کے کل پرزوں کی طرح ہم آہنگی کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ اولاد کی جان بچانے کا خیال نہ تھا۔ مصیبت سے گھبرا کر کسی طرف نکل جانے کی فکر نہ تھی ہر عورت اس خیال میں تھی کہ اپنی اولاد کو اس مقصد عظیم کی راہ میں جلد سے جلد قربان کرنے کی سعادت حاصل کرے۔

حضرت زینبؑ رات بھر عونؑ و محمدؑ کو آمادہ جہاد کرتی رہیں۔ مادر علی اکبرؑ ہم شبیہ پیغمبرؐ کو مرنے کے لئے تیار کرنے میں مصروف رہیں۔ ام کلثومؑ جو اولاد کی نعمت سے محروم تھیں اپنی طرف سے حضرت عباسؑ کو پیش کر رہی تھیں کہ بہادر عباسؑ کی قربانی امام حسین علیہ السلام کے بلند و بالا مقصد کے حصول میں ممد و معاون ہو سکے۔

اس نیلگوں آسمان کے نیچے ایسی صابر، ضابط اور عاقبت اندیش خواتین شاید ہی کبھی ایک جگہ جمع ہوئی ہوں۔

ایک طرف حضرت سکینہؑ تھیں جو اپنی کم سنی کے باوجود بچوں کے اس گروہ کی قیادت فرما رہی ہیں جن کے ہاتھ میں کوزے تھے۔ لبوں پر خشکی تھی جو زبانِ حال سے لشکر کے بہادروں کو دعوت دے رہا تھا کہ آگے بڑھو اور خیام اہلبیتؑ میں پانی لانے کا بندوبست کرو۔ مگر بچوں کے اس گروہ میں بھی یہ تنظیم

تھی اور امام عالیمقامؑ کے اعلیٰ مقاصد سے اس قدر ہم آہنگی کہ ان میں سے کسی نے بڑھ کر فوجِ مخالف کے کسی آدمی کے سامنے اپنے حالِ زار کا اظہار نہیں کیا۔ ورنہ کیا ممکن نہ تھا کہ وہ پیاس سے عاجز آکر عمرِ سعد تک پہنچ جاتے۔ اور کہتے کہ "ہم بیعت کرنے کیلئے آمادہ ہیں لاؤ ہم کو پانی کا ایک جام دے دو۔ کہ کام و دہن کو تر کرسکیں اور قلب و جگر کی آگ بجھا سکیں۔"

حضرت زینبؑ و حضرت ام کلثومؑ تو خاندانِ رسالت کی فرد تھیں ان سے آپ کو بلند سے بلند اخلاق کی اُمید ہوسکتی ہے۔ مگر امّ لیلیٰ کی تعلیم و تربیت تو دوسرے گھرانوں میں ہوئی تھی۔ مگر امام حسینؑ کے گھر کے ماحول نے سب کو ایک سانچے میں ڈھال دیا تھا۔

مادرِ علی اکبرؑ کے کردار پر غور کیجئے سکینہؑ اور علی اصغرؑ کی ماں کے حالات پر نظر ڈالئے اور سوچیئے کہ ایک مصلح اخلاق اور کردار ساز کا قرب انسانوں کے قلوب و اذہان میں کیا انقلاب پیدا کرسکتا ہے۔

کربلا کے میدان میں خاندانِ رسالت کے آئینہ میں ہم کو انسانی سیرت کے ایسے نمونے نظر آتے ہیں جس سے دُنیا بہت کچھ حاصل کرسکتی ہے۔ چھ مہینے کی عمر دیکھیئے اور علی اصغرؑ کا بہادرانہ رویہ دیکھیے تیسرا دن ہے کہ حلق سے پانی نہیں اترا، ماں کا دودھ خشک ہوچکا ہے کام و دہن کو تر کرنے کا اور کوئی ذریعہ بھی میسّر نہیں۔

جھولے میں جھول رہے ہیں اور بھوک پیاس کی شدت سے کروٹیں بدل رہے ہیں۔ جب میدان سے باپ کے استغاثہ کی آواز آئی تو اہلِ حرم نے دیکھا کہ بچّے کا اضطراب بڑھ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی غیبی طاقت ان کو حالات کی نزاکت سے خبردار کررہی ہے۔ اور وہ اپنے باپ کی مدد کے لئے بے تاب ہیں اتنے میں درِ خیمہ پر حسینؑ کا گھوڑا آکر رکا۔ اور آپ نے بلند آواز سے کہا۔

یَازَیْنَبَ وَاُمَّ کُلْثُومْ یا سَکِیْنَہ و رباب عَلَیْکُنَّ مِنِّی السَّلَامُ

"زینبؑ، ام کلثومؑ، سکینہؑ اور ربابؑ ہم سلام رخصت کے لئے آئے ہیں۔"

یہ آواز سنتے ہی اہل حرم بے چین ہوکر درِ خیمہ پر پہنچے اور امام حسین علیہ السلام کو ساتھ لے کر اندر داخل ہوئے۔ جھولے کے قریب سے گزرے تو دیکھا۔ شیرخوار کی حالت خراب ہے۔ پیاس کے مارے زبان منہ سے باہر نکل آئی ہے۔ اگر کچھ دیر اور پانی نہ ملا۔ تو تڑپ تڑپ کر دم نکل جائے گا۔ امام عالیمقامؑ نے مادرِ علی اصغرؑ سے کہا۔ "لاؤ اس نونہال کو ہمیں دے دو۔ ہم اسکو میدان میں لے جائیں اور فوجِ مخالف سے پانی طلب کریں۔ شاید کسی کو رحم آجائے" مادرِ علی اصغرؑ کو کیا عذر ہوسکتا تھا۔ امام حسین علیہ السلام نے علی اصغرؑ کو گود میں لیکر عبا کے دامن میں چھپالیا۔ تاکہ سورج کی تمازت اس غنچہ دہن کو کُملا نہ دے۔ سامنے نہرِ فرات موجیں مار رہی ہے۔ کوفی سیاہ اس کے کنارے صف آرا ہے امام عالی مقامؑ بچے کو ہاتھوں پر اٹھاتے ہیں اور صفوں کی طرف رُخ کرکے کہتے ہیں۔ "یہ چھوٹا سا بچہ علیؑ ہے، چھ مہینے کی جان تین روز سے پیاسی ہے۔ اس مجمع میں کوئی صاحبِ اولاد ایسا ہے جو اپنے نبیؐ کے گھرانے کے اس گُلِ تازہ پر رحم کھائے اور چند قطرے پانی پلا دے۔"

امام حسین علیہ السلام کی یہ اپیل کسی دوسرے مجمع میں کی جاتی تو لوگ بے چین ہو جاتے اور مشکیں لے کر دوڑتے مگر یہ انسانوں کی نہیں شقی القلب درندوں کی بھیڑ بھاڑ تھی۔ پھر بھی صفوں میں ایک برہمی سی پیدا ہوئی۔ لوگ ایک دوسرے سے کہنے لگے "مانا حسینؑ خطاوار ہیں۔ انہوں نے بادشاہ وقت پر خروج کیا ہے۔ مگر اس ننھے سے بچے کا کیا قصور ہے۔ ہم میں سے بہت سے آدمی اولاد والے ہیں، اپنے اپنے دلوں پہ ہاتھ رکھ کر غور کرو کہ اولاد کی محبت کیا ہوتی ہے۔ ہم سے تو نہ ہوسکے گا، کہ ایسے معصوم پر ہاتھ اٹھائیں۔"

شمر نے دیکھا کہ فوج کے تیور بدل رہے ہیں اور امام حسین علیہ السلام کا یہ تیر کارگر ہونے کو ہے۔ تو اس نے جلدی سے حرملہ کو پکارا۔ تو کہا کرتا تھا کہ میں بلا کا تیر انداز ہوں۔

تیر اکمال کس دن کام آئے گا۔ دیکھتا نہیں ہے، فوج اس چھوٹے سے بچے کی پیاس سے متاثر ہو چلی ہے۔ ایک تیر کمان پر چڑھا اور اس بچے کو باپ کی آغوش میں موت کی نیند سلا دے۔"

ہاں اے عزادارانِ حسینؑ احرملہ جیسا کہنہ مشق تیر انداز کمان اُٹھا رہا ہے۔ لو وہ کمان سے ایک تیر چلا۔ اور زن زن کی آواز بتا رہی ہے کہ وہ صفوں کے درمیان کا فاصلہ طے کر کے امام حسینؑ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ غور سے دیکھئے تیر معصوم بچے کے حلق میں پیوست ہو گیا اور خون کا پرنالہ بہہ نکلا۔ اب ننھا سا کرتہ خون سے لال ہے۔ اور معصوم کو حسینؑ نے سینے سے لگا لیا ہے شاید زخمی علی اصغرؑ نے دم توڑ دیا۔ ان کے روح و تن میں جدائی ہو گئی۔ امام حسینؑ کبھی بچے کو دیکھتے ہیں کبھی خیمہ کی جانب نظر ڈالتے ہیں۔ اب آیئے خود امام علیہ السلام کی زبان سے ان کی دردناک حالت کا مرثیہ سنیئے:۔

شِیْعَتِیْ مَا اِنْ شَرِبْتُمْ مَاءَ عَذْبٍ فَاذْکُرُوْنِیْ
اَوْ سَمِعْتُمْ بِغَرِیْبٍ اَوْ شَہِیْدٍ فَانْدُبُوْنِیْ

"اے میرے شیعو اور دوستو جب کبھی تم کو سرد و شیریں پانی میسر آ جائے۔ تو مجھے اور میری پیاس کو ضرور یاد کر لینا، اور جب سنو کہ کوئی پردیسی مصیبت میں گرفتار ہوا اور بے جرم شہید کیا گیا۔ تو میری غربت اور شہادت پر ضرور دو آنسو بہا لینا۔"

لَیْتَکُمْ فِیْ یَوْمِ عَاشُوْرَا جَمِیْعًا تَنْظُرُوْنِیْ
کَیْفَ اَسْتَسْقِیْ لِطِفْلِیْ فَاَبَوْا اَنْ یَرْحَمُوْنِیْ

"کاش روز عاشور تم سب موجود ہوتے اور دیکھتے کہ میں نے اپنے ننھے سے بچے کے لئے کس طرح سوالِ آب کیا، مگر ان ظالموں نے میرے حال پر رحم کرنے سے انکار کر دیا۔"

وَسَقَوْہُ سَہْمَ بَغْیٍ عِوَضَ الْمَاءِ الْمَعِیْنِ
یَا لَرُزْءٍ وَمُصَابٍ ھَدَّ اَرْکَانَ الْحَجُوْنِ

"آہ پانی کے بدلے اس شیر خوار کو تیر کا نشانہ بنایا، پس یہ مصیبت وہ ہے کہ جس کے غم میں پہاڑ بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ گئے۔"

نویں مجلس

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی اَشْرَفِ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ وَاٰلِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاھِرِیْنَ۔ اَمَّا بَعْد فَقَدْ قَالَ اللّٰہُ سُبْحَانَہٗ تَعَالٰی فِیْ کِتَابِہِ الْمَجِیْدِ وَفُرْقَانِہِ الْحَمِیْد

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ ط بَلْ اَحْیَاءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ

دنیا کی ہر چیز کی طرح انسان بھی فانی ہے۔ پیدا ہوتا ہے تو کس قدر خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ بچپن کس لاڈ پیار کے ساتھ گزرتا ہے۔ بھولی بھالی صورت اور توتلی باتوں پر سارے عزیز جان نچھاور کرتے ہیں۔ یوں ہی گودوں میں پلتا اور آغوشوں میں مچلتا ہوا بڑا ہو جاتا ہے۔ لڑکپن جوانی کی سرحد میں قدم رکھتا ہے اور بچپن شباب کی رعنائیوں سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔ بہت سے تو لڑکپن ہی میں اللہ کو عزیز ہو جاتے ہیں، کچھ جوانی کی بہاریں دیکھ کر دوسری دنیا کا راستہ لیتے ہیں، کچھ ایسے بھی ہیں جو بڑھاپے کی صعوبتیں اٹھا کر جان دیتے ہیں۔ مگر موت سب کو آتی ہے اور فنا کے گھاٹ اتر کر آدمی نسیاً منسیاً ہو جاتا ہے۔ لیکن ارشاد باری تعالےٰ ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوتے ہیں۔ ان کو مردہ نہ کہو وہ زندہ ہیں، اگرچہ تم کو ان کی زندگی کا شعور نہیں ہوتا۔ فنا کے تین طریقے ہیں۔ ایک ہلاکت، دوسرے طبعی موت، تیسرے شہادت۔

جب کوئی جاندار چیز کسی بلند مقصد کے لئے جان دیتی ہے۔ اپنے سے مافوق کے لئے قربان ہو جاتی ہے، تو اس کے لئے ترقی کے دروازے کھل جاتے ہیں جمادات پر نظر ڈالئے۔ مٹی اور اس کے مختلف اجزاء جب نباتات کی قربان گاہ پر نثار ہو جاتے ہیں تو فنا کے بجائے بقا حاصل کرتے ہیں۔ اور نباتات کے جزو بدن ہو کر ایک برتر قسم کی زندگی حاصل کرتے ہیں۔

جمادات کے وہ اجزاء جو کل تک بے حس و حرکت تھے، جن میں نشو و نما کی قوت نہ تھی، آج پودے کے روپ میں سرسبزی اور شادابی سے بھرپور ہیں۔ ہوا کے تازہ جھونکوں کے ساتھ جھول رہے ہیں اور ہر آن و ساعت نشو و نما پا رہے ہیں۔ دن میں آفتاب عالمتاب کی کرنیں ان کے اندر رنگ بھرتی ہیں۔ اور آخر شب شبنم ان کا منہ دھلانے آتی ہے۔ اگر وہ اجزاء نباتات کے لئے وقف نہ ہو جاتے اور اپنے سے مافوق کی راہ میں قربان نہ ہوتے۔ تو یا ہلاک ہو جاتے یا طبعی موت مر جاتے اور جولانگاہِ حیات میں ان کو ترقی کا موقع نہ ملتا۔ جب فنا لازمی ہے۔ اور ایک نہ ایک دن موت کے گھاٹ اترنا ہے تو مرتبہ شہادت پر فائز ہونا چاہیئے۔ اور اعلیٰ مقاصد کی راہ میں قربان ہو کر حیاتِ جاوید حاصل کرنا چاہیئے

حیوان روز مرتے ہیں، ہر آن فنا کے گھاٹ اترتے ہیں، مگر جو انسان کی خاطر جان دیتے ہیں۔ ان کا گوشت ارتقائی منزل پر فائز ہوتا ہے۔ اور انسان کے جسم کا جزو بن کر ایک اعلیٰ قسم کی زندگی حاصل کرتا ہے۔

اپنے سے ادنیٰ کی راہ میں مرنا ہلاکت ہے۔ طبعی موت ناگزیر سی چیز ہے اس میں ہمت و جرأت اور اولوالعزمی کے اظہار کا موقع ہی نہیں۔ یہ میدان شہادت ہی ہے جہاں جوہر کھلتے ہیں اور کھوٹے کھرے کا فرق ظاہر ہوتا ہے۔

انسان نقاشِ ازل کا شاہکار ہے۔ اور صانع مطلق کا بہترین کارنامہ ہے۔ اس کا کمال یہی ہے کہ ہلاکت سے بچے (لاتلقوا بایدیکم الی التھلکہ) اور بستر پر پڑے پڑے آنے والی طبعی موت پر قناعت نہ کرے بلکہ زندگی بھر بلند

مقاصد کے حصول کے لئے جدوجہد کرتا رہے۔ اور جس طرح بن پڑے مرتبہ شہادت پر فائز ہو کہ قوموں کی سربلندی اور افراد کی کامرانی کا یہی واحد ذریعہ ہے۔

لوگ آئے دن قتل بھی ہوتے ہیں، مارے بھی جاتے ہیں۔ مگر ہر قتل شہادت نہیں ہے۔ شہید وہ ہے جو راہِ خدا میں قتل ہو۔ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے جان دے۔ لاکھوں آدمی مال کی خاطر جان دیتے ہیں۔ ہزاروں جمال پر مرمٹتے ہیں۔ بہت سے ہیں جو عہدہ کے بھوکے ہیں، شہرت اور نام و نمود کی خاطر جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ مگر ہر قتل بقائے دوام کا ضامن نہیں۔ نہ ہر جان دینے والا "شہید" ہوتا ہے۔ شہادت کے حدود کربلا والوں نے متعین کر کے دکھائے ہیں۔ اور بقائے دوام کی رہنمائی حسینؑ اور ان کے ساتھیوں نے کی ہے

ہاں ہاں اے عزادارانِ حسینؑ! محرم کی نویں تاریخ کا اپنے دل میں تصور کیجئے —— جب آپکے امام مظلومؑ چاروں طرف سے گھِر گئے تھے۔ جب راہ چارہ کار بند ہو گئی تھی تو عشاء کی نماز کے بعد آپ نے اپنے ساتھیوں کو جمع کیا اور تقریر میں ارشاد فرمایا۔ "کہ میں تمہاری گردنوں سے اپنی بیعت اٹھائے لیتا ہوں۔ جس کا دل چاہے۔ اس رات کے پردے میں نکل جائے۔ بلکہ ممکن ہو تو میرے عزیزوں کو بھی اپنے ساتھ لے جائے۔ کل قیامت کا دن ہوگا "تلوار سے تلوار اور نیزے سے نیزہ ٹکرائے گا تیروں کی بارش سے خون کے نالے بہنے لگیں گے اس لئے اپنے حال پر رحم کرو اور مجھے میرے حال پر چھوڑ کر امن کی طرف نکل جاؤ۔ مگر اللہ اللہ وہ لوگ کیسے بہادر تھے، کتنے وفادار تھے کہ امام کا ساتھ نہ چھوڑا۔ بلکہ بعض نے کھڑے ہو کر کہا کہ "مولا! اگر آپ کے ساتھ ستر بار بھی قتل ہوں تو یہی آرزو رہے گی کہ پھر ایک بار قدموں پر جان نثار کرنے کی سعادت حاصل کریں"

سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک طرف تو یہ خبر ملی ہے کہ "تاسوعا یوم حوصر فیہ الحسین" نویں تاریخ امام حسینؑ ہر طرف سے گھِر گئے تھے، اور دوسری طرف حسینؑ یہ فرما رہے ہیں۔ "راستہ کھلا ہے، تم میں سے جو چاہے جان بچا کر نکل جائے"

یہ دونوں باتیں کیوں کر یکجا ہو سکتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کمک کی غرض سے آنے والوں کے لئے راہیں بند تھیں، مگر حسینؑ کا ساتھ چھوڑ کر نکل جانے والوں کے لئے راستہ کھلا ہوا تھا۔ دنیا ہمیشہ ان بھوکے پیاسے بہادروں کا نام عزت سے لیتی رہے گی کہ انہوں نے بلند مقاصد کے سامنے جان کی پرواہ نہ کی۔ اور اپنے امام، قائد اور رہنما کی حمایت کے لئے جم کر لڑے۔ امام عالی مقامؑ پوری تاریخ پر ذمہ دارانہ نظر ڈال کر فرماتے ہیں:۔

واللہ لا اعلم اصحابًا اوفیٰ من اصحابی۔

"خدا کی قسم میرے اصحاب سے زیادہ کسی کے اصحاب وفادار نہیں تھے۔"

حضرت موسیٰ کے ساتھیوں سے یہ ممکن تھا کہ وہ یہ کہدیں کہ آپ اور ہارون اقدام کریں۔ ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔ عیسیٰ کے حواریوں سے یہ ہو سکتا تھا کہ وہ آزمائش کی گھڑی میں اپنے استاد، رہنما اور قائد کا ساتھ چھوڑ دیں۔ سیزر (CEASAR) کے دوست بروٹس (BRUTUS) کا حال سب کو معلوم ہے کہ اس نے وقت پر اپنے ساتھی کو دغا دی اور وہ Brutus thou too کہہ کر اس دنیا سے رخصت ہوا۔ اسی طرح عام تاریخ اور مسلمانوں کی تاریخ کے اوراق، ساتھیوں کی المناک غداری کے واقعات سے بھرے پڑے ہیں۔ مگر قدرت نے امام حسینؑ علیہ السلام کو ایسے اصحاب دیے تھے کہ جو مصائب کے ہجوم اور ابتلاء و امتحان کی شدت کے وقت بھی ہنسی خوشی اپنے آقا کا ساتھ دیتے رہے۔ یہ امام حسین علیہ السلام کا سلیقۂ قیادت اور حسنِ سیادت ہے کہ انہوں نے مختلف اور متضاد عناصر کو یکجا کر کے خدمتِ اسلامی کے لئے آمادہ کر دیا تھا۔ ان کی سپاہ میں عرب بھی تھے، رومی بھی تھے، ترکی بھی تھے۔ بوڑھے بھی تھے، جوان بھی تھے، بچے بھی تھے۔ اگر امام حسین علیہ السلام نے عرب نسل پرستی یا ہاشمی اور مطلبی خاندان کی برتری کے لئے یہ ہنگامہ برپا کیا ہوتا تو وہ جو عرب نہ تھے، ہاشم اور مطلب کی اولاد سے تعلق نہ رکھتے تھے کاہے کو اپنی اچھی بھلی جان کو خطرہ میں ڈالتے۔ اگر یہ معرکہ کسی خاص رنگ و روپ، آب و ہوا، ملک اور نسل کے مفاد کے

لئے ہوتا تو مختلف رنگ و روپ آب و ہوا، ملک اور نسل کے لوگ شانہ بشانہ کھڑے ہو کر آپ کی حمایت نہ کرتے۔

اگر اس لڑائی کا سرچشمہ شخصی ضد اور جوانی کی ترنگ ہوتی تو ادھیڑ اور بوڑھے جن کی سمجھ بوجھ کا مادہ پختہ ہو چکا ہوتا ہے آپ کا ساتھ نہ دیتے۔ اگر اس جنگ کا سبب وہ ذہنی کیفیت اور مزاجی حالت ہوتی جو سال خوردہ لوگوں میں پیدا ہو جاتی ہے تو جوانی کی امنگوں سے بھرپور لوگ آپ کے ہمرکاب نہ رہتے۔ واقعات کے مطالعہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ آپ کا مقصدِ شہادت اتنا بلند اور پاکیزہ تھا کہ کسی قسم کی خود غرضی، نسل پرستی، ملکی اور لونی امتیاز کی اس کو ہوا بھی نہیں لگی تھی۔

بوڑھے تول تول کر قدم بڑھاتے ہیں، جوانوں میں عجلت پسندی ہوتی ہے۔ مگر آپ کی قیادت کے کیمیاوی عمل نے جوانوں کے خون کی گرمی کو ذرا مائل بہ اعتدال کر دیا تھا اور بوڑھوں کے خون میں ذرا سی حرارت زیادہ کر دی تھی کہ دونوں ہم آہنگ اور ہم مقصد ہو کر میدانِ عمل میں آگے بڑھ رہے تھے۔

حضرت عباس علمدارؑ کی بھرپور جوانی اقدام پسند تھی۔ وہ دشمن پر چوٹ کرنے کے لئے ہر وقت آمادہ رہتے تھے مگر امام حسین علیہ السلام حسنِ تدبر سے ان کو جادۂ اعتدال سے آگے نہ بڑھنے دیتے تھے۔

امام حسین علیہ السلام کی عادلانہ قیادت نہ ہوتی تو حضرت عباسؑ کو اقدام جنگ سے کون روک سکتا تھا۔ علی اکبرؑ کے بہادرانہ حملوں، عونؑ و محمدؑ کی پرجوش یورشوں اور فرزندانِ مسلمؑ کی معرکہ آرائیوں میں اعتدال کون پیدا کر سکتا تھا۔ ہاشمی گھرانہ تلوار کا دھنی اور فن جنگ میں یکتائے روزگار تھا۔ سارا عرب ان کی شجاعت کا لوہا مانتا تھا۔ یہ تعداد میں کتنے ہی کم کیوں نہ ہوں مگر لڑنے پر آتے تو جنگ کو طول ضرور دے سکتے تھے۔ لیکن صبح سے لے کر سہ پہر تک ساری لڑائی کا ختم ہو جانا اسی سمجھی بوجھی اسکیم کے تحت میں تھا جو امام حسین علیہ السلام نے اپنے نانا، باپ اور ماں کی تعلیم کے مطابق پہلے سے بنا رکھی تھی۔ یعنی مادی ساز و سامان سے حاصل کی ہوئی فتح ان کا مقصد نہ تھی۔ وہ اخلاقی برتری

روحانی تفوق اور انسانی اقدار کا مظاہرہ کر کے دنیا کو بتانا چاہتے تھے کہ فتح اسکی نہیں ہوتی ہے جو چند میل زمین پر قابض ہو جاتا ہے۔ جو چند شہر فتح کر لیتا ہے، جو خزانے لوٹ کر اپنا گھر بھر لیتا ہے، جو کسی انسانی گروہ کے مردوں کو قتل اور عورتوں کو اسیر کر سکتا ہے بلکہ فتح اس کی ہوتی ہے جو بلند مقاصد لے کر اٹھتا ہے اور ہر قسم کی قربانی دے کر ان بلند مقاصد کو حاصل کر کے رہتا ہے۔

یزید امام حسین علیہ السلام سے بیعت کا طلب گار تھا۔ بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ امام حسین علیہ السلام نے بیعت سے انکار کر کے بڑا نقصان اٹھایا۔ اگر وہ یزید کے ہاتھ پر بیعت کر لیتے تو نہ گھر چھٹتا نہ قتل و غارت کا سامنا کرنا پڑتا۔ مگر غور کیجئے کہ امام حسین علیہ السلام سے بیعت طلبی کا مطلب کیا تھا؟ کیا ایک آدمی کے بیعت نہ کرنے سے یزید کی خلافت، بادشاہت، حکومت میں کوئی خلل آسکتا تھا؟ کیا جمہوری نظام میں اکثریت کے ووٹ حاصل ہونے کے بعد معدودے چند کی مخالفت کی کوئی وقعت ہوتی ہے؛ پھر یزید کو حسینؑ کے ایک ووٹ حاصل کرنے پر اس قدر اصرار کیوں تھا؟ اور حسینؑ اس قدر شدت سے اس بات پر کیوں جمے ہوتے تھے کہ میں اپنا ہاتھ بیعت کے لئے نہ بڑھاؤں گا۔

یزید، حسینؑ کو ایک فردِ اُمت کی حیثیت سے نظر انداز کر سکتا تھا۔ لیکن حسینؑ کی حیثیت اس سے زیادہ تھی۔ وہ علیؑ اور حسنؑ کے جانشین اور مسندِ رسولؐ کے وارث سمجھے جاتے تھے۔ ان کی ادنیٰ سی مخالفت مسلمانوں پر گہرا اثر ڈال سکتی تھی اور ان کی بیعت گویا حسنؑ و علیؑ اور رسولؐ کی بیعت کے مترادف تھی۔ لیکن جس بات کو یزید جانتا تھا اس سے حسینؑ بھی بے خبر نہ تھے۔ وہ خوب سمجھتے تھے کہ اگر میں بیعت کے لئے ہاتھ بڑھا دوں تو یزید کی حقانیت پر مُہر ثبت ہو جائے گی۔ اور دُنیا یہ سمجھنے لگے گی کہ جب فرزندِ رسولؐ نے یزید کی حکومت تسلیم کر لی تو اب کسی دوسرے کو انکار کی کیا مجال ہے۔

دوسرے لفظوں میں سمجھئے کہ یزید جب حسینؑ سے بیعت طلب کر رہا تھا تو دراصل

وہ اس سلسلہ عالیہ سے مہرِ تصدیق لگوانا چاہتا تھا جس نے اللہ کے مامور کے علاوہ کسی کے سامنے سر نہیں جھکایا تھا۔ اور حسینؑ جب انکار کر رہے تھے تو ان کے سامنے بھی اپنے باپ کا اسوۂ حسنہ تھا کہ حضرت عمر کی وفات کے بعد جب خلافت ان کے سامنے اس شرط کے ساتھ پیش کی گئی کہ "آپ اللہ کی کتاب، رسولؐ کی سنت اور شیخین کی سیرت پر چلیں گے۔" تو آپ نے فرمایا تھا کہ میں اللہ کی کتاب اور رسولؐ کی سنّت پر تو ضرور چلوں گا۔ مگر تیسری شرط کا اپنے آپ کو پابند نہیں کر سکتا۔ حضرت علیؑ نے اپنے اس طرزِ عمل سے یہ بتا دیا کہ صرف مامور من اللہ کا اسوۂ حسنہ ہی قابلِ تقلید ہو سکتا ہے۔ غیر مامور من اللہ کی سیرت اگر موافقِ سنّتِ رسولؐ ہے تو وہ دوسری شرط کے تحت آجاتی ہے۔ اگر خلافِ سنّت ہے تو اس پر عمل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ امام حسین علیہ السلام نے یہ دعویٰ نہیں کیا تھا کہ ان کا بدن لوہے کا ہے اور تیر و تبر، اور نیزہ و خنجر اس پر اثر نہیں کرتے۔

نہ یہ کہا تھا کہ ان کی اولاد موت کی گرفت سے دُور ہے بے شک امام حسین علیہ السلام خنجر سے شہید کر دیئے گئے، ان کی اولاد بھی قتل ہو گئی، ان کے ساتھی بھی موت کے گھاٹ اُتر گئے۔ مگر اس سے یہ کہاں سے ثابت ہُوا کہ ان کی شکست ہو گئی اس لئے کہ ان کا عزمِ مصمّم تو شکست نہیں ہوا اور بیعت نہ کرنے کا جو عہد انہوں نے کیا تھا وہ تو اپنے مقام پر قائم رہا۔ یزید نے حسینؑ سے بیعت لینے کے لئے اپنی پوری قوت صرف کر دی تھی مگر وہ بیعت نہ لے سکا۔ حسینؑ نے بیعت کرنے سے جو انکار کیا تھا وہ اس پر قائم رہے۔ اب بتایئے شکست کس کی ہوئی؟ حسینؑ کی یا یزید کی؟

اور تاریخ شاہد ہے کہ حسینؑ اور حسینیوں نے انکارِ بیعت کو اس آن بان سے نبھایا کہ یزید اس مطالبہ سے دست بردار ہی ہو گیا۔ یعنی کربلا کے میدان میں عزمِ حسینی کی شان دیکھ کر اس کو جرأت نہ ہوئی کہ عابدِ بیمارؑ یا اہلِ حرم میں سے کسی کے سامنے مطالبۂ بیعت پیش کر سکتا۔ یزید ہی پر کیا موقوف ہے پھر ہر بادشاہ نے آئمہ اہل بیت کو بیعت کی دعوت دینے سے گریز کیا۔ یہاں تک کہ اب تو وہ وقت آگیا ہے کہ بادشاہ

بیعت نہیں لیتے، بلکہ بیعت اولادِ رسولؐ کے سجادہ نشینوں کا حق بن کر رہ گئی ہے۔ گویا عزمِ حسینی نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یہ بات صاف کر دی کہ بیعت اس کا حق ہے۔ جو مذہبی رہنمائی کا اہل ہو اور یہ اہلیت وصلاحیت اولادِ رسولؐ اور وابستگانِ آلِ محمدؐ کے اندر بدرجہ اتم موجود ہے۔

آپ نے امام زین العابدین علیہ السلام کی مظلومیت، صبر وتحمل اور عزم و استقلال کی داستانیں سنی ہوں گی۔ کربلا سے کوفہ تک اور کوفہ سے شام تک کس چیز نے ان کی ہمت کو بلند اور ارادے کو مضبوط رکھا۔ دمشق میں ان پر جو مصائب گزرے وہ محتاجِ بیان نہیں ہیں۔ خود فرماتے ہیں:۔

أُقَادُ ذَلِيلًا فِي دِمَشْقَ كَأَنَّنِي
مِنَ الزِّنْجِ عَبْدٌ غَابَ عَنْهُ نَصِيرُ

"آہ مجھے دمشق میں اس طرح ذلیل وخوار کر کے قید کیا گیا گویا میں کوئی حبشی غلام تھا۔ ایسا غلام جس کا کوئی ناصر و یاور نہ رہا ہو۔"

وَجَدِّي رَسُولُ اللهِ فِي كُلِّ مَشْهَدٍ
وَشَيْخِي أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ أَمِيرُ

"حالانکہ تمام عالم جانتا ہے کہ میرے جدِ امجد رسولِ خدا ہیں اور دادا امیر المومنین علیؑ ہیں۔"

فَيَا لَيْتَ لَمْ أَبْلُغْ دِمَشْقَ وَلَمْ أَكُنْ
يَرَانِي يَزِيدُ فِي يَدَيْهِ أَسِيرُ

"کاش (میں کربلا ہی میں شہید ہو جاتا) اور دمشق تک نہ پہنچتا۔ اور یزید مجھے اس حال میں اپنے سامنے اسیر بنا ہوا نہ دیکھتا۔"

دمشق بین الاقوامی شہر تھا۔ وہاں ممالکِ عالم کے سفارت خانے تھے۔ ساری مہذب دنیا کے تاجروں آتے جاتے تھے۔ اس شہر میں وحشت اور بربریت کا مظاہرہ کر کے عربوں نے اپنے آپ کو اقوامِ عالم کے سامنے ذلیل کر لیا۔ اور

ہر سفارت خانے نے اپنی حکومت کو یہ رپورٹ بھیجی کہ جو لوگ اپنے نبیؐ کی آلؑ کے ساتھ یہ سلوک کر سکتے ہیں ان کے دین و ایمان کا اللہ ہی حافظ ہے۔

ہاں دوسری طرف امام زین العابدین علیہ السلام اور ان کے اہلِ حرم کے صبر و تحمل اور عزتِ نفس کے مظاہرے سے لوگ اتنے متاثر ہوئے کہ وہ سمجھ گئے کہ حقیقی اسلام کے محافظ یہی لوگ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ روم کا سفیر جو یزید کا جاہ و جلال اور مال و منال دیکھ کر بھی ایمان نہ لا سکا تھا، مظلوم امام زین العابدینؑ کے قدموں پر گر کر مسلمان ہو گیا۔

اے طوق و رسن میں جکڑے ہوئے امامؑ!

ہم سب آپکے اندازِ تبلیغ پر نثار، کہ آپ نے قید و بند کے عالم میں بھی اسلام کی اشاعت کو ہاتھ سے نہ دیا۔ یزید نے آپ کو ذلیل کرنے کے لئے ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنائی تھیں۔ مگر وہ آپ کے جسم سے مس ہو کر عزت کا نشان بن گئیں۔ اور ان کی چھن چھن نے سوئی ہوئی روحوں کو بیدار کر دیا۔ آج بھی کہ اس واقعہ پر چودہ سو سال گزر چکے ہیں۔ شہزادے اور امیر زادے، مزدور اور محنت کش کسان اور کاشتکار آپکی یاد میں طوق و زنجیر پہنتے ہیں اور اس کو دنیا میں سرخروئی اور آخرت میں نجات کا باعث سمجھتے ہیں اور یزید کا تاج و تخت سامراجی لعنت اور شہنشاہی پھٹکار سمجھا جاتا ہے اور ہر کہ ومہ اس سے نفرت کرتا جاتا ہے۔

آپ کے گھرانے نے باطل سے بیعت نہ کرنے کا جو عزم کیا تھا وہ پورا ہو کر رہا۔ اور یزیدیت نے حسینیت کے مٹانے کی جو قسم کھائی تھی وہ پوری نہ ہو سکی۔ اس لئے اے عابدِ بیمارؑ!

فتح آپ کی ہوئی، اور یزیدیت شاہ مات کھا کر مٹ گئی۔

دسویں مجلس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی اَشْرَفِ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ وَاٰلِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاہِرِیْنَ۔ اَمَّا بَعْدُ۔ فَقَدْ قَالَ اللّٰہُ سُبْحَانَہٗ تَعَالٰی فِیْ کِتَابِہِ الْمَجِیْدِ وَفُرْقَانِہِ الْحَمِیْدِ۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ط

(میں نے جن وانس کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ عبادت کریں)

عبادت سے کیا مراد ہے؟ ہر وقت نمازیں پڑھتے رہنا؟ یا بارہ مہینے روزے رکھنا؟ کیا وہ راہب، تارک دُنیا درویش اور صوفی جو شب و روز نمازیں پڑھتا ہے، آئے دن روزے رکھتا ہے۔ مگر معاشرہ کی خدمت انجام نہیں دیتا سماج کی برکات اور خدمات کا معاوضہ ادا نہیں کرتا۔ سچ مچ خدا کا محبوب بندہ ہے۔ اور وہ لوگ جو اس کرۂ ارض کو رہنے کے قابل اور سکونت کے لائق بنانے کے لئے کوششیں کرتے ہیں اور تعاون و اشتراک کرکے نوعِ انسانی کے دکھ درد میں کمی اور سود و زیاں میں توازن پیدا کرتے ہیں راندۂ درگاہ ہیں؟

جو چیز جس غرض سے بنائی جاتی ہے اس سے وہی کام لیا جا سکتا ہے۔ آپ اس سے دوسرا کام لے ہی نہیں سکتے۔ جب انسان کی غرضِ تخلیق عبادت ہے تو وہ عبادت کے سوا دوسرا کام کس طرح کر سکتا ہے۔ گھڑی وقت بتانے کے لئے بنائی جاتی ہے آپ اس سے روٹی پکانے کا کام نہیں لے سکتے۔ ہارمونیم نغمہ آفرینی کا آلہ ہے آپ اس سے شکر نہیں بنا سکتے۔ پھر انسان عبادت کے علاوہ اور کام کس طرح کر سکتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ عبادت کا مفہوم وسیع ہے۔ اور اس کے احاطہ میں وہ تمام اعمال آجاتے ہیں جو انسان بندہ کی حیثیت سے انجام دیتا ہے۔

نماز اور بندگی، صلوٰۃ اور عبادت، پرارتھنا اور بھگتی، پریئر Prayer اور سروس Service میں فرق ہے۔ اوّل الذکر محض دعا، التماس اور التجا کا نام ہے۔ جو دن رات کے کسی حصہ میں انسان زبان و دل سے ادا کر لیتا ہے۔ اور ثانی الذکر اس مسلسل عمل اور مستقل روش کا نام ہے۔ جو انسان بحیثیت اللہ کے بندے نوکر اور عبد کے انجام دیتا ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ کا مطلب سمجھنے میں اب آپ کو آسانی ہو جائے گی۔ ارشاد ہوتا ہے کہ میں نے جن وانس کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ بندگی کے فرائض ادا کریں۔ اور میرے عبد ہونے کی حیثیت سے جو حقوق ان پر عائد ہوتے ہیں۔ ان کو خیر و خوبی سے ادا کریں۔ میں نے ہاتھ دیے ہیں اس لئے انسان کا فرض یہ ہے کہ ان ہاتھوں کو ان کاموں میں استعمال کرے جن کی میں نے اجازت دی ہے۔ جن کے کرنے کا میں نے حکم دیا ہے۔ ان کاموں میں استعمال نہ کرے جن سے میں نے روکا ہے۔ میں نے دو پیر عطا کئے ہیں۔ یہ راہِ خدا میں استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ اس سے شیطان کی راہ میں آگے بڑھنے کا کام لینا معصیت ہے۔

آنکھیں اس لئے ہیں کہ اس سے وہ مناظر دیکھے جائیں جو جائز اور مباح ہیں۔ ان آنکھوں سے ناجائز کام لینا اللہ سے بغاوت کرنا ہے میں نے کان اس لئے دیئے ہیں کہ ان سے مفید چیزیں سُنی جائیں ان کو خرافات باتوں کے لئے استعمال کرنا قوت کا بے جا استعمال ہے۔ اسی طرح خدا کی دی ہوئی زبان ہے، اس کی دی ہوئی قوتِ گویائی اسی کی راہ میں صرف ہونی چاہیئے۔ اگر زبان سے ہم غیر اللہ کی تائید کریں اور اس کی طرف سے ملی ہوئی قوت اللہ کی نافرمانی میں صرف کریں تو یہ بندگی کی شان کے منافی ہے۔

لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب ولکن

البرّ من آمن باللّٰہ والیوم الاخرہ، والملٰئکۃ
والکتٰب والنبیّین ج واتی المال علٰی حبہ ذوی
القربٰی والیتٰمٰی والمساکین وابن السبیل وفی الرقاب ج
واقام الصلٰوۃ واتی الزکٰوۃ والموفون بعھدھم
اذا عاھدو ج والصٰبرین فی الباساء والضراء وحین
الباس ط اولٰئک الذین صدقوا واولٰئک ھم المتقون ہ

"نیکی یہ نہیں ہے کہ تم اپنے منہ مشرق یا مغرب کی طرف پھرالو۔ بلکہ نیکی تو اس کی ہے جو اللہ، آخرت، ملائکہ، (آسمانی) کتابوں اور نبیوں پر ایمان لائے۔ اور اس کی محبت میں اپنا مال قرابت داروں، یتیموں، محتاجوں اور مسافروں کو دے اور غلاموں کی گلوخلاصی میں صرف کرے پابندی سے نماز پڑھے، زکوٰۃ دیتا رہے، جب کوئی عہد کرے تو پورا کرے سختی اور مصیبت کے وقت اور جنگ کے موقع پر ثابت قدم رہے، ایسے ہی لوگ صداقت شعار ہیں اور یہی لوگ پرہیزگار ہیں۔

اب اپنے معاشرہ پر نظر ڈالئے۔ کچھ لوگ تو وہ ہیں جو نماز کے پاس بھی نہیں پھٹکتے۔ ان کی حالت اس سید زادے کی سی ہے جس کی بھینس مسجد میں داخل ہوگئی تھی۔ اور جب مؤذن نے اس سے شکایت کی تو اس نے جواب دیا "جانور تھا، مسجد میں گھس گیا۔ کبھی آپ نے ہم کو بھی اپنی مسجد میں دیکھا ہے؟"

کچھ دنیا کی دوڑ میں ناکام لوگ ایسے ہیں جو شب و روز نماز، وظیفے، تعقیبات اور دعاؤں میں مصروف رہتے ہیں اور تمدنی فرائض اور عائلی ذمہ داریوں کا نام بھی نہیں لیتے۔ سچ پوچھئے تو یہ دونوں گم کردہ راہ ہیں۔ پہلے کی مثال اس گستاخ ملازم کی سی ہے جو کبھی آقا کے سلام کو حاضر نہ ہو اور مالک کے دربار میں حاضری کسر شان سمجھے۔ یا اس قدر تغافل شعار ہو کہ بھول کر بھی اس کو وہ ذات نظر نہ آئے جو اس کی روزی کی ضامن اور رزق کی کفیل ہے۔ اور دوسرے کی مثال اس چرب

زبان، لسان اور خوشامدی کی سی ہے جو اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے آقا کی خدمت میں آداب، سلام، مجرا، کورنش تو بجالاتا رہے مگر وہ کام سرانجام نہ دے جو اس کے فرائض میں داخل ہیں۔ مکمل عبد اور شائستہ بندے بننے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی وہ فرائض بھی انجام دے جو انسان کی حیثیت سے اس پر عائد کئے گئے ہیں۔ اور نماز کے ذریعہ سے آقا کے دربار میں حاضری بھی دے۔

یہ تو قیامت ہے کہ روزی تو ہم کو رحمان دے اور ہم گُن گائیں شیطان کے۔ یا روزی رساں کی وردی پہن کر اس کے احسان و فیض کا شکریہ ادا کرکے کام اس کے مخالف کا کریں۔

فرض کیجئے کہ کوئی شخص ادارہ یا حکومت امداد تو امریکہ سے لے، کہتا تو یہ پھرے کہ ہم جمہوری بلاک میں ہیں اور کام کرے روسیوں کا، روزی امریکہ سے لے اور نظر آئے روسیوں کے کیمپ میں تو ایسے شخص کا جو بھی حشر ہوگا ظاہر ہے۔ کیا آپ نے کوئی ایسا نوکر دیکھا ہے جو آقا کی مقررہ کی ہوئی وردی پہنتا ہو۔ بڑے ادب سے اس کا نام لیتا ہو۔ مگر وقت پڑنے پر اس کے حریفوں کا ساتھ دے اور اس کے مخالفوں کی مدد کرے مگر مسلمانوں میں ایک دو نہیں ہزاروں کیا لاکھوں آدمی ایسے ہیں جو منہ پر پوری ناپ کی ڈاڑھی رکھتے ہیں۔ ٹخنوں سے اونچا پاجامہ پہنتے ہیں، پیشانی پر سجدوں کا ٹریڈ مارک بھی ہے۔ ہاتھ میں موٹے موٹے دانوں کی تسبیح ہے۔ بظاہر عبادتِ مجسم نظر آتے ہیں۔ مگر عمل دیکھو تو شیطان سے بھی دو ہاتھ آگے ہیں۔ عبادت کا مطلب یہ ہے کہ آپ ہر حال میں اللہ کے قانون کی پابندی کریں۔ اس کے احکام و اوامر کو مانیں۔ اس کے بنائے ہوئے دستورِ زندگی اور بھیجی ہوئی کتاب کو واجب العمل سمجھیں اور ہر اس قانون کو توڑنے کی کوشش کریں جو قانون الٰہی کے خلاف ہو۔ آپ کی ہر نقل و حرکت، ہر جنبش ہر جد و جہد اللہ کی مقرر کردہ حدود اور قائم کردہ فصیل کے اندر رہو۔ نماز کے پانچ وقتوں کے فلسفہ پر غور کیجئے۔ رات بخیر و عافیت گزر گئی۔ صحت و توانائی کے ساتھ ہم خواب راحت سے بیدار ہوئے۔ اب منعمِ حقیقی اور حاکمِ کل کے دربار میں جاکر شب کے بخیر

گزرنے کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اور شروع ہونے والے دن کے خیریت سے گزارنے
کی دُعا مانگتے ہیں۔

صبح کی نماز ختم ہوئی اب ہم زندگی کے کاروبار میں حصہ لے رہے ہیں۔ محنت
سے روزی کمانے کے مشاغل میں مصروف ہیں۔ دوپہر کا وقت آیا تو جس طرح ہم
کھانے کے لئے وقت نکالتے ہیں اسی طرح رزاقِ مطلق کے دربار میں بھی حاضری
دیتے ہیں تاکہ اس کا شکریہ ادا کریں کہ تو نے ہم کو اپنی توفیق عطا کی کہ کام ایک مرحلہ
خیر و خوبی سے طے ہوگیا۔

کھانے کا مقدس فرض ادا کرنے کے بعد ہم پھر کاروبارِ زندگی میں لگ جاتے
ہیں اور شام کو پھر اللہ کے دربار میں حاضر ہوکر عرض کرتے ہیں کہ دن تمام ہوا۔ تیری دی
ہوئی قوت اور عطا کی ہوئی نعمتوں کی بدولت ہم کامیاب رہے۔ اب رات کا آغاز
ہو رہا ہے۔ خدایا یہ رات بھی خیر و خوبی سے بسر ہو۔ سونے کے لئے جانے سے پہلے
عشاء کا فریضہ ادا کرتے ہیں اور اللہ کا شکر کرتے ہوئے بسترِ خواب پر چلے جاتے
ہیں۔ جو لوگ انسانی نفسیات کو جانتے ہیں وہ ان وقفوں کی قدر و قیمت سے بھی واقف
ہیں جو ایک شغل کا خاتمہ اور دوسرے شغل کا آغاز کرتے ہیں۔ گوناگوں مصروفیتوں کے
درمیان ایسے وقفے روحانی آرام اور دماغی راحت کے علاوہ جسمانی سکون کا بھی
باعث ہوتے ہیں۔ کتنا بدبخت ہے وہ مہذّب انسان جو ناشتے، دوپہر کے کھانے
سہ پہر کی چائے اور رات کی غذا کا تو قائل ہو اور روحانی اشتہاء کی تسکین کا کوئی
سامان نہ کر سکے۔ یورپ اور امریکہ کے وہ مدبّر اور سیاست کار جن کا سارا دن مادی
مشاغل اور لنچ اور ڈنر کی نذر ہو جاتا ہے۔ اور جن کو ایک گھڑی بھی ایسی نصیب
نہیں ہوتی جس میں ان کو احکم الحاکمین اور سلطان السلاطین کے سامنے حاضر ہونے
کے شرف حاصل ہو سکے۔ ایٹم بم بنا کر نسلِ انسانی کی ہلاکت کے سوا اور کیا کام
کر سکتے ہیں۔ مسلمانوں کو اللہ نے بہتر گروہ، برگزیدہ جماعت اور خیر رساں اُمّت بنا کر
بھیجا ہے۔ تاکہ وہ نوعِ انسانی کی بہبودی کا کام کریں۔

کنتم خیر اُمّۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف
وتنھون عن المنکر۔

ہر مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ لوگوں کو بھلائی کا سبق دے اور برائی سے
روکے اور تاریخ بتاتی ہے کہ محمدؐ و آلِ محمدؐ نے اس فرض کو اس خوبی سے ادا کیا کہ
تبلیغی اور تعلیمی دنیا دنگ ہوکر رہ گئی۔

منقول ہے کہ ایک دن حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام صاف ستھرا اور ذرا
اچھی قسم کا لباس پہنے ہوئے کسی راہ سے گزر رہے تھے کہ ایک صوفی نے حضرت
کو آن گھیرا اور کہنے لگا کہ آپ حضرت علیؑ کی نسل میں ہیں۔ فرزندِ رسولؐ کہلاتے ہیں۔
کیا آپ کو حضرت رسولؐ اور حضرت علیؑ کی سادہ زندگی کا علم نہیں۔ اپنے ان بزرگوں کے
لباس کا مقابلہ اپنے لباس سے کیجئے اور آئندہ کے لئے اس خوش پوشاکی سے پرہیز
کرنے کا عزم بالجزم کیجئے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:۔

"اے شیخ تو جس زمانے کا ذکر کرتا ہے اس وقت مسلمانوں
کی اقتصادی حالت اچھی نہ تھی۔ ان کا معیارِ زندگی اونچا نہ تھا۔ اس
لئے حضرت علیؑ وہی لباس پہنتے تھے اور وہی کھانا کھاتے تھے جو
اس وقت کے ہر مسلمان کو آسانی سے میسّر آسکتا تھا۔ آج ملک کی
معاشی حالت اچھی ہے اور اوسط درجہ کا ہر مسلمان صاف ستھرے اور
اچھے قسم کے لباس اور صحت بخش اور لذیذ غذا کی مقدرت رکھتا ہے
اس لئے ہم نے بھی وہی روّیہ اختیار کیا ہے جو عامۃ المسلمین کا ہے۔
ہم جوگی، بیراگی اور درویش نہیں ہیں کہ خواہ مخواہ نفس کو تعب میں
ڈالیں اور اللہ کی موجود نعمتوں سے فائدہ نہ اٹھائیں۔"

حضرت امامؑ کا ارشاد ان سب لوگوں کے لئے ایک تازیانہ تھا۔ جو عیسائی راہبوں
اور بدھ مت کے بھکشوؤں کی تقلید میں ترکِ لذات کر بیٹھے تھے اور دورِ اوّل
کے مسلمانوں کی سادہ زندگی کو بطور سند پیش کیا کرتے تھے حالانکہ سادگی اور ترکِ

دنیا میں فرق ہے۔ سادگی کا معیار ہر دور میں بدلتا رہتا ہے۔ سادگی کے معنی یہ ہیں کہ آدمی حد سے زیادہ قدم نہ بڑھائے اور معیارِ زندگی ایسا رکھے جو اس عہد کے اوسط درجہ کے آدمی کو آسانی سے میسر آسکے۔ لباس ہو یا غذا مکان ہو یا سواری ہر چیز نہ بخل کی حد میں آئے نہ اسراف کی کہ اس زمانے کے لوگ دیکھ کر یہ نہ کہہ سکیں کہ یہ آدمی بے حد بخیل ہے۔ اور اپنے نفس کو تعب میں ڈالتا ہے۔ نہ یہ کہہ سکیں کہ فضول خرچ اور مسرف ہے۔ بندگی کا معیار اور عبادت کا صحیح نمونہ یہی ہے کہ انسان جادۂ اعتدال پر گامزن ہو۔ اور اللہ کی دی ہوئی قوت کا جائز اور معتدل استعمال کرے۔

محمدؐ و آلِ محمدؐ دنیا میں اسی لئے آئے تھے کہ دنیا کے سامنے عدل و توازن کا قابلِ عمل نمونہ پیش کریں۔ انہوں نے راہبانہ زندگی سے بچ کر غرقِ دنیا ہونے سے پرہیز کر کے ہمارے سامنے ایک ایسا پروگرام پیش کیا ہے۔ جو ہر دور میں ترقی پذیر اور شائستہ نمونۂ عمل سمجھا جا سکتا ہے۔ پھر اس نمونۂ عمل کے لئے انہوں نے ہم کو بتایا ہے کہ محبت اور الفت کے ساتھ اس کی اشاعت کی جائے۔ کہ دین کے معاملہ میں جبر و اکراہ کو دخل نہیں ہوا کرتا (لا اکراہ فی الدین)

جبر سے سر جھکائے جا سکتے ہیں۔ جسم کو قید کیا جا سکتا ہے۔ مگر قلوب و اذہان پر جور و زبردستی کا اثر نہیں ہوا کرتا۔ ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن (لوگوں کو اپنے پالنے والے کی راہ کی طرف حکمت اور دانائی اور عمدہ نصیحتوں کے ساتھ بلا۔ اور اگر ان سے مجادلہ بھی کرنا پڑے تو ایسے طریقہ سے کر جو بہتر ہو) ؎

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

لوگوں کو جس پر چلانا چاہو پہلے خود اس پر چل کر دکھاؤ۔ منقول ہے کہ کوئی شخص معصومؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا کہ میرا بچہ رطب زیادہ کھاتا ہے اور ظاہر ہے کثرت ہر چیز کی بری ہوتی ہے آپ اس کو نصیحت فرمائیے تاکہ وہ اس عادت سے باز آجائے۔ حضرت نے فرمایا "اچھا تین روز کے بعد اس کو میرے پاس لانا"

وہ آدمی تین دن کے بعد بچے کو لے کر آیا۔ آپ نے اس کو نصیحت کی اور وہ بچہ مان گیا۔ کسی نے دریافت کیا کہ "تین دن بعد بلانے میں کیا مصلحت تھی؟ فرمایا۔" رطب مجھ کو بھی پسند ہیں میں بھی شوق سے کھاتا ہوں۔ اس حالت میں میری بات کا اس پر کیا اثر ہوتا۔ میں نے تین دن تک رطب کھانے چھوڑ دیے۔ اور پھر اس بچے کو نصیحت کی تو اس پر اثر ہو کر رہا۔"

ہمارا عقیدہ ہے کہ حقیقی ہادی ہر قسم کے گناہوں سے معصوم ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ دوسروں کی ہدایت کے لئے موزوں نہیں ہو سکتا۔

اللہ تعالےٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے اپنی مخلوق کی ہدایت کے لئے آخری زمانے میں اخلاقِ انسانی کے چودہ ایسے نمونے بھیجے جن کا اتباع ہر قوم و ملت کو معراجِ کمال پر پہنچا سکتا ہے۔ دبستانِ قدرت کے یہ تعلیم یافتہ اور مدرسہ الٰہی کے یہ فارغ التحصیل اپنے اپنے عہد میں علم و فضل کے لحاظ سے یکتائے روزگار تھے۔ اربابِ بصیرت سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ مامون رشید اپنے عہد کا بہت بڑا عالم تھا اس نے باضابطہ تعلیم و تربیت حاصل کی تھی۔ اور تعلیم حاصل کرنے کے بعد مدتوں تک علمی صحبتوں میں رہا تھا۔ اس کے مقابلے میں حضرت امام محمد تقی علیہ السلام کم سن بھی تھے اور کسی مدرسہ میں تعلیم بھی حاصل نہ کی تھی۔ یہاں تک کہ اپنے والد ماجد کی خدمت میں بھی زیادہ عرصہ تک حاضر رہنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ مگر اس کم سنی میں اللہ نے وہ علم و فضل عطا کیا تھا کہ مامون دنگ رہ جاتا تھا۔ اور اس کی حکومت کے تمام علماء و حکماء حضرت کی خداداد قابلیت کا لوہا ماننے پر مجبور تھے۔ تاریخ کے صفحات ان علمی مناظروں اور حکیمانہ مباحثوں سے بھرے پڑے ہیں۔ جو حضرت امام علیہ السلام اور ان کے معاصر علماء کے درمیان ہوئے اور ہمیشہ غلبہ امامؑ ہی کو حاصل ہوا۔

زمانہ کی یہ بڑی ستم ظریفی ہے کہ اس نے ائمہ اہلبیتؑ کی کما حقہٗ قدر دانی نہیں کی اور ان حضرات کی عمر کا بیشتر حصہ قید و بند کی نذر ہو کر رہ گیا۔ وہ شخصی حکمرانی کا دور تھا، بادشاہ اپنے سائے تک سے خائف رہتے تھے۔ اس لئے کسی با اثر اور صاحبِ رسوخ

شخصیت کو چین سے بیٹھنے نہ دیتے تھے۔ آئمہ اہل بیت رسولِ خدا کے جانشین اور فاطمی گھرانے کے چشم و چراغ تھے اور علمی مدارج کی وجہ سے دنیا میں کافی مقبولیت رکھتے تھے۔ اس لئے وہ لوگ جن کی کل کائنات فوجی غلبہ اور پولیس ایکشن تھی، ان حضرات سے خائف رہتے تھے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام کے زمانے میں اموی دور ختم ہو کر عباسی عہد شروع ہو گیا تھا۔ عباسی غیر نہ تھے، گھر کے بھیدی تھے۔ اہل بیت کرام کے علم و فضل اور اثر و نفوذ سے واقف تھے۔ اور یہ بھی جانتے تھے کہ ان کے سامنے ہمارا چراغ نہ جل سکے گا۔ منصور دوانیقی جو عباسی گھرانے کا مشہور خلیفہ گزرا ہے ایک دن مایوس و ملول بیٹھا تھا۔ دربار والوں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا "جہاں پناہ آج طبیعت اُداس کیوں ہے۔ طبع عالی پر گرانی کیسی ہے؟"

خلیفہ نے جواب دیا:۔

"انسان جب اپنی آرزوؤں کو پورا ہوتا نہیں دیکھتا تو طبیعت افسردہ ہو جاتی ہے"

درباریوں نے ادب سے عرض کیا:۔

"اللہ نے جہاں پناہ کو سب کچھ دیا ہے۔ صحت، تندرستی، اولاد، حکومت، مال و دولت، اب کمی کس چیز کی ہے؟"

منصور نے ایک ٹھنڈا سانس لیا اور کہنے لگا:۔

"ہاں اللہ نے سب کچھ دیا ہے۔ بر و بحر پر میرا حکم چلتا ہے۔ مگر ایک چیز ہے جو امام جعفر بن محمدؑ کو حاصل ہے اور مجھے میسر نہیں۔ ان کے حلقۂ درس میں شرق و غرب سے لوگ آ کر جمع ہوتے ہیں۔ سوال و جواب کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ لوگ ان کی تقریروں اور علمی افادوں کو ضبطِ تحریر میں لاتے ہیں۔ اور ان کے فیوض کا یہ مجموعہ لے کر اپنے ملکوں کو واپس ہوتے ہیں۔"

درباریوں نے جواب دیا "یہ بات کیا مشکل ہے۔ کل سے آپ کے لئے بھی اس کا انتظام ہو جائے گا۔"

چنانچہ دوسرے دن مسند بچھی۔ اس کے حاشیہ پر امیرزادے، وزیرزادے اور

شہر کے سربرآوردہ لوگوں کی اولاد دو زانو ہو کر بیٹھ گئی۔ بادشاہ خراماں خراماں حرم سے نکلا اور مسندِ علم پر آ کر بیٹھا۔ اب لگے سوال و جواب ہونے، سونے چاندی کے قلم صفحۂ قرطاس پر چلنے لگے۔ اور بادشاہ کے منہ سے نکلا ہوا ہر جملہ ضبط تحریر میں آنے لگا۔ لیکن بادشاہ کا دل اب بھی بجھا ہوا تھا، اس کے چہرے پر اب بھی اُداسی تھی۔ آخر کسی نے ادب سے پوچھ ہی لیا "اب تو محفلِ علم گرم ہے، طلاب و شائقین علم و حکمت کا ہجوم ہے۔ مگر طبع ہمایوں پر اب بھی بشاشی نظر نہیں آتی"

بادشاہ نے کہا "ہاں میں دیکھتا ہوں کہ میرے اردگرد جو لوگ بیٹھے ہیں ان کا لباس بیش قیمت ہے، ان کے چہرے ہشاش و بشاش ہیں۔ شاہی آداب و قواعد کی آغوش میں پلے ہوئے ان امیرزادوں کی ہر نقل و حرکت یہ غمازی کر رہی ہے کہ عیش و آرام کے یہ دلدادہ اور دولت و فراوانی کے یہ پروردہ طلاب علم نہیں بلکہ ڈرامے کے ایکٹر (ACTOR) ہیں۔ جعفر بن محمدؑ کے اردگرد جو مجمع ہوتا ہے ان کی شکلیں ہی دوسری ہوتی ہیں۔ ان کے بوسیدہ لباس پھٹے ہوئے جوتے، پیشانیوں کے گرد و غبار یہ اعلان کرتے رہتے ہیں۔ کہ یہ طالبِ علم ہیں دُور سے آئے ہیں۔ حقائق کی تلاش ان کو وطن سے یہاں تک کھینچ لائی ہے۔ بے سروسامانی اور فقر و فاقہ کے باوجود یہ لوگ یہاں تک پہنچے ہیں، سینکڑوں اور ہزاروں میل کی راہ طے کر کے آئے ہیں، پیروں کے کانٹے اور آنکھوں کے گرد حلقے بتا رہے ہیں کہ سفر کے لئے سواری میسر نہ تھی اور کھانے پینے کا تو ذکر کیا نیند بھی بھرنے نہیں پائی۔ اگر اتنے فاصلے کے اندر کوئی اور عالم اور مدرس ہوتا تو وہ یہاں تک دوڑ کر کیوں آتے؟ اور سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے گھر سے بے گھر کیوں ہوتے۔ یہ امیرزادے جو میرے گرد بیٹھے ہیں شوقیہ قدم رنجہ فرما رہے ہیں نہ ان کے اندر علم کی طلبِ صادق ہے نہ دل میں حصولِ کمال کی لگن۔ بتایئے کہ ان طالب علموں کو دیکھ کر مجھے کیوں کر خوشی ہوگی۔ اور ان شوقیہ قدم رنجہ فرمانے والوں کو پڑھا کر علمی دنیا میں کیا نام پیدا کر سکوں گا۔

"سچ ہے کہ اس دُنیا میں ہر شخص کی ہر آرزو پوری نہیں ہُوا کرتی۔"

احسانات کا بدلہ اس طرح دیں کہ ان کے نواسے کو قتل کر کے ان کی لاش پر گھوڑے دوڑائیں اور ان کے اہل حرم کو کوفہ و شام کے بازاروں میں تشہیر کریں۔

کہتے ہیں کہ جب اہل حرم کا لٹا ہوا قافلہ دمشق کے قریب پہنچا تو حضرت زینبؑ و ام کلثومؑ نے فضہ سے کہا کہ شمر کے پاس جاؤ۔ اور ہماری طرف سے پیام دو کہ دمشق بہت بڑا شہر ہے۔ یہاں ہر قوم و قبیلے کے لوگ رہتے ہیں۔ غیر ملکی تاجروں اور دوسری حکومتوں کے ایلچی بھی یہاں مقیم ہیں۔ لہٰذا بانو ہم کو چادریں مہیا کر دے کہ سر چھپا سکیں یا کسی ایسے دروازے سے لے چل جہاں لوگوں کا زیادہ ہجوم نہ ہو۔ مگر افسوس شمر نے ایک بات نہ مانی اور باب الساعات سے داخل کر کے اس راستے سے لے گیا جو شہر کا سب سے زیادہ آباد، پُر رونق، مرکزِ خرید و فروخت اور محلِ سیر و تفریح تھا۔ جب یہ قافلہ جامع مسجد کے قریب جا کر رکا تو ایک شامی نے جوش میں آکر کہا "اللہ کا شکر ہے کہ اس نے بغاوت کے فتنہ کو فرو کیا۔ اور بادشاہ کو دشمن پر فتح بخشی" امام زین العابدین علیہ السلام نے اس شامی سے فرمایا "آپ نے بھی قرآن میں یہ آیت پڑھی ہے "قُلْ لَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى" اس نے جواب دیا کہ پڑھی ہے۔ فرمایا یہ آیت بھی نظر سے گزری ہے؟ "اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا" اُس نے کہا جی ہاں۔ یہ آیت بھی نظر سے گزری ہے۔

فرمایا یہ آیتیں ہماری ہی شان میں ہیں، اور ہم ہی وہ اہل بیت ہیں جن سے خدا نے رجس کو دور رکھنے کا ارادہ کیا ہے۔

یہ سُن کر وہ شامی بے چین ہو گیا۔ اور امام عالی مقام کے قدموں میں گر کر توبہ کی۔

اس کے بعد یہ قافلہ یزید کے دربار میں داخل ہُوا۔ یزید شراب کے نشے میں مست تھا۔ شطرنج سے شغل کر رہا تھا، سامنے امراء و رؤساء حسب مدارج کرسیوں پر بیٹھے تھے جب رسولؐ کے گھرانے کا یہ قافلہ پہنچا تو اس نے اہانت کی غرض سے کہا "میں نے سیدانیوں کو بلایا تھا، تم کنیزوں کو لیئے آرہے ہو، راستے کے گرد و غبار اور سفر کے مصائب و آلام نے شہزادیوں کو اس قدر پریشان حال کر دیا تھا کہ یزید کو یہ جملہ کہہ کر توہین کرنے کا موقع ملا۔

یہی منصور دوانیقی جب مرض الموت میں مبتلا ہوا تو سرزمینِ مکہ کی طرف جانے کا ارادہ کیا تاکہ دم اس مقدس فضا میں نکلے اور مرنے کے بعد حرم میں دو گز زمین میسّر آجائے۔ گھر سے رخصت ہوتے وقت اس نے اپنے بیٹے مہدی کی بیوی کو بلا کر کہا:۔

"مہدی سے بغیر ملے ہوئے جا رہا ہوں۔ خدا جانے اب اس سے ملنا میسّر ہو یا نہ ہو یہ کنجیاں لے لو اور حفاظت سے رکھو، جب مہدی سفر سے واپس آجائے تو اس کے حوالے کر دینا۔ میرے مرنے کی خبر آنے کے بعد تم اور وہ دونوں مقفل کمروں کو کھولنا، مگر خبردار! کوئی تیسرا آدمی تمہارے ساتھ نہ ہو۔"

جب منصور کی وفات کی خبر آئی اور مہدی خلیفہ ہوا تو اس نے ان کمروں کو کھولا۔ دیکھتا کیا ہے کہ فرش سے لے کر چھت تک وہ کمرے انسانی لاشوں سے بٹے پڑے ہیں۔ ہر لاش کے ساتھ ایک ٹکٹ لگا ہوا ہے جس پر مقتول کا اور اس کے باپ کا نام لکھا ہے۔ اور یہ سب لاشیں بنی فاطمہ کی ہیں۔ کہتے ہیں کہ ساری عمر منصور کا یہی محبوب مشغلہ تھا کہ بنی فاطمہ کو پکڑ پکڑ کر منگاتا تھا اور قتل کر کے ان کی لاشوں کو چھپا دیتا تھا۔

آہ تبلیغِ دین اور خدمتِ اسلام کا بدلہ اُمّت نے اس طرح دیا کہ اولادِ رسولؐ کو کبھی چین لینا نصیب نہ ہُوا۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

مشہد میں، کربلا میں، نجف میں، مدینہ میں
بکھرے گلِ ریاضِ پیمبرؐ کہاں کہاں

مکّے کے باشندے، مدینہ کے رہنے والے سادات کے مزار دنیا کے ہر حصے میں پائے جاتے ہیں تبلیغ و خدمت کا شوق ان کو چار وانگ عالم میں لے گیا اور نفس پرست حاکموں اور زر دوست انسانوں کے ظلم و ستم نے ان کو کہیں چین نہ لینے دیا۔

کیا یہ تاریخ کا دلفگار اور حوصلہ شکن سانحہ نہیں ہے کہ مسلمان اپنے نبی کے

شمر نے بڑھ کر فہرست نکالی ۔ اور ایک ایک کی طرف اشارہ کر کے کہا ۔

"یہ زینبؑ ہے ۔ یہ ام کلثومؑ ہے ۔ یہ لیلےٰ ہے ۔ یہ رباب ہے ، وہ جو آخر میں کھڑی ہے وہ حسینؑ کی پیاری بیٹی سکینہؑ ہے ۔"

جب اہل حرم یزید کے روبرو پیش کیے جا رہے تھے ، تو کنیزوں نے بیبیوں کو اپنے حلقہ میں لے لیا تھا ، تاکہ ہر شخص کی نظر ان پر نہ پڑ سکے ۔ یزید نے شمر سے کہا ۔

"میں زینبؑ بنت علیؑ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں ، ذرا کنیزوں کو ان کے سامنے سے ہٹا دو ۔"

شمر تازیانہ لے کر آگے بڑھا اور کنیزوں کو ہٹانے لگا ۔ سب کنیزیں ہٹ گئیں مگر حبشی خاندان کی ایک کنیز اپنی جگہ سے نہ ہلی ۔ شمر نے چاہا کہ اس کو بھی تازیانہ مار کر ہٹا دے کہ اتنے میں اس کنیز کی نگاہ حبشیوں کے اس دستے پر جا پڑی جو یزید کی حفاظت کے لئے ہتھیار لگائے کھڑا تھا ۔ اس کنیز نے چلا کر کہا " تمہاری حمیت کو کیا ہوا ، تمہاری غیرت کدھر گئی ، تمہاری قوم کی ایک عورت کو شمر ناحق تازیانہ لگانا چاہتا ہے ۔ اور تم چپکے کھڑے ہو" ۔ یہ سننا تھا کہ وہ حبشی رسالہ بگڑ گیا ۔ اور یزید سے کہنے لگا ۔

" شمر کو منع کر دیجئے ، ورنہ اب دربار میں تلوار چل جائے گی ۔"

یزید ڈر گیا اور شمر کو روکا ۔

اے عزادارانِ حسینؑ !

زنِ حبشیہ کو بھی دربار میں حامی مل گئے ۔ مگر آلِ محمدؐ کی مدد کرنے کے لئے کوئی نہ اٹھا ۔

"قُلْ لَّا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى"

کو مسلمان بھلا بیٹھے تھے ۔ یا اہلِ حرم کو نبیؐ کی اولاد نہ سمجھتے تھے ۔

گیارھویں مجلس

اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم ط بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین والہ الطیبین الطاہرین ۔ اما بعد فقد قال اللہ سبحانہ تعالیٰ فی کتابہ المجید و فرقانہ الحمید ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

" اے اہل البیتؑ بس اللہ کا تو یہ ارادہ ہے کہ تم سے رجس کو دور کر دے اور تم کو ایسا پاک و پاکیزہ کر دے جو پاک و پاکیزہ کرنے کا حق ہے ۔"

اس آیت میں اہل بیت نبوی سے نہیں بلکہ اہل بیتؑ سے خطاب ہے ۔ "البیت" سے کیا مراد ہے ؟ بیت کا ترجمہ بہت سے لوگ گھر کیا کرتے ہیں ۔ یہ صحیح نہیں ہے ۔ بیت دراصل حجرے کو کہتے ہیں ۔ گھر کے لئے "دار" کا لفظ آتا ہے ۔ اور "دار" کے اندر بہت سے کمرے اور حجرے ہوتے ہیں ۔ رسول مقبولؐ کے گھر میں بہت سے بیت یا کمرے تھے ۔ اور ہر کمرہ کسی نہ کسی ام المومنین سے منسوب تھا ۔ اس لئے جب اللہ ازواجِ رسولؐ کا ذکر کرتا ہے ۔ تو کہتا ہے ۔ قَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ " اپنے کمروں میں رہو ۔"

عربی زبان میں اسم نکرہ پر الف لام داخل ہوتا ہے ۔ تو اس کے معنی میں کبھی وسعت

پیدا ہو جاتی ہے کبھی تخصیص کا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ جو لوگ عربی علم ادب کے ماہر ہیں وہ جانتے ہیں کہ "البیت" سے مراد ہے "مخصوص گھر یعنی بیت اللہ" جب کبھی عربی زبان میں بیت الف لام کے ساتھ آئے اور کوئی قرینہ اس کے خلاف نہ ہو تو اللہ کا گھر ہی مراد ہوتا ہے۔ یہ وہ گھر ہے جس کے لئے اللہ کا ارشاد ہے:-

اِنَّ اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیۡ بِبَکَّۃَ "پہلا گھر جو لوگوں کے فائدے رسانی کے لئے بنایا گیا مکہ کی سرزمین پر تھا۔" یہ وہ گھر ہے جس کی تعمیر حضرت ابراہیمؑ نے کی اور اسماعیلؑ نے پتھر اور گارا دے کر باپ کا ہاتھ بٹایا۔ اللہ تعالیٰ خود ارشاد فرماتا ہے:-

وَاِذۡ بَوَّاۡنَا لِاِبۡرٰهِیۡمَ مَکَانَ الۡبَیۡتِ اَنۡ لَّا تُشۡرِکۡ بِیۡ شَیۡئًا ط وَّطَهِّرۡ بَیۡتِیَ لِلطَّآئِفِیۡنَ وَالۡقَآئِمِیۡنَ وَالرُّکَّعِ السُّجُوۡدِ ○ (حج)

(اے رسولؐ وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے ابراہیمؑ کے واسطے خانہ کعبہ کی جگہ ظاہر کر دی (اور ان سے کہا) کسی چیز کو میرا شریک نہ بنانا، اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کیلئے صاف ستھرا رکھنا۔

وَاِذۡ یَرۡفَعُ اِبۡرٰهٖمُ الۡقَوَاعِدَ مِنَ الۡبَیۡتِ وَاِسۡمٰعِیۡلُ رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ رَبَّنَا وَاجۡعَلۡنَا مُسۡلِمَیۡنِ لَکَ وَمِنۡ ذُرِّیَّتِنَاۤ اُمَّۃً مُّسۡلِمَۃً لَّکَ

اور جب ابراہیمؑ و اسماعیلؑ "البیت" کی بنیادوں کو اٹھا رہے تھے تو یہ دعا کرتے جاتے تھے اے ہمارے پالنے والے ہماری اس خدمت کو قبول فرما۔ بیشک تو سب کچھ سنتا ہے اور ہر چیز جانتا ہے۔ پالنے والے ہم کو اپنا مسلمان بندہ بنا، اور ہماری نسل سے بھی ایک گروہ کو مسلمان بنا۔

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کعبہ کی تعمیر سے فارغ ہو چکے تو فرمایا:-

رَبِّ اجۡعَلۡ هٰذَا الۡبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجۡنُبۡنِیۡ وَبَنِیَّ اَنۡ نَّعۡبُدَ الۡاَصۡنَامَ

اے پروردگار اس سرزمین کو امن و امان کی جگہ بنا دے اور مجھے اور میری اولاد کو

ربنا انہن اضللن کثیراً من الناس فمن تبعنی فانہ منی ومن عصانی فانک غفور الرحیم ○

اس بات سے بچا لے کہ بتوں کی پرستش کرنے لگیں۔ اے پروردگار بلاشبہ ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر کے چھوڑا ہے۔ تو جو شخص میری پیروی کرے وہ مجھ سے ہوگا۔ اور جس نے میری نافرمانی کی (تو اس کا معاملہ تیرے اختیار میں ہے) بے شک تو بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

ربنا انی اسکنت من ذریتی بوادٍ غیر ذی زرع عند بیتک المحرم (ابراہیم)

اے ہمارے پالنے والے میں نے اپنی کچھ اولاد کو تیرے محترم گھر کے قریب ایک ایسی وادی میں لا بسایا ہے جو بنجر ہے

ان آیتوں پر غور و فکر کرنے سے کئی باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ "البیت" سے مراد خانہ کعبہ ہے۔ وہ خانہ کعبہ جس کو حضرت ابراہیمؑ نے بنایا۔ اور جس کی تعمیر میں حضرت اسماعیلؑ شریک رہے ہیں۔ اس لئے یہ دونوں "اہل البیت" قرار پائے۔ یعنی خدا کے اس گھر کے متولی قرار دے گئے۔ دوسرے یہ کہ حضرت ابراہیمؑ کی یہ دعا اور تمنا تھی کہ اللہ کے اس گھر کے قریب ان کی اولاد آباد ہو، پھولے پھلے، اور بتوں کی پرستش سے محفوظ رہ کر توحید کی تعلیم و تبلیغ کرے۔ ان کی نسل کے افراد ملت ابراہیمی پر قائم رہیں شیطان کے راستے سے پرہیز کر کے اللہ کی بندگی کو اپنا شعار بنائیں۔ آپ نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ میری ذریت نسل اور جماعت میں بس وہی ہوگا جو میرے نقش قدم پہ چلے گا اور جو بے راہ روی اختیار کرے گا۔ اس کا تجھے اختیار ہے، چاہے سزا دے یا معاف کر دے۔ سب کو معلوم ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بت پرستی ستارہ پرستی اور انسان پرستی کے اس ہولناک دور میں توحید الٰہی کے سب سے بڑے نقیب منادی اور مبلغ تھے، وہ کلدانیہ کے اُر سے حران گئے، حران سے کنعان میں جا آباد ہوئے۔ سیر و سیاحت اور تبلیغ و اشاعت کے سلسلہ میں مصر بھی پہنچے اور

جس جگہ موقع ملا اللہ کا پیغام سنانے سے نہ چوکے ہزاروں سال پہلے کی دنیا کا یہ مامور من اللہ اس فکر میں رہتا تھا کہ دنیا کے کسی حصہ میں توحید الٰہی کا سب سے بڑا مرکز بنائے۔ اور اپنی اولاد کو اس کے قریب آباد کر کے اپنے مشن کے پھیلنے کے سامان مہیا کرے۔ وادیٔ مکہ جو ان دنوں جنوبی اور مشرقی عرب سے آنے والے تجارتی راستے پر واقع تھی۔ عدن اور عمان کی بندرگاہوں پر جو تجارتی سامان اترتے تھے۔ وہ اونٹوں کے ذریعہ سے شمالی سمت ہوتے ہوئے شام، مصر، یونان و روما تک پہنچ جاتے تھے۔ مکہ کی وادی غیر ذی زرعہ اس شاہراہ پر واقع تھی اور کسی زمانے سے یہ سرزمین اللہ کے نام سے موسوم بھی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ نے خدا کے اس پرانے گھر کی تجدید کی اور اسماعیلؑ اور ان کی والدہ کو اس گھر کے قریب آباد کر دیا اللہ سے دُعا فرمائی کہ یہ میری ذریت پھولے اور پھلے اور میری توحید کو اس صنم کدۂ عالم میں پھیلاتی رہے۔

میری نسل میں سے جو میرے سیدھے سچے راستے پر چلے گا، وہی میری اولاد میں سمجھا جائے گا۔ اور مشرک افراد کا شمار میری نسل تو نسل جماعت میں بھی نہ ہوگا حضرت ابراہیمؑ کی یہ اولاد اہل البیت کہلائی اور ہزاروں سال سے مکہ کی وادی میں آباد ہو کر بیت اللہ کی نگرانی کا فرض ادا کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ یہ عہدہ عبدالمطلب کے بعد ابوطالب تک پہنچا۔ اور اب علیؑ اور ان کی اولاد اس کی اہل قرار پائی۔ حضرت ابراہیمؑ کی شرط کے مطابق صرف مسلم، موحد اور بُت پرستی سے پرہیز کرنے والے افراد ہی کعبہ کے متولی ہو سکتے تھے۔ اور یہ شرطیں محمدؐ و آلِ محمدؐ، علیؑ اور اولادِ علیؑ میں موجود تھیں یہی وہ اہل البیت ہیں جن کو خطاب کر کے اللہ تعالٰے فرما رہا ہے:-

اِنَّمَا یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت
ویطھرکم تطھیراً۔

بس اللہ تو یہی چاہتا ہے کہ اے اہل البیت تم سے رجس کو دور کر دے اور ایسا پاک پاکیزہ کر دے جیسا کہ پاک و پاکیزہ کرنے کا حق ہے۔

اب ان اہل البیت کی مقدس زندگی کا جائزہ لیجئے۔ ان کے حالات و کوائف کی چھان بین کیجئے تو صاف نظر آجائے گا "طیّب و طاہر" ان کا خطاب ہی نہ تھا بلکہ سچ مچ ان کا کردار بھی طیّب و طاہر تھا۔

۲۶۰ھ تک دنیا نے اس خانوادے کے اماموں کو قریب سے دیکھا ہے۔ ہر دور کے مورخوں نے ان کے حالات زندگی کو قلمبند کیا ہے۔ نہ ان میں جہالت کا کھوٹ پایا نہ بداخلاقی کا دھبہ، سیرت، صورت اور علم و فضل کے یہ مجسمے جب تک دنیا کے سامنے رہے اپنے اخلاق و آداب سے معاشرہ کی رہنمائی کرتے رہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے "وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ" کہہ کر جس سلسلۂ ہدایت کی تمنا کی تھی اور اللہ تعالیٰ نے "لَایَنَالُ عَھْدِی الظّٰلِمِیْن" کہہ کر جس معصوم و مطہر گروہ کی بشارت دی تھی وہ یہی بزرگوار تھے جو اہل بیت بھی تھے اور آلِ محمدؐ بھی۔ کفر و نفاق کی گھنگھور گھٹاؤں میں انہوں نے ایمان و ایقان کے چراغ جلائے اور نانا کی اُمت جب جوع الارض اور کشورکشائی کے گرداب میں پھنس گئی تو یہ علوم و فنون، تہذیب و شائستگی کی ترویج اور بقا کے وسائل پیدا کرنے میں مشغول ہو گئے۔

اموی دور میں جب مسلمانوں کے فوجی گھوڑے ایک طرف تو بحر اٹلانٹک کے کنارے ہنہنا رہے تھے، اور دوسری طرف چین کی دیوار تک پہنچ گئے تھے یہ آئمہ اہل البیت ہی تو تھے جنھوں نے مدینہ میں سب سے پہلے دارالعلوم کی بنیاد رکھی جس میں دنیا کے ہر حصے سے تشنگانِ علوم آکر سیراب ہوتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ وہ شخص جس کے پاس ایک تلوار اور ایک گھوڑا ہو فاتح، غازی اور کشورکشا بن جاتا تھا۔ قیصر، کسریٰ اور فغفور کے خزانے اس کا گھر بھر دیتے تھے جب لکشمی دیوی مسلمانوں کے چوم رہی تھی اور ہر بدو کے خیمہ و فرودگاہ میں سُن برس رہا تھا۔ امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام اپنے جدِ امجد کے مزار کے قریب حکمت و موعظت کے دریا بہا رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ فتوحات ملکی کا سیلاب جلد اُتر جائے گا۔ کشورکشائی اور فوجی حملوں کی آندھی

ہمیشہ چڑھی نہ رہے گی۔ مگر اسلام کے استحکام اور حدود ممالکِ اسلام کی حفاظت کے لئے ضروری ہے کہ تعلیم و تربیت اور تمدن و ثقافت کی بقا کے مرکز قائم کئے جائیں۔ ورنہ دنیا میں بہت سی قومیں اٹھیں اور جب تک سیر کو سوا سیر نہیں ملا۔ آگے بڑھتی چلی گئیں۔ مگر جب کسی برتر نظام اور بہتر فوجی تنظیم سے سابقہ ہوا یا خود اپنا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ گیا تو اس طرح ٹھوکر کھا کر گریں کہ پتہ بھی نہ چلا۔

آگے چل کر بغداد، شیراز، نیشاپور، دمشق، قاہرہ، قیروان، غرناطہ اور قرطبہ میں جو علمی چراغ روشن ہوئے جن کی روشنی نے ازمنہ مظلمہ کو منور و درخشاں کر دیا، وہ روشنی انہی درسگاہوں کا عکس تھی جو آئمہ اہل بیتؑ نے قائم کئے تھے۔ آج بھی ہدایت کے جو چراغ روشن ہیں اور جہاں جہاں روشن ہیں وہ اسی خانوادے کے دم سے روشن ہیں۔ اب اس آیت کو غور سے پڑھیے۔

ان اول بیت وضع للناس ببکۃ مبارکاً وھدی للعلمین فیہ ایات بینات و مقام ابراھیم۔

"بے شک پہلا گھر جو نوعِ انسانی کے فائدے کے لئے بنا وہ مکے میں تھا برکتوں والا اور سارے جہانوں کے لئے ہدایت، اس کے اندر کھلی ہوئی نشانیاں ہیں اور ابراہیمؑ کے قائم رہنے کی جگہ ہے۔"

مجھے نہیں معلوم کہ یہاں بیت سے کیا مراد ہے۔ پتھر اور گارا کا وہ حجرہ جس کو ابراہیمؑ و اسماعیلؑ نے بنایا تھا۔ وہ برکت والا حجرہ بے شک ہدایت ہے ابراہیمؑ نے وہاں کبھی قیام بھی فرمایا تھا۔ مگر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم ظرف بولتے ہیں اور مظروف مراد لیتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں "نہر بہ رہی ہے" حالانکہ "پانی بہتا ہے"، "پرنالے چل رہے ہیں" حالانکہ بارش کا پانی پرنالوں میں ہو کر نکلتا ہے۔

پھر کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ یہاں گھر سے گھر والے اور اہل بیت مراد

ہوں۔ سب سے پہلا گھرانا جو نوعِ انسانی کی ہدایت کے لئے قائم ہوا وہ سرزمین مکہ پر تھا۔ مکہ میں آدمؑ کی آمد مسلّم ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے گھرانے کی بنیاد یہیں رکھی تھی۔ اور پھر آنحضرتؐ کا خانوادۂ ہدایت بھی یہیں قائم ہوا۔

بے شک یہ وہ گھر ہے جہاں ہدایت کا منارہ روشن ہے۔ جہاں ابراہیمؑ کا مستقل مقام قائم ہو چکا ہے۔ اس گھر کی وجہ سے علوم و فنون کا اُجالا ساری دنیا میں ہوا اور ملتِ ابراہیمی کے قیام کی مستقل سبیل بھی یہیں سے پیدا ہوئی۔ یا پھر یوں سمجھئے کہ "البیت اور اہل البیت" دونوں مل کر اس آیت کے مصداق ہیں آیت کا منشاء اور مراد کچھ بھی ہو لیکن یہ تو ایک تاریخی حقیقت ہے کہ نوعِ انسانی کو جتنا فائدہ ابراہیمؑ و آلِ ابراہیمؑ اور محمدؐ و آلِ محمدؐ سے پہنچا اتنا کسی دوسرے گھرانے، خانوادے اور نسل سے نہیں پہنچا۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس گھر کے برباد و تاراج کرنے کی جتنی کوششیں ہوئیں اس کی مثال دوسری جگہ نہیں مل سکتی۔ لوگوں نے اہل بیت کو برباد کرنے کی بھی کوششیں کیں مگر ناکام رہے اور اہل البیت کے بھی نام و نشان مٹانے کے درپے رہے مگر بس نہ چل سکا۔

جس سال ہمارے نبی کریمؐ پیدا ہوئے ہیں اس سال یمن کے حاکم ابرہہ نے مکے پر اس لئے چڑھائی کی تھی کہ کعبہ کو مسمار کر کے اس کی مرجعیت اور مرکزیت کو ختم کر دے اور یمن کے شہر صنعا میں جو "القلیس" بنایا تھا اس کو عرب کی زیارت گاہ قرار دے۔ ایک بھاری لشکر اور ہاتھیوں کا غول لے کر وہ یمن سے چلا اور مکہ سے کچھ دور خیمہ انداز ہوا۔ قریش سے کہلا بھیجا کہ مجھے تم سے سروکار نہیں صرف کعبہ ڈھانے آیا ہوں۔ اگر تم نے مزاحمت نہ کی تو اپنا کام کر کے واپس چلا جاؤں گا۔ ورنہ میرے لشکر کی تلواریں تم سب کو موت کے گھاٹ اتار دیں گی۔ اور لاشیں ہاتھیوں کے پیروں کے نیچے کچل کر رہ جائیں گی۔ کہتے ہیں کہ جب ابرہہ کے ہاتھی اور گھوڑے خانہ کعبہ کو مسمار کرنے کے لئے بڑھے تو اللہ نے جو دراصل اپنے گھر کا محافظ اور نگہبان ہے چھوٹے چھوٹے پرندوں کو بھیج دیا جن کے پنجوں میں کنکریاں دبی

ہوئی تھیں جس کے سر پر کنکری گری وہ ڈھیر ہو کر رہ گیا۔

عبدالمطلب نے جو اس وقت متولیٔ کعبہ تھے، اپنے اونٹوں کی رہائی کے سلسلہ میں ابرہہ سے مل کر یہ کہہ چکے تھے:۔

"اونٹ میرے ہیں، میں ان کی رہائی کے لیے کوشاں ہوں، کعبہ کا مالک اور ہے، وہ خود اس کی حفاظت کا سامان کرے گا۔"

اور ہوا بھی ایسا ہی۔ ابرہہ کا لشکر چند منٹ میں برباد ہو کر رہ گیا۔ اور خانہ کعبہ اسی طرح صحیح سالم رہا۔

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحَابِ الْفِيلِ ۝ أَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِي تَضْلِيلٍ ۝ وَأَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا أَبَابِيلَ ۝ تَرْمِيهِمْ بِحِجَارَةٍ مِنْ سِجِّيلٍ ۝ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَأْكُولٍ ۝

(کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے پروردگار نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟ اس نے ان کی تمام تدبیریں غلط نہیں کر دیں۔ اور ان پر جھنڈ کے جھنڈ طائر بھیجے جو ان پر کھرنجوں کی کنکریاں پھینکتے تھے، (اس طرح) انہوں نے ان کو چبائے ہوئے بھُس کی طرح تباہ کر کے رکھ دیا)

یہی معجز نما اور مسعود عالم گھر تھا جو علیؑ کا زچہ خانہ بنا اور اس طرح آلِ عمران یعنی علیؑ اور اولادِ علیؑ کو کعبہ سے ایک نئی نسبت حاصل ہو گئی۔

تواترت الاخبار ان فاطمہ بنت اسد ولدت امیر المومنین علی ابن ابی طالب فی جوف الکعبۃ۔

(مستدرک امام حاکم جلد ۳ ص ۴۸۳)

"یہ بات حدِ تواتر کو پہنچ چکی ہے کہ امیرالمومنین علیؑ ابن ابی طالبؑ فاطمہ بنت اسد کے بطن سے کعبہ کے اندر پیدا ہوئے۔"

یہ شرف صرف علیؑ کو حاصل ہوا کہ "البیت" ان کا مولد بنا، اس لئے وہ اور ان

کی اولاد صحیح معنوں میں "اہل البیت" مشہور ہوئی۔

تفسیر روح المعانی کے مصنف علامہ الوسی سنی جماعت کے بڑے عالم گزرے ہیں۔ وہ شرح عینیہ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

وکون امیر کرم اللہ وجھہ ولد فی البیت امر مشھور فی الدنیا وذکر فی کتب الفریقین اھل السنۃ والشیعۃ

"حضرت امیرؑ کا "البیت" میں پیدا ہونا دنیا بھر میں مشہور ہے سُنّی شیعہ دونوں فریقوں کی کتابوں میں اس کا ذکر ہے۔"

لیکن عزیزو اور دوستو! کیا قیامت ہے کہ یہ خانہ کعبہ جس کو حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسماعیلؑ نے بنایا جس کے اندر حضرت علیؑ پیدا ہوتے جس کے متعلق اس کا ارشاد ہے وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا (جو اس کے اندر داخل ہو گیا وہ امن میں آگیا) وہاں امام حسین علیہ السلام کو پناہ نہ مل سکی۔

چنانچہ لکھا ہے کہ جب یزید کو یہ علم ہوا کہ امام عالیمقام مکہ میں مقیم ہیں اور حرم کی حدود میں رہ کر میرے احکام کی خلاف ورزی کرنا چاہتے ہیں تو اس نے بہت سے لوگوں کو حاجیوں کے لباس میں روانہ کیا کہ جہاں ہو سکے اور جس طرح ہو سکے فرزندِ رسولؐ کا کام تمام کر دیں۔ جب حضرت کو یہ خبر ملی تو آپ نے حرمتِ کعبہ کی حفاظت کے لئے مکہ سے کوچ کرنے کا ارادہ کر لیا۔ فرزدق شاعر حج کے لئے آرہے تھے۔ مولاؑ نے ان سے پوچھا، کوفہ کو کس حال میں چھوڑا۔ انہوں نے کہا: "وہاں کے لوگوں کے دل آپ کے ساتھ اور تلواریں بنی امیہ کے ساتھ ہیں۔"

فرزدق عربی زبان کے بڑے شاعر گزرے ہیں۔ اس پُر آشوب زمانے میں انہوں نے فضائل آلِ محمدؐ کی بڑی نشر و اشاعت کی تھی۔ انہوں نے ہشام بن عبدالملک کا زمانہ بھی پایا ہے۔ آپ نے وہ مشہور واقعہ ضرور سنا ہوگا کہ ایک مرتبہ ہشام حج کے لئے گیا طواف کر کے حجرِ اسود کو بوسہ دینا چاہتا تھا، مگر بھیڑ بھاڑ کی وجہ سے راستہ نہ ملا۔ ایک طرف آکر ٹھہر گیا۔ اور اس انتظار میں تھا کہ بھیڑ کم ہو تو جا کر حجرِ اسود

کو بوسہ دے۔ اتنے میں اس نے دیکھا کہ ایک بزرگ آئے۔ اور ان کو دیکھ کر لوگوں نے راستہ دے دیا۔ اور انہوں نے بآسانی حجر اسود کا بوسہ لیا۔ شام کے لوگ جو ہشام کے ساتھ آئے تھے۔ حیرت میں رہ گئے اور پوچھنے لگے۔ یہ بزرگ کون ہیں جن کی جلالت قدر داب شاہی سے بھی زیادہ ہے ہشام نے تجاہل عارفانہ سے کہا "معلوم نہیں" فرزدق بھی کہ درباری شاعر تھے وہاں موجود تھے، ان سے نہ رہا گیا اور انہوں نے فوراً کھڑے ہو کر یہ قصیدہ پڑھا۔

هٰذَا الَّذِيْ تَعْرِفُ الْبَطْحَاءُ وَطْأَتَهُ   وَالْبَيْتُ يَعْرِفُهُ وَالْحِلُّ وَالْحَرَمُ

"یہ وہ بزرگ ہیں جن کے پاؤں کی چاپ سارا بطحا جانتا ہے اور خود خانۂ کعبہ مقام حل اور حرم بھی ان سے ناواقف نہیں۔"

هٰذَا ابْنُ خَيْرِ عِبَادِ اللّٰهِ كُلِّهِمُ   هٰذَا التَّقِيُّ النَّقِيُّ الطَّاهِرُ الْعَلَمُ

"یہ اس کے فرزند ہیں جو خدا کے بندوں میں سب سے بہتر ہے۔ یہ متقی، پرہیزگار طاہر اور مشہور و معروف ہستی ہیں۔"

یہ لمبا چوڑا قصیدہ فرزدق نے اس دھوم دھام سے پڑھا کہ حاضرین محو حیرت ہو کر رہ گئے۔ اور شامیوں پر اہل بیت کی قدر و منزلت واضح ہو گئی اور سچ بھی ہے مکہ کی سرزمین اور کعبہ کی عمارت میں بھی اگر اہل البیت کو کوئی نہ پہچانے تو کہاں پہچانے گا۔ فرزدق کی طرح اور بھی بہت سے شعراء نے اموی اور عباسی دور میں اپنے اشعار کے ذریعہ سے فضائل اہلبیت کو پھیلایا ہے۔ اور ان کے مصائب کا ذکر کر کے ان کے مشن کی تبلیغ کی ہے۔ حضرت امام رضا علیہ السلام کا زمانہ آیا اور مرو میں آپ کو چند دن کے لئے ولیعہد سلطنت بننے کا بھی موقع ملا۔ تو بہت سے شعراء دربار میں آکر جمع ہو گئے۔ اور حضرت نے اکثر ان کو فضائل و مصائب اہلبیت بیان کرنے کا موقع دیا۔ ان میں دعبل خزاعی کا نام بہت مشہور ہے۔ کتابوں میں ان کے اکثر اشعار پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ بحار الانوار میں منقول ہے کہ ایک مرتبہ یہ حضرت امام علی رضا علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے حضرت نے ان کا بڑے احترام کے ساتھ خیر مقدم

کیا۔ چونکہ یہ محرم کا زمانہ تھا۔ اس لئے حضرت نے مجلس عزائے سید الشہداء منعقد کی ایک طرف مرد تھے، دوسری طرف پس پردہ عورتیں تھیں دعبل خزاعی نے پڑھنا شروع کیا۔

أَفَاطِمُ لَوْ خِلْتِ الْحُسَيْنَ مُجَدَّلًا
وَقَدْ مَاتَ عَطْشَانًا بِشَطِّ فُرَاتِ

"اے فاطمہؑ اگر آپ ہوتیں اور دیکھتیں حسینؑ کو کہ فرات کے کنارے پیاسے دنیا سے رخصت ہوئے۔"

إِذًا لَلَطَمْتِ الْخَدَّ فَاطِمُ عِنْدَهُ
وَأَجْرَيْتِ دَمْعَ الْعَيْنِ فِي الْوَجَنَاتِ

"اس وقت آپ بے ساختہ اپنے منہ پر طمانچے مارنے لگتیں اور رخساروں پر آنسو جاری فرماتیں۔"

وَالرَّأْسُ مُنْتَصِبٌ وَزَيْنَبُ عِنْدَهُ
وَدُمُوْعُهَا تَجْرِيْ عَلَى الْوَجَنَاتِ

"آپ کا سر نیزہ پر نصب تھا اور زینبؑ قریب کھڑی تھی اور آنسو رخساروں پر بہہ رہے تھے۔"

أَفَاطِمُ قُوْمِيْ يَا ابْنَةَ الْخَيْرِ فَانْدُبِيْ
نُجُوْمُ سَمٰوَاتٍ بِأَرْضِ فَلَاتِ

"اے فاطمہؑ اٹھئے، اے رسولؐ کی بیٹی روئیے کہ آسمانِ جلالت کے ستارے زمین مسافرت و غربت پر پڑے ہیں۔"

قُبُوْرٌ بِبَطْنِ النَّهْرِ مِنْ جَنْبِ كَرْبَلَا
مُعَرَّسُهُمْ فِيْهَا بِشَطِّ فُرَاتِ

"اس میں سے بعض کی قبریں نہر فرات کے کنارے ہیں۔ کہ ان کا مسکن و مدفن لب فرات ہے۔"

فیاعین ابکیہم وجودی بعبرۃ
فقد ان لا ستکاب والھملات

"پس اے آنکھ ان کے مصائب پر گریاں ہو اور آنسو بہانے میں بخل نہ کر، کہ اب گریہ وزاری کا وقت آ پہنچا ہے۔"

دیار رسول اللہ اصبحن بلقعا
وآل زیاد تسکن الحجرات

"افسوس رسولِ خداؐ کے بھرے گھر تو برباد ہو جائیں اور زیاد کی اولاد عمدہ حجروں میں سکونت پذیر ہو"

بنات زیاد فی القصور مصونۃ
وآل رسول اللہ منھتکات

"دخترانِ زیاد تو بلند و بالا محلوں میں محفوظ ہوں اور رسولؐ خدا کی آل اسیر کر کے پھرائی جائے۔"

وآل رسول اللہ نحف جسومھم
وآل زیاد غلظ القصرات

"رسولؐ خدا کی اولاد کے جسم (دھوپ اور شبنم کی وجہ سے) لاغر ہوتے رہیں اور زیاد کی اولاد گلے میں مالا پہنے ہوئے مزے کرتی رہے۔"

کہتے ہیں کہ اس مرثیے کو سن کر امام علی رضا علیہ السلام بے قرار ہو گئے اور پسِ پردہ سے بھی فریاد و بکا کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔

بارھویں مجلس

اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم ط
بسم اللہ الرحمن الرحیم ط

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین وآلہ الطیبین الطاہرین۔ اما بعد فقد قال اللہ سبحانہ تعالیٰ فی کتابہ المجید وفرقانہ الحمید

بسم اللہ الرحمن الرحیم ط
انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا ○

"اے اہل البیتؑ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اللہ یہ چاہتا ہے کہ رجس کو تم سے دور کر دے اور تم کو ایسا پاک و پاکیزہ کر دے جیسا کہ پاک و پاکیزہ کرنے کا حق ہے۔"

قرآنی لٹریچر کے پڑھنے والے اور عربی ادب کے ماہر جانتے ہیں کہ "البیت" خانہ کعبہ کا نام ہے جب بغیر اضافت کے بیت کا ذکر آتا ہے تو اس سے وہی مخصوص گھر مراد ہوتا ہے جو اللہ کی طرف منسوب ہے سب ہی جانتے ہیں کہ بیت کمرے اور سونے کی جگہ کو کہتے ہیں اور دار گھر کو۔ ہر گھر میں بہت سے کمرے اور حجرے ہوتے ہیں۔ رسولؐ مقبول کے گھر میں بھی بہت سے حجرے تھے۔ اس لئے ازواج رسولؐ کے کمروں کو قرآن میں "بیوت" کہا گیا ہے۔
(وقرن فی بیوتکن)

اب اس آیت پر غور کیجیے ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ۔ اے خانہ کعبہ کے متولیو! اے البیت والو! اللہ کا یہ ارادہ ہے کہ تم سے ہر قسم کے رجس کو دُور کر دے اور تم کو پوری طرح پاک و پاکیزہ کر دے ۔ اس آیت کا تجزیہ کرنے کے بعد بعض لوگوں کے دلوں میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اہل البیت رجس سے آلودہ اور گناہوں اور خطاؤں سے ملوث ہوں گے ۔ تب ہی تو اللہ کو یہ ضرورت پیش آئی کہ وہ اُن کی پاکیزگی کا انتظام فرمائے لیکن تھوڑے سے غور اور تامل کے بعد یہ شبہ دُور ہو جاتا ہے ۔ کائنات کے ذرّے ذرّے سے یہ امر ہویدا ہے کہ یہاں جو چیز بھی ہے ارتقائی راہوں سے گزر رہی ہے ۔ قدرت کے اس کارخانے میں سکون و قرار محال ہے ۔ احتیاج و طلب کا تازیانہ ہر شئے کو حصولِ کمال کی دوڑا رہا ہے کمال کی کوئی حد نہیں ہے ۔ صانع مطلق اور نقاشِ کامل نے ہر چیز کو کامل ہی بنایا ہے مگر اپنے سے برتر کے مقابلے میں وہ ناقص نظر آتی ہے اور اسی لئے مزید کمال حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کرتی ہے ۔ اس کارخانۂ کائنات میں دھوم دھام اور زندگی کی چہل پہل اسی طلب و رسد کی بدولت ہے موجودات اور مظاہرات میں ہر چیز اگرچہ اپنی ذات میں کامل ہے ۔ مگر اپنے سے برتر کے مقابلہ میں ناقص ہے ۔ یہی نقص رجس، کھوٹ اور خرابی کہلاتا ہے اور اسی کے دور کرنے کے عمل کو تطہیر کہتے ہیں ۔ اگر آپ دُنیا کی موجودات کو جمادات ، نباتات و حیوانات اور انسان میں تقسیم کرتے ہیں تو پہلے جمادات پر نگاہ ڈال لیجئے ۔ جمادات اپنے مقام پر مکمل حیثیت کے مالک ہیں ان کی افادیت بھی مسلّم ہے ۔ لوہا کتنے فوائد رکھتا ہے ۔ چونا (کیلشیم) کس قدر سود مند ہے ۔ نمک کے فائدوں سے کون انکار کر سکتا ہے ۔ یہ سب چیزیں مکمل ہیں ۔ ان کو ناقص کون کہہ سکتا ہے لیکن ذرا نباتات سے ان کا مقابلہ کیجئے ۔ حیوانات کے سامنے رکھ کر دیکھئے ۔ انسان تو خیر بڑی چیز ہے اب صاف نظر آ جائے گا کہ اس میں ابھی بہت سے نقص ہیں ۔ یہ جمود کے

رجس سے آلودہ ہے ۔ نشو و نما کی صفت سے محروم ہے ۔ جہاں رکھ دو رکھا رہے گا ۔ جہاں ڈال دو پڑا رہے گا ۔ نقل و حرکت کی قوت اور چلنے پھرنے کی طاقت سے کوسوں دور ہے ۔ جماد کی اس فرد کو لے لیجئے جو قدر و قیمت کے لحاظ سے سرمایہ دارانہ سماج میں شاید زیادہ مقبول و مشہور ہے یعنی کوہ نور ہیرا ، بادشاہوں کے تاج اور شہنشاہوں کے تخت کی زینت بننے والا یہ انمول رتن ہر طرح کامل ہے اس سے زیادہ خوبصورت ، درخشاں ، خوش نما جماد اور کون سا ہوگا ۔ یہ شاہوار اور شاہ پسند ہیرا نہ مول میں کم نہ تول میں ۔ کوئی ہے جو جماد کی اس فرد کو ناقص کہہ سکے ۔ مگر ذرا نباتات کے مقابلے میں لائیے ۔ یہ انمول رتن دو پیسے کے مول ملنے والے ایک پودے سے بھی ناقص ہے ۔ اس میں جمود کا نقص ہے ۔ یہ نشو و نما سے محروم ہے ۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے اس کو تر و تازہ اور رقصاں نہیں کر سکتے ۔ اب آپ کوہ نور کو ہاتھ میں لے کر کہئے ۔ "اے درخشاں اور درفشاں ہیرے! میں چاہتا ہوں کہ تیرے اندر جو رجس ہے اس کو دور کر دوں اور نقائص سے تجھ کو ایسا پاک و پاکیزہ کر دوں کہ تو ہمہ تن کامل ہو جائے" ۔

لیجئے تطہیر کا عمل شروع ہوتا ہے ۔ جمادات سے جمود کا نقص نکال دیجئے ۔ نشو و نما (GROWTH) کی طاقت پیدا ہوئی اور چار چاند لگ گئے ۔ زمین کا لوہا ، چونا ، پوٹاشش جب جامہ نباتی پہن لیتا ہے تو ترقی کے زینہ پر ایک درجہ آگے بڑھ جاتا ہے ۔ مگر اللہ رے شانِ ایزدی ۔ ترقی کے پہلے ہی درجہ میں اس کو "اولیٰ بالتصرف" کی قوت حاصل ہو جاتی ہے ۔ یاقوت و الماس ، زمرد گوہر کو جو بات میسر نہ تھی وہ ٹکے کے پودے کو میسر ہو جاتی ہے ہاں دیکھئے اور غور سے دیکھئے کہ کوہ نور ایسا ہیرا بھی بے حس و حرکت پڑا تھا ، دوسروں کے ہاتھوں میں کھلونا بنا ہوا تھا ۔ یہ بھی چاہتا تو اس کو آلہ کار بنا لیتا ۔ مگر قوتِ نمو پا کر معمولی سے پودے میں یہ شانِ مولائی کہاں سے آ گئی کہ اپنے سے کم درجہ مخلوق پر تصرف کر رہا ہے

سخت سے سخت چٹان پر جڑیں جمائے کھڑا ہے ۔ ترکاری کے نرم سے نرم گلے سخت سے سخت زمین کو توڑ پھوڑ کر پھوٹ نکلے ہیں اور جمادی پیداوار کو بے تکلف اپنی غذا بنا رہے ہیں۔ چونے کی ضرورت پڑی ہے تو وہ آ موجود ہوتا ہے۔ لوہے کی خواہش ہوتی ہے ۔ تو وہ دست بستہ حاضر ہو جاتا ہے ۔ زمین اپنے سارے ذخیرے اس کے سامنے اُگل دیتی ہے ۔ دیکھتے دیکھتے یہ ننھا منا سا پودا کتنا خوبصورت نظر آتا ہے۔ آفتاب کی شعاعیں اس کی مشاطگی کا فرض ادا کر رہی ہیں ۔ اس کی شعاعوں کا شانہ اس کو بنا سنوار رہا ہے ۔ جب اس نے زمین سے منہ نکالا تھا تو زرد زرد نظر آتا تھا۔ آفتاب کی شعاعوں نے اس میں رنگ روپ بھر دیا ہے اور اب یہ دھانی جوڑا پہنے ہے ۔ ذرا سی دیر میں یہ رنگ اور بھی شوخ ہو جائے گا اور ایسا معلوم ہونے لگے گا کہ پرستان سے کوئی سبز پری آکر سامنے کھڑی ہو گئی ہے ۔ اب نباتات کی کسی ایسی فرد کو لے لیجئے جو عام نظریات کے مطابق مقبول و مشہور فرد ہو ۔ وہ دیکھئے گلاب کا پودا ہے ۔ سبز سبز پتے ، سرخ رنگ کے پھول ، خوشبو کا یہ حال کہ معلوم ہوتا ہے کسی نے عطر کے کنٹر اور پھلیل کے شیشے ہوا میں الٹ دیئے ہیں ۔

بلبلیں اس رنگ و بو کے مظہر اور بناوٹ سجاوٹ کے پیکر پر جان دیتی ہیں اور قمریاں اس کی سج دھج اور آن بان پر قربان ہیں ۔ خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہئے کیا قوتِ نمو کا یہ دلبرانہ مجسمہ ناقص ہے ۔ اس میں کوئی عیب ہے ۔ رجس ہے ، کھوٹ ہے ۔ خرابی ہے ۔

یہ جانِ چمن اور حاصلِ بہار تو قدرت کا شاہکار ہے اور فطرت کا دل کش نمونہ ہے ۔ اس میں کھوٹ نکالنے والا خود کھوٹا ہے اور اس میں عیب ڈھونڈنے والا خود احساس کمتری میں مبتلا معلوم ہوتا ہے ۔ مگر نہیں مگر نہیں اس کو حیوان کے مقابلے میں رکھئے ۔ یہ سدا بہار گلاب اپنے اندر کامل ہے ۔ مگر اپنے سے برتر جنس کے مقابل میں ناقص ہے ۔ آپ دیکھتے نہیں ہیں۔

ارتقاء کی دوڑ میں یہ بھی بہت پیچھے ہے ۔ ابھی تو اس کو جمود سے نجات ملی ہے ۔ صرف نشوونما ہی کی تو قوت حاصل ہوئی ہے ۔ حرکت نہیں ، قوتِ ارادی نہیں ، عقل و شعور نہیں ۔ آیئے اس کا یہ رجس اور کھوٹ دور کر دیں ۔

جمود کا رجس جمادی حالت سے نکل کر نباتی دنیا میں آتے وقت دور ہو چکا تھا ۔ اب سکون کا کھوٹ بھی دور ہو رہا ہے ۔ اور قدرت نقل و حرکت کی خلعت عطا کرتی ہے ۔ حیوانی جبلتوں سے سرفراز کرتی ہے ۔ دیکھئے تو سہی ٹکے کی چڑیا سینکڑوں روپیہ کے درخت سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے ۔

ادھر حیاتِ حیوانی کا عطیہ ملا اور ادھر تصرف و حکمرانی کے مزید اختیارات حاصل ہونے لگے ۔ دیکھتے دیکھتے ننھا منا سا پرندہ تناور درختوں پر حکمرانی کر رہا ہے ۔ شاخوں میں جھولتا ہے ، پتے توڑتا ہے ، پھولوں سے اٹکھیلیاں کر رہا ہے ، پھلوں کو چونچ کا نشانہ بنا رہا ہے ۔ یہ تو ننھے منے پرندے کا حال ہے ۔ مگر بڑے بڑے حیوان تو تناور درختوں کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیتے ہیں ۔ کسی درخت کی مجال نہیں کہ وہ اپنے آقا و مولا کے حکم سے سرتابی کر سکے جس طرف سے گزرتا ہے ۔ "الست اولی بانفسکم" کا نعرہ لگاتا ہوا نکلتا ہے ۔ اور "بلی" کی آوازیں آنے لگتی ہیں ۔

ننھا منا پرندہ ہو یا ڈیل ڈول والا ہاتھی ، اپنے اندر کامل ہیں مگر انسان کے مقابلے میں بہت پیچھے نظر آتے ہیں ۔ ابھی ان کے اندر بہت سے کھوٹ موجود ہیں ۔ وہ دور ہو جائیں تو تطہیر و تزکیہ کا عمل مکمل ہو ۔ ہاں شروع سے یہ بات عیاں ہوتی چلی آئی ہے کہ اللہ جس کو شرف بخشتا ہے ۔ اس کو اپنی اس مخلوق پر جو شرف کے لحاظ سے کم درجہ رکھتی ہے ۔ تصرف اور مولائیت کے حقوق عطا کرتا ہے ۔ نباتات کو جمادات پر تصرف کا حق حاصل ہے ۔ حیوانات نباتات کے مولا و آقا ہیں ۔ حضرت انسان حیوانات پر تصرف کا حق رکھتا ہے ۔ انسان کے کارنامے آپ کے سامنے ہیں ۔ پانی پر دوڑا دوڑا پھرتا ہے ۔ ہوا میں فراٹے

بھرتا ہے، شیر، ہاتھی، اونٹ، گھوڑے اس کی اطاعت کا دم بھرتے ہیں۔
(سخر لھم ما فی السمٰوٰت و ما فی الارض)

سب جانتے ہیں کہ مادہ ہر چیز کا ایک ہی ہے، سونا ہو یا لوہا، پتھر ہو یا گل و لالہ سب کی اصل ایک ہے۔ مگر شرف حصول کمال سے میسر ہوتا ہے۔ جو فرد جتنا کامل ہوتا جائے گا اتنا ہی صاحب شرف ہوتا جائے گا۔ کمال کہتے ہیں معیار تک پہنچنے کو، اسٹینڈرڈ کے مطابق ہونے کو، اللہ کے مقرر کئے ہوئے نمونے کے قریب آنے کو۔ اب جس فرد میں یہ خوبی جتنی زیادہ ہوگی وہ اتنا ہی صاحب شرف ہوتا جائے گا۔ سب کو معلوم ہے کہ اشیاء سالمات (ATOMS) سے مرکب ہیں۔ سالمات کی کمی اور زیادتی سے چیزوں کے خواص و فوائد ادلتے بدلتے رہتے ہیں پھر ایک ہی جنس، قسم اور صنف کے افراد میں بھی تفاوت ہوتا ہے مدارج ہوتے ہیں۔ افادیت اور فیض رسانی کے لحاظ سے چیزوں کی قدر و قیمت گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ الماس و زغال (ہیرے اور کوئلے) کی اصل ایک ہے۔ مگر ایک بادشاہوں کے تاج کی زینت ہے اور دوسرے کی دلالی میں بھی ہاتھ کالے ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ جو فرد جتنا مفید ہے، کارآمد ہے، فیض رساں ہے اتنا ہی زیادہ صاحب شرف ہے۔

حیوان نے اپنی جنس سے الگ ہٹ کر انسانی درجہ حاصل کیا۔

افادیت، فیض رسانی اور کارکردگی کے لحاظ سے انسان بہت بڑا درجہ رکھتا ہے۔ انسانوں کے اندر ہادی، رہبر، نبی، رسول اور اماموں کا درجہ اور بھی بلند ہے۔ مگر صاحب ارادہ، صاحب شعور، حکیم و علیم ہونے کے بعد بھی آدمی کی ترقی کی حد ختم نہیں ہو جاتی۔ ارتقاء کا میدان ابھی اور بھی وسیع و طویل ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اہل البیت ترقی کے زینے پر بہت اونچے چڑھ گئے تھے۔ غدیر کے میدان میں "الست اولی بکم من انفسکم" کہہ کر اور "بلی بلی" کی آوازیں سن کر رسولؐ نے فرما دیا تھا "من کنت مولاہ فھذا علیؑ مولاہ"، مگر اس کے باوجود انسانی خلقت کے اندر کچھ خامیاں اور کوتاہیاں فطری طور پر چھپی ہوئی ہیں۔ مثلاً ہم شکست و ریخت اور موت و فنا کی دست برد سے محفوظ نہیں ہیں۔ سال و ماہ ہم کو بچپن سے جوانی اور جوانی سے بڑھاپے کی سرحد میں لا ڈالتے ہیں۔ ہماری عملی قوتیں آہستہ آہستہ فرسودہ ہوتی رہتی ہیں۔ اور بالآخر ہم موت کی آغوش میں جا سوتے ہیں اللہ تعالے اہل البیتؑ کو اس کمی اور خامی سے نجات دلانے کے لئے ایک راستہ دکھاتا ہے۔ اور سدا بہار زندگی کی طرف دلالت کرتا ہے۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَاءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ۔ "اللہ کی راہ میں جان دو تو موت کی دست برد سے محفوظ ہو جاؤ گے اور سدا بہار باغوں میں ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہو گے۔"

کربلا کے میدان میں نہر فرات کے کنارے جب امام حسین علیہ السلام اور ان کے ساتھی اپنی جان کی بازی لگا رہے تھے تو وہ کسی زندگی سے بیزار انسان کی خودکشی نہ تھی یا کسی ضدی آدمی کا اقدام ہلاکت نہ تھا۔ وہ حیات جاوید کی تمنا اور ابدی زندگی کی خواہش تھی۔ جوان بہادروں کو ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لئے آمادہ کر رہی تھی۔ نوع انسانی کے یہ منتخب نمونے راہ خدا میں سر دینے کا سبق سکھا رہے تھے۔ اور اخلاقی اقدار کے یہ سربلند مظاہرے آدمی کو حیوانی جبلت سے نکل کر انسانی معیار پر آنے کی راہ دکھا رہے تھے۔

بھوک حیوان کو بھی لگتی ہے، انسان کو بھی بے چین کر دیتی ہے۔ مگر حیوان بھوک پر قابو نہیں پا سکتا۔ اور انسان تین شبانہ روز بھوکا پیاسا رہ کر بھی اپنے ہوش و حواس قائم رکھ سکتا ہے۔ بلکہ راہ خدا میں مردانہ وار جہاد کر کے رہتی دنیا تک اپنی دھاک چھوڑ سکتا ہے۔ اولاد کی محبت کا شعلہ حیوان کے دل میں بھی بھڑکتا ہے۔ اور انسان کے قلب و دماغ پر چھایا رہتا ہے مگر

حیوان مادری یا پدری شفقت کو راہِ حق کی طرف نہیں موڑ سکتا۔ وہ جب کبھی اولاد پر آنچ آتی دیکھے گا بے چین ہو جائے گا۔ اور حیوانی طاقت استعمال کر کے اس کو مرنے سے بچائے گا۔ مگر انسان راہِ حق میں اس کی قربانی بھی برداشت کرے گا۔

اکبرؑ سے جواں بیٹے کو مرتے ہوئے دیکھا
اور شکر کا سجدہ اسے کرتے ہوئے دیکھا

گھر سے محبت حیوان کو بھی ہوتی ہے اور انسان کو بھی، چھوٹی چھوٹی چڑیاں بھی اپنے آشیانے کو اجڑتا ہوا نہیں دیکھ سکتیں۔ مگر یہ انسان ہے جو بلند مقاصد اور اعلیٰ عزائم کی راہ میں گھر در تک کو نثار کر دیتا ہے۔ اور اس طرح اپنی ذات کو حیاتِ جاوید کا مستحق قرار دیتا ہے۔ حیاتِ انسانی کا کارواں بہت دور سے آ رہا ہے۔ شاہراہِ حیات کے ہر موڑ پر اللہ کے منتخب بندوں نے اس کی رہنمائی کی ہے۔ اور انہی کی بدولت مٹھی بھر خاک کا یہ پتلا عرش کے مکینوں سے بھی آگے بڑھتا رہا ہے۔ ترقی کی اس دوڑ میں اس کو عفریتوں، طاغوتوں اور ابلیسوں کا بھی مقابلہ کرنا پڑا ہے۔ مگر جان دے کر نئی زندگی حاصل کرنے اور سر دے کر سردار بننے کی خصلت و عادت نے اس کو مر مر کے جلایا ہے اور مٹ مٹ کر اُبھرنے پر آمادہ کیا ہے۔ عاشورہ کی صبح جب امام حسین علیہ السلام نے اپنی مختصر سی فوج کو صف آرا کیا تو جنّت میں ان کا مقام اور ابدی زندگی میں ان کا موقف دکھا کر کہا "بتاؤ تم میں سے کون جنّت کے سدا بہار باغوں کا خواہاں اور وہاں کی ابدی نعمتوں کا طلب گار ہے" حسینؑ کے فیضِ صحبت نے ان کو بتا دیا تھا کہ موت فنا کا ذریعہ نہیں بلکہ بقا کا راستہ ہے۔ اسی پُل پر سے گزر کر انسان خلد کی زندگی پاتا ہے اور اگر اس مقام پر اس کے قدم ڈگمگا جائیں تو وہ خاک کا ڈھیر اور مٹی کا تودہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس لئے ان میں سے ہر ایک نے موت کی تمنّا کی اور صرف تمنّا ہی نہیں کی بلکہ عمل سے ثابت کر دیا کہ وہ موت سے اسی طرح مانوس تھے۔ جس طرح

دولھا عروسِ نو سے مانوس ہوتا ہے۔ یہی جذبہ تھا جس نے نوجوان علی اکبرؑ کو خاک و خون میں لوٹتے وقت بھی یہ یاد دلایا کہ وہ اپنے والد سے یہ فرما رہے تھے "ابا جان! اب دل میں کوئی آرزو نہیں ہے۔ صرف یہ چاہتا ہوں کہ وطن کے نوجوانوں کو میرا یہ پیام پہنچا دیا جائے۔ کہ تمہارا جوان ساتھی پیاسا شہید ہوا ہے۔ جب کبھی پانی پیو تو اپنے پُرشباب دوست کی پیاس ضرور یاد کر لینا۔" ہاں یہ ذات کی یاد دہانی نہ تھی۔ مقصد اور مسلک کی نقابت تھی۔ علی اکبرؑ! مسلمان نوجوانوں کو "مسلکِ حسینیؑ" کی دعوت دے رہے تھے۔ ان کو باطل کے خلاف صف آرا ہونے پر آمادہ کر رہے تھے۔ پھر جس قوم کے نوجوان آمادۂ عمل ہو جائیں۔ اس کی کامیابی میں کون شک کر سکتا ہے۔

حضرت عباسؑ کے ہاتھ میں جو عَلم تھا وہ بہتّر سپاہیوں کی مختصر فوج ہی کی علمداری نہیں کر رہا، بلکہ کرۂ ارض پر رہنے والے سارے حرّیت پسندوں اور آزادی خواہوں کی نقابت کے لئے سربلند ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ عَلم آج بھی دنیا کے ہر حصے میں تزک و احتشام کے ساتھ برآمد ہوتا ہے۔ مغلوب اور پسماندہ قوموں کے افراد آزادی کی خواہش میں اور آزاد لوگ سیاسی، سماجی اور معاشی انصاف کی طلب میں اس عَلم کے گرد جمع ہو جاتے ہیں جب تک دنیا سے غلامی کا خاتمہ نہ ہو گا اور جب تک سماجی عدل عام ہو جائے گا۔ یہ عَلم برابر بنی آدم کی ہر مہم کی رہبری کرتا رہے گا۔

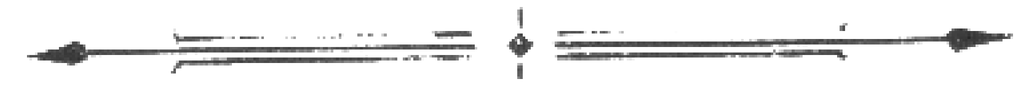
کیا آپ نے کبھی ننھے علی اصغرؑ کا جھولا لٹکتا ہوا دیکھا ہے۔ ایک چھوٹی سی لحد بنی ہوئی ہے۔ اس میں تیر پیوست نظر آتے ہیں۔ خون بھری چادر اوپر پڑی ہے چھوٹا سا عمامہ سرہانے رکھا ہوا ہے۔ دنیا کی مائیں اس دلخراش منظر کو دیکھیں اور یاد کریں کہ سامراجی طاقتیں اور سرمایہ داری کے عفریت اپنی حرص و آز کے لئے معصوم بچوں تک کو قتل و ذبح کرتے آئے ہیں۔ کس دُکھ درد سے حوّا کی بیٹیاں بچوں کو خلعتِ حیات بخشتی ہیں۔ اور کسی بے دردی سے شیطان کی اولاد

ان کو ظلم وستم کا نشانہ بناتی رہتی ہے۔ یہ علی اصغرؑ کا لاشہ، ظالم وجابر حکومتوں کے خلاف ایک دائمی مظاہرہ ہے، ماؤں کا مستقل احتجاج اور مسلسل شکوہ ہے کہ

"گویا چھوٹے امام زادے کا یہ جھولا اولاد والوں کو اس نقطہ پر مجتمع کرنے کی دعوت دیتا ہے کہ آپس میں مل جل کر کوا ایسا قانون بناؤ جو معصوم بچوں کی جان کی تو حفاظت کر سکے۔"

اے دکھ درد کی ماری نوع بشر! تیرے انتظار کے دن ختم ہونے والے ہیں۔ حسینؑ کی عزاداری دنیا کے ہر حصے میں پھیلتی جا رہی ہے۔ یہ مظلوم سے ہمدردی کا سبق دے گی۔ اور ظالم اور اس کے ظلم کے خلاف عام نفرت پھیلائے گی۔ پہلے دنیا طاقت اور اقتدار کی پرستار تھی۔ اور کمزوروں کے ساتھ زبانی ہمدردی بھی کرنا نہ چاہتی تھی "عزائے حسینؑ" اس فضا کو بدلتی جا رہی ہے۔ اب دنیا کے کسی ملک میں "وزارتِ جنگ" نہیں ہے "وزارت دفاع" ہے۔ یعنی زبانی ہی سہی یہ سب نے مان لیا ہے کہ جارحانہ حملے کا حق کسی کو نہیں ہے "تلوار صرف دفاع کے لئے اٹھائی جا سکتی ہے۔ یہ" دعوت حسینیؑ "کی بڑی فتح ہے۔ زبان تک یہ بات آگئی ہے تو شرمندۂ عمل بھی ہو کر رہے گی۔ اور اس وقت سارا عالم "حسینؑ حسینؑ" کہے گا۔

انسان کو بیدار تو ہو لینے دو
ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؑ



تیرھویں مجلس

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم ط بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم ط الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی اشرف الانبیاء والمرسلین وآلہ الطیبین الطاہرین۔ اما بعد فقد قال اللہ سبحانہ تعالیٰ فی کتابہ المجید وفرقانہ الحمید

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم ط

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ۔

"وہ معبود جس نے اُمیّوں میں ایک رسول بھیجا جو اُنہی میں سے تھا، اللہ کی آیتیں ان کو پڑھ کر سناتا تھا، ان لوگوں کا تزکیہ کرتا تھا اور اُن کو الکتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا تھا۔"

اُمّی سے مراد ان پڑھ ہو یا ام القریٰ (مکہ) کا رہنے والا ہمارے رسول مقبولؐ دونوں گروہوں سے تعلق رکھتے تھے۔ کسی مکتب، مدرسہ، دار العلوم سے تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ اس لئے اُمّی تھے۔ آپ کا خاندان سینکڑوں سال سے مکہ کی سرزمین پر آباد تھا۔ اس لئے آپ اُمّ القریٰ کے باشندے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ ہم نے مکے کے رہنے والے ان پڑھ لوگوں پر یہ احسان کیا کہ ایک رسول انہی کی قوم، قبیلے اور جماعت سے پیدا کر دیا جو ہماری آیتیں ان کو پڑھ پڑھ کر سناتا تھا اور ان کے دل و دماغ، جسم و روح، جذبات و حسیات و فہم و عقل، نظر و عقل پر جو زنگ لگ چکا تھا اس کو دور کر کے، مانجھ کے ان کو الکتاب کی تعلیم

دیتا تھا۔ حکمت اور دانائی کا سبق پڑھاتا تھا۔ اربابِ عقل واقف ہیں کہ رسول کریمؐ علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی آمد سے پہلے دنیا کے قلوب واذہان پر دو قسم کے زنگ چڑھے ہوئے تھے۔ کچھ افراد اور اقوام تو جہالت، ناواقفیت نادانی اور نافہمی کا شکار تھیں اور بعض افراد و اقوام نام نہاد علم و حکمت حاصل کر کے دنیا کو اپنے دامِ تزویر میں پھنسا رہی تھیں۔ یہ کرۂ ارض دو حصوں میں تقسیم ہو کر رہ گیا تھا۔

(۱) سادہ لوح افراد جو شاطروں کا شکار بنے ہوئے تھے۔

(۲) شاطر، چالباز، اور گندم نما جو فروش لوگ جو دوسروں کی عقل و فراست پر چھاپہ مار کر اپنا الو سیدھا کرتے تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کی اصل غرض یہ تھی کہ وہ انسان کے دل و دماغ اور نیت کا تزکیہ کریں۔ اس کو یاد دلائیں کہ اس دنیا میں جو مخلوق بستی ہے اس کو خدائے واحد نے پیدا کیا ہے۔ وہی اصل میں اس کائنات کا مالک و مختار ہے اور ہم سب کو ایک دن اس کی طرف واپس ہونا ہے۔ لہٰذا یہاں ہم کو کوئی کام ایسا نہیں کرنا چاہیئے کہ کل اس کے دربار میں جاکر ندامت اور شرمندگی اٹھانی پڑے اللہ خبیر و علیم ہے حکیم و شہید ہے۔ اس لئے ہم اس کو دھوکہ نہیں دے سکتے اور اس کے دسترس اور گرفت سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے۔

جس زمانے کا یہ ذکر ہے اس وقت لوگ جہالت پر نازاں رہا کرتے تھے۔ اور اپنے اُمّی ہونے پر فخر کرتے تھے۔ علم ایک محدود طبقہ کی اجارہ داری ہو کر رہ گیا تھا۔ دیوتاؤں کے مندروں، درویشوں کی خانقاہوں اور دینی و مذہبی اداروں کے سوا علم دوسری جگہ پر نظر نہیں آتا تھا۔

لوگ یہ سمجھتے تھے کہ عملی زندگی اور چیز ہے۔ اور علم ایک قسم کی دماغی عیاشی ہے جو صرف ان لوگوں کے لئے محدود و مخصوص ہے جو عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں رکھتے بلکہ صرف دماغی تعیش میں مبتلا رہتے ہیں۔ وہ بچے جو راہبانہ زندگی گزارنے اور مجرد رہنے کے لئے سدھائے جاتے تھے تعلیم و تعلم سے بہرہ یاب ہوتے تھے

اور جن کے اوپر معاشرے کی ذمہ داری، جہانبانی و جہانگیری کا بار پڑنے والا ہوتا تھا ان کو جاہل رکھا جاتا تھا۔

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خداوندِ عالم کے فرشتے نے جب پہلی مرتبہ غارِ حرا میں مخاطب کیا تو "اِقْرَاْ" یعنی "پڑھ" کہا۔

اُمّی عرب "پڑھنے لکھنے" کے فن کو معیوب سمجھتے تھے۔ اللہ نے اس قوم کی ہدایت کے لئے جس نبی کو بھیجا اس کی توجہ پہلے پہل قرات و کتابت کی طرف مبذول کرائی۔ اور قلم کی بدولت انسان نے جو ترقی کی ہے اس کی نشان دہی کی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ عرب جو اُمّی ہونے پر فخر کیا کرتے تھے معلم بن گئے۔ اور تلوار کی طرح ان کے قلم کا بھی لوہا دنیا نے مان لیا۔

کون سا علم ہے؟ کون سا فن ہے؟ جس میں عربوں نے ترقی نہ کی ہو، قرطبہ وغرناطہ سے لے کر قیروان، قاہرہ، اسکندریہ، دمشق، بغداد، شیراز، نیشاپور دہلی، سمرقند، بخارا، پیکنگ کی سرزمین پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ علم و فن کی روشنی ان عرب استادوں کے دم سے پھیلی جو کسی زمانے میں جہالت کے ماتے اور بدویت کے علمبردار تھے۔ رسولِ کریمؐ کی تربیت کا یہ بھی اعجاز تھا کہ ان کے فیوض و برکات سے جن لوگوں نے قرار واقعی فائدہ اٹھایا وہ بیک وقت تلوار اور قلم دونوں کے دھنی ہو گئے۔

تاریخ کے اوراق پر ان بزرگ ہستیوں کی داستانیں اور مشاہیرِ عالم کی کہانیاں بکھری پڑی ہیں جنہوں نے آنحضرتؐ کے فیضِ صحبت سے بہرہ مند ہو کر میدانِ جنگ اور بزمِ علم دونوں میں نام پیدا کیا۔ فضل و کمال کے جھنڈے گاڑے اور مہارتِ فن اور طہارتِ عمل کے سکے چلائے۔

اربابِ تاریخ جانتے ہیں کہ حضرت علیؑ نے رسولِ کریمؐ کے ہاتھوں پر پہلی مرتبہ آنکھیں کھولی تھیں اور وہ رسولؐ کے دمِ واپسیں تک ان کے ساتھ رہے۔ اس لئے قدرتی طور پر آپ کی تربیت اور تعلیم کا بہترین اثر اسی شاگرد کے اندر نمایاں ہونا چاہیئے۔ اور

یہ بات چھپی ڈھکی نہیں ہے کہ حضرت علیؑ کی زندگی اگر ایک طرف ان کے جسمانی کمال کی مظہر ہے تو دوسری طرف ان کے علمی مدارج کی بھی نشان دہی کرتی ہے۔ میدانِ جنگ میں ان کی دلیرانہ شمشیر زنی کا اعتراف رسولِ اکرمؐ نے ان الفاظ میں کیا ہے:-

"لافتیٰ اِلّا علی لاسیف اِلّا ذوالفقار" "ضربۃ علی یوم الخندق افضل من عبادۃ الثقلین"

(علیؑ کے سوا کوئی بہادر نہیں اور ذوالفقار کے سوا کوئی تلوار نہیں)
(خندق کی لڑائی میں علیؑ کی ایک ضرب جن و انس کی عبادت سے بہتر ہے)

اور ان کے علمی کمالات اور دماغی صلاحیتوں کی ان الفاظ میں داد دی ہے:-

انامدینۃ العلم وعلیٌ بابہا۔ (میں شہرِ علم ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہیں)

بیان ہو چکا ہے کہ رسولِ اکرمؐ سے پہلے علم و فضل خانقاہوں، مندروں اور راہب خانوں سے متعلق سمجھا جاتا تھا۔ اس کو عملی زندگی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ پرانے زمانے میں مصر کے مندر علم کا مرکز تھے۔ یونان کے دیوتاؤں کے معبد کاروبارِ دین و دانش کے لئے مخصوص ہو کر رہ گئے تھے۔ گرجا اور خانقاہیں درس و تدریس کو اپنی اجارہ داری سمجھتی تھی اور قدیم ہند میں تو برہمن کے علاوہ اگر کوئی دوسرا ویدوں کے الفاظ گوش زد کرنے کی جرأت کرتا گرم گرم سیسہ اس کے کان میں ڈال کر اس کو ہمیشہ کے لئے بہرا کر دیا جاتا تھا۔ اس پس منظر پر نظر ڈالئے اور پھر رسولِ مقبولؐ کے فرمان پر غور کیجئے۔ ارشاد ہوتا ہے:-

"ـــــ میں اس علم کا ذکر نہیں کرتا جو آدمی کو شہری زندگی سے دور رکھ کے خانقاہوں، مندروں اور جنگلوں میں محدود ہونے کا سبق سکھاتا ہے۔ میں اس علم سے بھی تعلق نہیں رکھتا جو صرف دماغی عیاشی اور ذہنی و قلبی کیف میں مست رکھتا ہے۔ میں علم کا شہر ہوں، یعنی اس علم کا مرکز ہوں جو عائلی، قبائلی اور شہری ذمہ داریوں کا حامل ہے۔ رواج

دینے والا ہے، انسان کی جملہ قوتوں کو بروئے کار لا کر اس کو مفید اور نفع بخش بناتا ہے۔ میں شہرِ علم ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہیں۔"

جن لوگوں نے حضرت علیؑ کی زندگی پر نگاہ ڈالی ہے وہ جانتے ہیں کہ آپ کمالاتِ بشری کے جامع تھے۔ دنیا کے اکثر دوسرے مذہبی پیشواؤں کی طرح آپ کی زندگی کا کوئی ایک رُخ تابناک اور دوسرا تاریک یا کم از کم اُجاگر نہ تھا۔ آپ نے ہر شعبۂ حیات میں حصہ لیا اور جو کام کیا اس کو حدِ کمال پر پہنچا کر چھوڑا۔ فنِ جنگ میں آپ کی مہارت ایسی تھی کہ آج تک سپاہی، لشکری، علمدار اور سپہ سالار آپ کا نام لے کر میدان میں اترتے ہیں اور پہلوان آپ کا نام سن کر ادب سے کان پکڑتے ہیں۔

عبادت کا یہ عالم کہ تلواروں کے سائے اور تیروں کی بارش میں نمازیں پڑھیں اور خضوع و خشوع میں فرق نہ آیا۔ استغراق و محویت کا یہ حال کہ پاؤں میں پیوست تیر نکال لیا گیا۔ اور خبر تک نہ ہوئی۔ جود و سخا کا کیا کہنا، روٹی کے سائل کو اونٹوں کی قطار دیدی۔ بھکاری کو دین و دنیا دونوں دے کر مالا مال کر دیا۔ عدل و داد کا ذکر، یمن کوفہ اور بصرہ کی عدل گاہوں سے پوچھئے اور زورِ خطابت اور حسنِ تقریر کا حال مسجدِ نبوی، منبرِ کوفہ اور صفین و جمل کے میدانوں سے دریافت کیجئے۔ جہاں حضرت کے دہنِ مبارک سے نکلے ہوئے خطبے فضا میں نشر ہو کر گوش زدِ عام و خاص ہوئے۔ اور جن کی صدائے بازگشت آج بھی نہج البلاغہ کے صفحات پر گونج رہی ہے۔

عرب کی جہالت مشہور ہے۔ اس شتربان قوم کو علم و دانش سے روشناس کرنے کا کام محمدؐ و آلِ محمدؐ ہی کا کارنامہ ہے۔ ورنہ بنی اُمیہ نے تو اس کو ایک بار پھر دورِ جاہلیت کی طرف دھکا دے دیا تھا۔ اور وہ اونٹ گھوڑے اور خچر پر سوار ہو کر قیصر و کسریٰ کے خزانے لوٹنے کے لئے گھر سے نکل پڑے تھے۔

یہ صحیح ہے کہ اس وقت ہر بدو کا گھر سونے چاندی سے بھر گیا تھا۔ اور ہر عرب جہانگیر و جہانبان بنا ہوا تھا لیکن جب مصر، ایران، روما اور یونان کی پرانی تہذیب عربوں کی سادہ زندگی سے ٹکرائی جب ان قدیم ملکوں کے علم و دانش کا محل اور

ردِ عمل عربوں کے دل و دماغ پر ہوا تو سینکڑوں مکاتبِ فکر، فرقے اور مذہب پھوٹ نکلے۔ کوئی عیسائی راہبوں اور بدھ مت کے بھکشوؤں کی تقلید میں ترکِ دنیا، تجرد اور خانقاہی زندگی کی رو میں بہہ نکلا۔ کوئی سکندر، دارا اور اسفند یار کے قصے سن کر سامراجی عظائم کا حامی و علم بردار بن گیا۔ کسی نے یونانی سوفطائیوں اور اسکندریہ کی متکلموں کی طرح قرآن و حدیث کو عقلی گھڑ دوڑ کا میدان بنا دیا۔ اور کسی نے تال و سُر کے ساتھ قرآن اور دف و طبل کے ساتھ حدیث کا راگ الاپ کر معانی کو الفاظ اور خوشں الحانی کے اندر گم کر دیا۔

اس وقت اہلبیت کرامؑ ہی کا دم تھا جنہوں نے عدل و توازن قائم رکھا اور مسلمانوں کو بتایا کہ نہ دین ترکِ دنیا اور رہبانیت کا نام ہے نہ گھوڑے پر چڑھ کر تاخت و تاراج اور لوٹ مار کو جہاد کہتے ہیں۔ لیس منا من ترک الدنیا للاخرۃ و من ترک الاخرۃ للدنیا (وہ جو آخرت کا بہانہ کر کے دنیا کا کاروبار چھوڑ دے اور جو دُنیا میں پھنس کر آخرت کو بھول جائے یہ دونوں ہماری جماعت سے باہر ہیں)

جب اموی تاجداروں کی فوجی تاخت و تاراج مسلمانوں کی مادی فتوحات کا دائرہ وسیع کر رہی تھیں اور ان کو اپنے دینی اور روحانی ورثہ کی طرف سے غافل بنا رہی تھی، جب قدیم ایشیائی اقوام کے علمی اور ثقافتی سرمایہ کے سامنے عرب کے بدو بغلیں جھانکتے تھے اور یہ خوف پیدا ہوگیا تھا کہ عنقریب بیت کا گھر ڈھیر ہو کر رہ جائیگا اور عربوں کا سامراجی گھروندہ کسی برتر فوجی تنظیم کے پہیئے کے نیچے کچل کر ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔ اس وقت امام زین العابدین امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہم السلام ہی تھے جنہوں نے علوم و فنون کے مرکز قائم کئے اور ممالکِ اسلامیہ سے طالب علموں کو دعوت دے کر اسلامی علوم و ثقافت کی ترویج کی، حدیث، فقہ، تفسیر اور سیرت کا درس جاری کیا۔ اور چین، ہند، ایران، مصر، یونان اور روما کے ان علمی حملوں اور عقلی ایرادوں کا مقابلہ کیا جو اسلامی معلومات کے بلند قلعہ پر بمباری کر رہے تھے۔ اگر مدینہ میں حضرت

باقر العلوم اور حضرت جعفر صادق علیہما السلام کے درس جاری نہ ہوتے تو جابر بن حیان کے جیسے شاگرد وجود میں آتے۔ جن کو دنیا علم الکیمیا کا بادا آدم مانتی ہے۔ نہ امام ابو حنیفہ پیدا ہوتے جنہوں نے فقہ کی شاہراہ دکھائی اور تدوینِ قانون کی بنیاد رکھی آگے چل کر جن علوم و فنون کی ترویج و تدریس نے مسلمانوں کو معلم عالم بنا دیا وہ ان درسوں کا فیض تھے جو آئمہ اہل بیتؑ نے مدینہ میں جاری کئے تھے۔ امام ابو حنیفہ جن کے فقہی اجتہادات کروڑوں مسلمانوں کے دل و دماغ کو تسکین بخشتے ہیں۔ فرمایا کرتے تھے۔ لولا سنتان لهلك النعمان" وہ دو سال نہ ہوتے جو میں نے امام محمد باقرؑ کے درس میں گزارے تو میں نعمان تو تباہ ہوگیا تھا۔"

آج یورپ ایجادات کی دوڑ میں بہت آگے ہے۔ امریکہ جو دراصل یورپ ہی کی ثقافت کا فرزند ہے۔ کارِ زمین کے ساتھ ساتھ کارِ آسمان کے مشاغل میں بھی پیش پیش ہے۔ لیکن یہ نہ بھولیئے کہ تحقیق و تدقیق اور ایجاد و اختراع کے اصل بانی مسلمان ہی تھے انہوں نے کرۂ ارض کو ازمنہ مظلمہ سے نکالا۔ اور نوعِ انسانی کو جہالت، تعصب اور دھڑے بندی کی دلدل سے نکال کر علمی تلاش و جستجو کی شاہراہ پر ڈالا۔

شب و روز اللہ کو رب العالمین کہہ کر پکارنے والے بندے نے محسوس کر لیا۔ کہ اللہ کی ذی عقل مخلوق زمین ہی تک محدود نہیں بلکہ

"ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں"

کائنات میں بہت سے جہان ہیں اور ہر جہان میں اللہ کا نظام ربوبیت کام کر رہا ہے۔ اس نظام کا دارومدار رحمت پر ہے۔ کیونکہ ذاتِ احدیت خود رحمان و رحیم ہے۔ وہاں عدل و توازن قائم رکھنے کے لئے جزا و سزا اور مکافات کا قانون جاری و ساری ہے (مالك يوم الدين) جو جیسا بوتا ہے ویسا ہی کاٹتا ہے۔ ہر عمل کا ایک فطری نتیجہ اور قدرتی اثر ہوتا ہے اور کوئی مخلوق اپنے اعمال کے نتیجہ سے بھاگ کر نہیں جا سکتی۔ ہر عمل کے آخری جزا و سزا کے لئے ایک وقت مقرر ہے (یوم الدین) اس وقت کھوٹے کھرے اور اچھے بُرے کی پرکھ ہو جائے گی۔ نا درکار زندہ اپنے کئے کے مطابق سزا و

دھنسا پائے گا۔

از مکافاتِ عمل غافل مشو
گندم از گندم بروید جو ز جو

عقیدہ توحید نے وحدتِ کائنات کا تصور پیدا کیا اور تصورِ رحمت نے یہ سکھایا کہ یہاں جو چیز بھی ہے وہ ایک خاص سلیقہ اور آراستگی کے ساتھ پیدا ہوئی ہے۔ اور اپنے اندر کوئی مقصد رکھتی ہے۔ رحمت کا تقاضا ہے کہ رات کے اندھیرے کے بعد دن کا اُجالا ہوتا کہ ہم کاروبارِ معاش میں حصہ لے سکیں اور دن بھر کے کسل و تکان کے بعد رات کا سکون بخش اندھیرا طاری ہو تاکہ ہم آرام لے سکیں اور اگلے دن پھر تازہ دم ہو کر اٹھیں۔ گرمی کی چل چلاتی دھوپ اور جھلس دینے والی لُو کے بعد بارش کا موسم آئے۔ پھر جاڑے کے خنک ہاتھ ہم کو حرارت کا ذخیرہ کر لینے پر آمادہ کریں اور جسم کی قوتِ مدافعت بڑھے اور توانائی اور قوتِ برداشت میں اضافہ ہو۔ سردی کھانے سے تنگ آ گر جائیں تو موسمِ بہار آ موجود ہو۔ نخل و شجر اپنی وردی بدلیں اور پودے پھولوں سے لد جائیں۔ یہ سب کچھ اللہ کی صفتِ رحمت کا ظہور ہے کہ وہ تغیر و تنوع کے ذریعہ سے ہماری زندگی کی اکتا دینے والی یکسانیت کو بدلتا رہتا ہے۔ اور یہ زندگی اجیرن ہونے کے بجائے قابلِ برداشت بلکہ خوشگوار معلوم ہوتی ہے۔

عقیدۂ عدل نے بتایا کہ کارخانۂ قدرت میں کہیں ظلم و عدوان نہیں ہے۔ اللہ کا قانون عدل و توازن پر مبنی ہے۔ اس کا فیض و کرم سب کے لئے ہے۔ یہ نہیں ہے کہ وہ افریقہ والوں کو محروم رکھے اور امریکہ والوں کو مالا مال کر دے۔ رام دین کو دھن دولت دیدے اور عبداللہ کے حصہ میں فاقہ مستی لکھ دے۔ ہاں قدرت کے کچھ قوانین ہیں جو ان پر کاربند ہے دونوں جہانوں میں نہال ہے۔ جو اُن پر نہیں چلتا وہ دونوں جہان میں مارا جاتا ہے۔

مغرب کی قومیں اگر پہلے حرماں نصیب تھیں تو اپنے اعمال کی وجہ سے تھیں۔ (لیس للانسان الا ما سعیٰ) اور آج اگر دولت سے کھیل رہی ہیں تو اپنی کوشش

اور سعی کی وجہ سے مشرق نہ ہمیشہ سے بھوکا ننگا ہے نہ ہمیشہ اس حال میں رہے گا۔ جد و جہد اور سعی و جستجو کا مادہ جتنا بڑھتا جائے گا حالات اسی قدر سدھرتے رہیں گے۔ مگر دولت کی افراط اور مادی استیلاء معراجِ انسانی نہیں ہے۔ سمندر میں جہاز دوڑانے اور پاتال کی خبر لانے سے آدمی انسان نہیں بنتا۔ ہوا کو مسخر کرنے سے کسی فرد یا قوم میں سربلندی پیدا نہیں ہوتی جب تک جسم و روح اور اخلاق و عادات کا تزکیہ نہ ہو۔ آدمی اپنے خالق کو پہچان کر اس کے احکام پر نہ چلے۔ اس وقت تک کرۂ ارض کا یہ بحران ختم نہیں ہو سکتا۔

ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انسانی نفوس کا تزکیہ کرنے کے لئے آئے تھے۔ ان کی تعلیم نبی آدم کو انسانی اخلاق اور اخلاقی اقدار کے حدود بتاتی ہے۔ اخلاقی تعلیم اور انسانی حقوق کا صحیح اندازہ نہ ہو تو آدمی نمرود، فرعون، مسولینی، ہٹلر تو بن سکتا ہے مگر عبداللہ نہیں بن سکتا۔

اللہ مولانا رومؒ کو جزائے خیر دے، انہوں نے اپنی مثنوی میں لکھا ہے ؎

از علیؑ آموز اخلاصِ عمل
شیرِ حق را داں منزّہ از دغل

(حضرت علیؑ سے سیکھو کہ عملِ خالص کیسا ہوتا ہے، حق کے اس شیر کو دھوکے اور فریب سے پاک سمجھو)

در غزا بر پہلوانے دست یافت
زود شمشیرے بر آورد و شتافت

(کسی لڑائی میں حضرتؑ نے ایک پہلوان پر غلبہ پایا اور جلدی سے تلوار کھینچ کر دوڑے)

تا جدا گرداندش سر از بدن
او زغصہ زد بر اُو آبِ دہن

(تاکہ اس کا سر بدن سے جدا کر دیں، مگر اس نے غصہ میں آ کر اپنا آبِ دہن حضرتؑ پر پھینکا)

چوں خیو انداخت بر روئے علیؑ
افتخارِ ہر نبی و ہر ولی

(جب اس پہلوان نے حضرت علیؑ کے روئے مبارک پر آب دہن پھینکا، کون علیؑ؟ وہ علیؑ جو ہر نبی اور ہر ولی کے لئے باعثِ فخر ہیں)

ذوالفقار انداخت از دست و نشست
ترک قتلش کرد و شد از ذوق مست

(تو آپ نے ہاتھ سے ذوالفقار پھینک دی اور (چپ) بیٹھ گئے۔ اس کے قتل کا ارادہ ترک کر دیا اور ذوق و شوق میں محو ہو کر رہ گئے)

گشت حیراں آں مبارز زیں عمل
از نمود عفو و رحمت بے محل

(وہ پہلوان اس عمل سے حیران ہو کر رہ گیا۔ کہ اس کو عفو و رحمت کا یہ اظہار بے محل نظر آتا تھا)

گفت بر من تیغ تیز افراشتی
از چہ افگندی چرا بگذاشتی

(اس نے سوال کیا آپ نے مجھ پر تیز تلوار اٹھائی تھی، پھر کس لئے ڈال دی اور کس لئے چھوڑ دیا۔)

گفت من تیغ از پئے حق می زنم
بندۂ حقم نہ ماموِر تنم

(فرمایا میں راہِ حق میں تیغ زنی کرتا ہوں، بندۂ حق ہوں، اپنے نفس کا بندہ نہیں ہوں)

چوں خیو انداختی بر روئے من
نفس جنبید و تبہ شد خوئے من

(جب تو نے میرے منہ پر آپ دہن ڈالا تو میرا نفس حرکت میں آگیا اور میرا مزاج

برہم ہو گیا)

نیم بہرِ حق شد و نیمے ہوا
شرکت اندر کارِ حق نبود روا

(آدھا حق کے ساتھ رہا اور آدھے پر نفس غالب آگیا، کارِ حق میں باطل کی شرکت روا نہیں ہوتی)

شیر حقم نیستم شیرِ ہوا
فعلِ من بر دینِ من باشد گواہ

(میں حق کا شیر ہوں، ہوا و ہوس کا بندہ نہیں، میرا یہ فعل میرے دین پر گواہ ہے

میدانِ جنگ میں جب لوہے سے لوہا ٹکراتا ہے اور انسانی مزاج خونریزی کی طرف کلیتاً مائل ہو جاتا ہے۔ کسی کا اپنے عقل و ہوش پر اس قدر قابو رکھنا اس کے تزکیہ نفس کی بہترین دلیل ہے۔ اسلام بھی خونریزی کے خلاف ہے۔ جو خونریزی نفس پرستی، خود غرضی اور فتنہ و فساد کے لئے کی جائے۔ لیکن اگر خونریزی مدافعانہ ہو اور فساد کو روکنے کے لئے کی جائے تو وہ ہزار صلح و آشتی سے بہتر ہے۔ دین کی تبلیغ کے لئے تلوار نہیں اٹھائی جا سکتی۔ افراد و اقوام کو غلام بنانے کے لئے شمشیر زنی نہیں کی جا سکتی۔ کسی کو جبراً اپنے عقیدہ کا پابند بنانا عقیدہ کا مذاق اڑانا ہے۔ مگر جب حریف لڑائی پر اتر آئے اور تیغ بکف ہو کر آپ کے اوپر حملہ کر دے تو ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانا نہ صرف بزدلی ہے بلکہ مفسد کی حوصلہ افزائی کرنا ہے۔ اگر مفسدوں اور فتنہ پردازوں کے حملوں کا جواب نہ دیا جائے تو یہ کرہ ارض جہنم بن کر رہ جائے۔ اور شریر لوگ امن پسند شہریوں کو ایک لمحہ زندہ نہ رہنے دیں۔ اس لئے اسلام نہ تو ابتداءً جنگ کی اجازت دیتا ہے نہ مدافعت سے روکتا ہے۔ کربلا کا حادثہ اسلامی جنگ کی بہترین مثال ہے جس طرح ہو سکا۔ امام حسین علیہ السلام نے جنگ کو ٹالا، خونریزی سے پرہیز کیا۔ مدینہ چھوڑ کر مکے چلے آئے۔ مکہ میں بھی فساد کا اندیشہ ہوا تو عراق کی راہ لی مگر جب کوفہ کی فوج نے

راہ میں آگھیرا اور دیکھا کہ اب خونریزی کے سوا کوئی چارہ نہیں تو حُر کے رسالے سے کہا۔ نہ ہم مدینہ واپس ہوتے ہیں نہ تمہارے ساتھ کوفے چلتے ہیں، ایک تیسری راہ اختیار کرتے ہیں جو کچھ ہوگا ہو رہے گا۔ یہ تیسری راہ حضرت کو کربلا کے میدان میں لے آئی۔ فرات کے کنارے اترنے کا ارادہ کیا تو کوفی سدِ راہ ہوئے مجبور ہوکر دریا سے ہٹ کر خشک میدان میں خیمے نصب کر دیئے۔ نو محرم تک حضرت نے لڑائی سے گریز کیا۔ جب عصر کے وقت عمر سعد نے طبلِ جنگ بجا دیا تو ایک رات کی مہلت مانگ لی۔ صبح عاشور قیامت ساتھ لے کر آئی مگر لڑائی میں پہل حضرت کی طرف سے نہیں ہوئی۔ پہلا تیر عمر سعد نے چلایا اور لوگوں کو گواہ بنا کر چلایا۔ پھر جنگ کی آگ بھڑک ہی اٹھی مگر حضرت کی فوج سے جو مجاہد، سرفروش اور جانباز گیا۔ اس نے لڑائی میں پہل نہیں کی۔ ہاں حملے کا جواب دیا۔ اپنی حفاظت کے لئے سپر بھی استعمال کی اور تیغ بھی۔ اسلامی لڑائی اسی کا نام ہے اور دینِ الٰہی میں ایسی ہی خونریزی جائز ہے۔ نہ ہم گوسفند اور گائے ہیں کہ ہر حملے کے سامنے سر جھکا دیں اور ہر جنگجو اور خونریز کے مطیع و فرماں بردار ہو کر رہ جائیں نہ شیر اور بھیڑیئے ہیں کہ دنیا بھر کا شکار کرتے پھریں

ہم نے امام حسین علیہ السلام کے اسوۂ حسنہ کو مشعلِ راہ بنایا ہے انہی کے طرزِ عمل نے صحیح اسلامی جہاد کی نشاندہی کی ہے۔ آپ نے حتی الامکان فتنہ و فساد سے گریز کیا۔ مسلمانوں کو خونریزی سے بچایا۔ مگر جب اُمتِ نبیؐ کی آل کو پامال کرنے پر آمادہ ہوگئی تو آپ نے اتمامِ حجت کے لئے ایک ایک مجاہد کو علیحدہ علیحدہ میدانِ جنگ میں بھیجا تاکہ کوفیوں کو سوچنے سمجھنے کا طویل موقع مل سکے اور وہ ہر مرتبہ اپنے عمل کا جائزہ لے کر اپنے فیصلہ پر نظرِ ثانی کر سکیں۔ مگر کوفی انسان نہیں درندے تھے۔ انہوں نے ایک ایک کر کے بہادروں کو شہید کر دیا۔ اور جب کوئی نہ رہا تو خود امامؑ عالی مقام کا کام تمام کرنے سے بھی نہ چوکے۔ نبیؐ کے نواسے کی شہادت کی داستان بڑی جانگداز اور روح فرسا ہے۔ اس

کو سننے کے لئے پتھر کا دل اور لوہے کا جگر چاہیئے۔ آیئے اس دُکھ بھری کہانی کو اپنے بارہویں امام کی زبانی سُنیئے :-

حضرت امام عصر علیہ السلام زیارتِ ناحیہ میں واقعۂ شہادت پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں :-

فَسَارَعُوْكَ الْقِتَالَ وَعَاجَلُوْكَ النِّزَالَ ۔ "ان لوگوں نے آپ سے لڑنے میں جلدی کی اور جنگ و جدال میں عجلت سے کام لیا۔"

وَرَشَقُوْكَ بِالسِّهَامِ وَالنِّبَالِ "اور آپ پر تیر اور نیزے برسانے لگے"

وَاَمَرَ اللَّعِیْنُ جُنُوْدَهٗ فَمَنَحُوْكَ الْمَاءَ وَ وُرُوْدَهٗ "اور اس لعین نے اپنے لشکر کو حکم دیا اور آپ پر پانی بند کر دیا اور دریا کے کنارے آنے سے روک دیا۔"

وَبَسَطُوْا اِلَیْكَ اَكُفَّ الْاِصْطِلَامِ "ان اشقیاء نے ظلم و ستم کے ہاتھ آپ کی طرف پھیلائے"

وَاَنْتَ مُقَدِّمٌ فِی الْهَبَوَاتِ وَمُحْتَمِلٌ لِلْاَذِیَّاتِ "آپ گرد و غبارِ کارزار میں آگے بڑھے اور بڑی بڑی اذیتوں کو برداشت کیا۔"

قَدْ عَجِبَتْ مِنْ صَبْرِكَ مَلٰٓئِكَةُ السَّمٰوٰتِ

فَاَحْدَقُوْا بِكَ مِنْ كُلِّ الْجِهَاتِ

"آپ نے ایسا صبر و تحمل کیا کہ آسمانوں کے فرشتے عش عش کرنے لگے اس کے بعد اعدا نے آپ کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔"

وَلَمْ یَبْقَ لَكَ نَاصِرٌ وَاَنْتَ مُحْتَسِبٌ صَابِرٌ

"اور آپ کا کوئی ناصر و مددگار باقی نہ رہا۔ اور آپ احتساب کو صبر کرتے رہے"

تَذُبُّ عَنْ نِسْوَتِكَ وَاَوْلَادِكَ حَتّٰی نَكَسُوْكَ عَنْ جَوَادِكَ

"آپ اپنے اہلِ حرم اور بال بچوں کو اشقیا کے حملے سے بچاتے رہے، یہاں تک کہ آپ کو زخمی کر کے گھوڑے سے گرا دیا۔"

فَهَوَيتَ إِلَى الأَرضِ جَرِيحًا تَطَأُكَ الخُيُولُ
بِحَوَافِرِهَا وَتَعلُوكَ الطُّغَاةُ بِبَوَاتِرِهَا

"پس زخمی ہو کر آپ زمین پر گرے اور گھوڑوں نے اپنے سموں سے آپ کے جسم کو پامال کر دیا۔ اور وہ اشقیا تلواریں کھینچ کر آپ کے قتل کرنے پر ٹوٹے پڑتے تھے۔"

قَد رَشَحَ لِلمَوتِ جَبِينُكَ وَاختَلَفَت بِالانقِبَاضِ وَالانبِسَاطِ شِمَالُكَ وَيَمِينُكَ۔

"اس وقت آپ کی پیشانی اقدس پر موت کا پسینہ آگیا اور شدتِ کرب سے کبھی آپ سیدھے پاؤں کو پھیلا دیتے تھے اور کبھی الٹے پاؤں کو سمیٹ لیتے تھے"

تُدِيرُ طَرفًا خَفِيًّا إِلَى رَحلِكَ وَبَيتِكَ وَقَد شُغِلتَ بِنَفسِكَ عَن وُلدِكَ وَأَهَالِيكَ

"اس وقت آپ گوشۂ چشم پھرا پھرا کر کنکھیوں سے اپنے خیمے کی طرف دیکھتے تھے۔ حالانکہ وہ وقت ایسا تھا کہ آپ نے اپنی اولاد و اہل و عیال کی طرف سے خیال ہٹا لیا تھا"

وَأَسرَعَ فَرَسُكَ شَارِدًا إِلَى خِيَامِكَ قَاصِدًا مُحَمحِمًا بَاكِيًا

"آپ کا گھوڑا جلدی سے خیمہ کا ارادہ کرتے بڑھا، وہ زور زور سے روتا جاتا تھا"

فَلَمَّا رَأَينَ النِّسَاءُ جَوَادَكَ مَخزِيًّا وَنَظَرنَ سَرجَكَ عَلَيهِ مَلوِيًّا

"پس جب ان مخدرات نے آپ کے ذوالجناح کو دیکھا کہ زین خالی ہے اور ایک طرف کو جھکا ہوا ہے"

بَرَزنَ مِنَ الخُدُورِ نَاشِرَاتِ الشُّعُورِ

"تو بال پریشان کر کے خیمہ سے نکل پڑیں۔"

واقعی امام عالیمقام پر جتنے ظلم وستم ہوئے کسی دوسرے پر نہ ہوئے ہوں گے۔

ان للميت لابد من ستة اشياء الغسل والقطن والكافور والاكفان والنعش والقبر۔ فقیر یا غنی جو بھی مرتا ہے چھ چیزیں ہر ایک کی میت کو میسر آتی ہیں:۔

(۱) غسل (۲) روئی (۳) کافور (۴) کفن (۵) جنازہ (۶) قبر

مگر امام حسین علیہ السلام ایسے بے بس و بے کس تھے کہ ان کو یہ چیزیں بھی میسر نہ آسکیں۔

زیارت مفجعہ میں بیان کیا گیا ہے۔ ہمارے امام اپنے جدِ امجد پر سلام بھیجتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

اَلسَّلامُ عَلَيكَ يَا مَن دَمُهُ غُسلُهُ

"میرا سلام اے شہید راہِ خدا آپ پر ہو کہ آپ کو غسل کے لئے پانی میسر نہ آیا، تیروں، تلواروں اور نیزوں کے زخم سے خون بہا تھا۔ وہی آپ کے لئے آب غسل بن کر رہ گیا"

وَشَيبَتُهُ قُطنُهُ "اور بس آپ کی سفید ریش مبارک ہی روئی کی قائم مقام بنی"

وَالتُّرَابُ كَافُورُهُ۔ "کافور کہاں میسر تھا۔ سرزمین کربلا کی گرم ریت اڑ اڑ کر جسم مبارک پر جم گئی تھی اور وہی کافور کے بجائے استعمال ہوئی۔

وَنَسجُ الرِّيَاحِ أَكفَانُهُ "کفن کے لئے کپڑا میسر نہ آیا۔ ہوا کے تھپیڑے جو خاک اڑا اڑا کر لاتے تھے، وہ جسم مبارک کی پردہ پوشی کر دیتی تھی۔ بس یہی آپ کا کفن تھا۔

وَالقَنَاةُ الخَطِّيُّ نَعشُهُ۔ "معمولی سے معمولی آدمی کو بھی مرنے کے بعد جنازہ میسر آتا ہے، اے حسینؑ آپ اس سے بھی محروم رہے۔ سرِ انور نیزے پر بلند ہو کر دیار و امصار میں پھرایا گیا۔ یہی آپ کا جنازہ تھا۔

وَفِیْ قُلُوْبِ مَنْ وَالَاہُ قَبْرُہٗ " ہر میّت دفن ہوتی ہے۔ دنیا میں کون ایسا بےکس ہے جس کو قبر بھی میسّر نہ ہو۔ اور میسّر آجانے کے بعد اس کو تاراج و برباد کر دیا جائے۔

اے حسینؑ! آپ کو کئی دن تک قبر ہی میسّر نہ آئی۔ اور جب میسّر آئی تو کئی مرتبہ تاراج و برباد ہوئی اس لئے اے امامؑ آپ کی قبر کسی زمین کے ٹکڑے پر نہیں ہے۔ بلکہ ان لوگوں کے دل جو آپ سے محبت کرتے ہیں آپ کا مزار و مرقد ہیں۔ ہر مومن کے دل میں آپ کی یاد موجود ہے۔ دشمن ظاہری قبر کو مٹا سکتے ہیں۔ لیکن مومنین کے دل میں جو آپ کا مزار ہے اس تک کس کے ظلم کی رسائی ہو سکتی ہے؟

مرتے وقت آپ کو صرف ایک ہی کھٹکا تھا کہ میرے بعد بزدل دشمن اہلِ حرم کو ستائیں گے۔ اور بہادروں کا بدلہ عورتوں اور بچوں سے لینے کی کوشش کریں گے۔

آپ کا اندیشہ صحیح نکلا۔ جو کوفی جو بہادروں کے حملے کے خوف سے بھاگ گئے تھے۔ "الاقتل الحسین بکربلا" "والاذبح الحسین بکربلا" کی صدائیں سن کر پلٹ پڑے۔ جن کے پاس ہتھیار تھے وہ ہتھیار لے کر بڑھے۔ جو نہتے تھے انہوں نے خیموں کی چوبیں اٹھا لیں۔ پتھر جمع کر لئے، ڈھیلے چن لئے اور جس طرح بن آیا معصوم بچوں اور دکھیاری عورتوں کو ستا کر اپنا کلیجہ ٹھنڈا کیا۔ بعض جو ذرا اور سخت دل تھے لاشوں کی طرح متوجہ ہوئے اور موت کی نیند میں سونے والوں بہادروں کا لباس اتار کر لے گئے۔ ایک بدذات خود امام حسین علیہ السلام کی لاش پر پہنچا اور جو کچھ مل سکا اتار لیا۔ یہاں تک کہ انگوٹھی کی خاطر آپ کی انگلی قطع کر لی۔ کتب مقاتل نے واقعۂ شہادت کے بعد کے حالات کی مرقع کشی اس پیرایہ میں کی ہے کہ کوئی انسانی قلب ایسا نہیں جو سُنے اور بھر نہ آئے اور کوئی آنکھ ایسی نہیں جو اس دلدوز سانحہ پر اشکبار نہ ہو۔ چنانچہ لکھا ہے:۔

جب امام حسین علیہ السلام شہید ہو چکے اور خیام اہل بیت نذرِ آتش ہو کر رہ گئے تو بیچاری عورتوں اور مصیبت زدہ بچوں کے لئے رات کی اوس سے بچنے کے

لئے سائبان کا سہارا بھی نہ رہا۔ آہ آہ! صبح تک یہ گھر آباد تھا۔ عونؑ و محمدؑ قاسمؑ و عبداللہؑ، علی اکبرؑ و عباسؑ کبھی خیمہ کے اندر آتے تھے کبھی باہر جاتے تھے، شام ہوتے ہوتے ساری سرکار لٹ گئی۔ بھرا گھر برباد ہو گیا۔ تاریخ اپنے دامن میں تباہیوں کی بہت سی دردناک داستانیں لئے ہوئے ہے چشمِ فلک نے خونریزی اور تاراجی کے بہت سے دل دوز مرقع دیکھے ہیں۔ مگر دوپہر میں جس طرح محمدؐ کا گھرانہ فاطمہؑ کا کاشانہ علی مرتضیٰؑ کا خاندان اُجڑ گیا اس کی مثال دوسری جگہ نہیں ملتی۔

عاشور کے دن صبح سے لے کر عصر تک مردوں نے جہاد کیا اور عصر کے بعد عورتوں نے ناموسِ اسلام کی لاج رکھی۔ جب تک حسین علیہ السلام زندہ رہے تو ان کی بہن زینبؑ ان کا حوصلہ بڑھانے کے لئے ساتھ تھی۔ لیکن جب زینبؑ کے جہاد کی باری آئی تو بہادر سپاہی ابدی نیند میں پڑے تھے۔ یہ صحیح کہ بنی ہاشم کی عورتیں بڑے جگر والی ہوتی ہیں۔ مگر میدانِ جہاد کی آب و ہوا اور مصائب و آلام کا ہجوم عورت کے صبر و تحمل کے لئے بڑی آزمائش ہے۔ ذرا کربلا کے میدان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھیے رات شروع ہو چکی ہے، گیارھویں تاریخ کا چاند فرات کے پانی پر روشنی ڈال رہا ہے۔ کوفہ کی فوجیں آرام کرنے کی تیاریاں کر چکی ہیں۔ مگر فاطمہؑ کا لٹا ہوا کنبہ جلی ہوئی راکھ کے قریب بیٹھا ہے۔ سامنے میدانِ جنگ میں عزیزوں کی لاشیں نظر آ رہی ہیں۔ کہیں عونؑ و محمدؑ پڑے ہیں۔ کسی طرف علی اکبرؑ کا چاند سا چہرہ گہنا رہا ہے نہر کے کنارے حضرت عباسؑ کی لاش ہے۔ امامؑ عالی مقام کا پامال جسم نشیبی جگہ پر بکھرا پڑا ہے۔ یاس و حرماں کا ہجوم ہے۔ چراغ کون جلاتا۔ بیکسی و کس مپرسی سرہانے کھڑی ہے اب اس لٹے ہوئے کارواں کی سالار حضرت زینبؑ ہیں بھائی نے چلتے وقت انہیں سربراہ اور نگران کار بنایا ہے۔ سرِ شام جب رونے دھونے اور گریہ و زاری سے فرصت ملی تھی تو بچوں کو یکجا کرنے کا خیال آیا تھا۔ اس حالت میں دیکھا کہ کئی بچے غائب ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ سکینہؑ کہیں نظر نہیں آئیں۔ فضہ کو لے کر اِدھر اُدھر ڈھونڈنے نکلیں۔ ہر طرف کشتوں کے پشتے لگے ہوئے تھے۔

اور اندھیرا بھی ہو چلا تھا۔ چاروں طرف نگاہ ڈالی، کئی مرتبہ آواز بھی دی۔ مگر بچی کا پتہ نہ چلا۔ آخر ایک عرب سے پوچھا "تم نے ادھر سے کسی بچی کو جاتے ہوئے تو نہیں دیکھا"

اس نے کہا:-

"جب خیمے جل رہے تھے، اور شعلے فضا میں بلند ہو رہے تھے تو میں نے ایک لڑکی کو دیکھا تھا، کہ اس کے کُرتے میں آگ لگی ہوئی تھی۔ اور وہ اپنے باپ اور چچا کو آواز دے رہی تھی۔ میں نے چاہا کہ اس کے دامن کی آگ بجھا دوں مگر وہ جلدی سے لاشوں کی طرف بڑھ گئی۔ کسی طرف سے اِلَیَّ اِلَیَّ یَا بُنَیَّ کی آواز آئی اور وہ لڑکی اسی آواز کی سمت غائب ہو گئی۔"

جناب زینبؑ سمجھ گئیں کہ باپ نے سکینہؑ کو بلا لیا۔ چنانچہ جب حسینؑ کے تن سر بریدہ کے قریب پہنچیں تو دیکھا کہ بیٹی اپنے باپ کے لاشے سے لپٹی ہوئی ہے اور اپنے اور اپنے گھر والوں کے مصائب و آلام اس طرح بیان کر رہی ہے:-

بابا آپ یہاں ہیں۔ ذرا دیکھیئے تو سہی خیموں میں آگ لگ گئی ہے، بیبیاں بے مقنع و چادر باہر نکلنے پر مجبور رہیں۔ ننھے ننھے بچے فریاد و فغاں کر رہے ہیں۔ کوئی ان کے طمانچے مارتا ہے کوئی گھُڑکیاں دیتا ہے۔ بابا دیکھئے تو سہی ہمارے کان بھی زخمی ہیں۔ آپ کے دیئے ہوئے بُندے ایک ظالم نے چھین لئے اور کانوں کو زخمی کر دیا۔"

سکینہؑ اپنے باپ کے لاشے سے لپٹی ہوئی فریاد و فغاں کر رہی تھیں اور باپ کی لاش کے ساتھ سارا ماحول کانپ رہا تھا۔ خدا جانے کس طرح حضرت زینبؑ نے ان کو تسلی دے کر جدا کیا اور اپنے ساتھ لے کر آئیں۔ ابھی پورے طور پر اہل حرم کے قریب پہنچنے نہ پائی تھیں کہ کسی نے کہا کہ "دو بچے اور گم ہیں اور ان کا نشان نہیں ملتا۔"

حضرت زینبؑ فضہؑ کو لے کر پھر تلاش و جستجو میں نکلیں، کچھ دور چل کر ایک جھاڑی کے نیچے دونوں بچے محو استراحت نظر آئے۔ سمجھیں کہ تین دن کے بھوکے پیاسے تھے، تھک کر سو گئے ہیں فضہ سے کہا "آہستہ چلو، ایسا نہ ہو کہ بچوں کی

آنکھ کھُل جائے۔" مگر جب قریب جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ موت کے ٹھنڈے ہاتھوں نے بچوں کو تھپک تھپک کر ہمیشہ کے لئے سُلا دیا ہے۔ آہ آہ! کیا مصیبت کا وقت تھا کہ عورتوں کو لاش اٹھانے کے لئے مرد نہ مل سکے۔ خود ہی ان بچوں کو لے کر اہل حرم کے پاس پہنچیں۔ مصیبت کی ماری اور بھوک پیاس کی ستائی ہوئی اولادِ رسولؐ زیرِ آسمان بیٹھی ہے۔ اس ہُو کے عالم اور سنسان بن میں جنگلی جانوروں کے شور و غُل کی آواز سے دل دہلے جاتے ہیں۔ بچوں کو تھپک تھپک کر سلا دیا ہے اور بڑے غم کے مارے نڈھال ہیں۔ حضرت امام زین العابدینؑ نماز میں مصروف ہیں۔ حضرت زینبؑ نگرانی کا فرض ادا کر رہی ہیں۔ اس کے بعد کا وقت کس طرح بسر ہوا۔ غم و الم سے مجبور سادات نے پہاڑ سی رات کس طرح گزاری۔ اتنا معلوم ہے کہ حضرت بیمارِ کربلا نے ایک سجدہ ایسا کیا کہ ساری رات اسی میں بسر ہو گئی۔ اور جب سجدہ سے سر اٹھایا تو سحر ہو چکی تھی بے وارث عورتوں اور کم سِن بچوں کا فاقہ کس طرح ٹوٹا۔ کوفیوں میں سے کسی کو یتیموں کے حال پر رحم آیا یا نہیں اس کا ذکر تو تاریخ میں نہیں ملتا۔ ہاں روضہ خوانی کی بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ جب لشکرِ عمر سعد میں کھانا تقسیم ہونے لگا تو بعض فوجیوں نے اپنے سردار سے کہا "ہم سب عرب ہیں۔ ہمارا دستور ہے کہ اگر کسی کے گھر کوئی موت ہو جاتی ہے تو اس کے لئے کھانا بھجواتے ہیں۔ رسولؐ کا بھرا گھر برباد ہو گیا۔ ایک دو نہیں بہتر جنازے نکل گئے۔ ہماری غیرت یہ تقاضا نہیں کرتی کہ ہم سیر ہو کر کھانا کھائیں اور نبیؐ کی اولاد تین دن کے بعد بھی فاقے سے رہے۔"

عمر سعد نے کہا۔ "مجھے اعتراض نہیں، کچھ کھانا ان مصیبت زدوں کے لئے بھیج دو"

اب یہ طے ہونے لگا کہ کھانا لے کر جائے کون، سب کے ہاتھ سادات کے خون میں رنگے تھے۔ کسی نے عباسؑ کے ہاتھ قلم کئے تھے، کسی نے علی اکبرؑ کے نیزہ مارا تھا۔ کوئی قاسمؑ کا قاتل تھا۔ کسی نے عونؑ و محمدؑ پر تلوار چلائی تھی۔ آخر یہ طے ہوا کہ حُرؑ نے امامؑ عالی مقام پر جان دی ہے۔ اس کی بیوی کو کھانا دے کر بھیجا جائے۔ ایک دو خوانوں میں کچھ کھانا رکھا، اور پانی کے چند مشکیزے ساتھ لے کر زوجہ حُرؑ اس سمت چلی جہاں

مسلمانوں کے نبیؐ کی اولاد اُمت کے مظالم کا نشانہ بنی بیٹھی تھی۔ اب اس کے آگے بیان کرنے اور سننے کے لئے بڑی طاقت کی ضرورت ہے۔ کھانا آ رہا ہے۔ پانی مہیا ہو رہا ہے۔ مگر کس وقت جب علی اکبرؑ جیسے جوان علی اصغرؑ جیسے بچے بھوک پیاس کی تکلیف اُٹھا کر دُنیا سے سدھار چکے۔ ہائے ستم رسیدہ بیواؤں اور دلفگار ماؤں نے کس دل سے کھانے پینے کی طرف توجہ کی ہو گی اور یہ خوان دیکھ کر ان پر کیا گزری ہو گی؟ کہتے ہیں کہ پہلے سکینہ کو جگایا گیا اور پانی پینے کی دعوت دی گئی۔ سکینہؑ نے نیند کے غلبہ کی حالت میں کہا" ارے میرا بھائی علی اصغرؑ مجھ سے بھی چھوٹا ہے۔ پہلے اس کو جگا کر پانی پلاؤ۔ پھر میں بھی پی لوں گی"۔ علی اصغرؑ کا نام سن کر ایک مرتبہ پھر اس پیاسے شہید کا غم تازہ ہو گیا ہو گا۔ اور مصیبت زدہ عورتوں کے بین سے زمین و آسمان کانپ گئے ہوں گے۔

چودھویں مجلس

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ؕ

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ اشرف الانبیاء والمرسلین وآلہ الطیبین الطاہرین۔ امّا بعد۔

فقد قال اللہ سبحانہ تعالیٰ فی کتابہ المبین

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ؕ

وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝

زمانہ شاہد ہے۔ آثارِ قدیمہ پکار پکار کر کہہ رہے ہیں، تاریخ گواہی دے رہی ہے کہ ساری کی ساری نسلِ انسانی گھاٹے میں ہے (بس وہ لوگ کامیاب ہیں) جو ایمان لائے، یقین کی دولت سے مالا مال ہوئے۔ عملِ صالح بجالائے اور ایک دوسرے کو صبر کی وصیت اور تلقین کرتے رہے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام سے پہلے دنیا مال و دولت، حکومت و سلطنت کو کامیابی سمجھتی تھی۔ ایران کا کسریٰ اس کے نزدیک کامیاب انسان تھا، کیونکہ وہ یونان سے لے کر سندھ تک کے علاقوں پر حکومت کرتا تھا، جواہر نگار اور سنہری روپہلی تخت اس کی نشست گاہ تھی۔ اور ہیرے اور لعل سے جڑا ہوا تاج اس کا سر چومتا تھا۔ سکندرِ اعظم کامیاب انسان تھا کیوں کہ اس کی فوجوں نے کبھی ناکامی کا منہ ہی نہ دیکھا تھا۔ وہ مغرب سے مشرق کی طرف بڑھا اور فتح و ظفر اس کے قدم چومتی گئی۔ مگر امام حسین علیہ السلام نے دنیا کو بتایا کہ کامیابی خزانوں، فوجوں اور فتوحات کی کثرت کا نام نہیں ہے۔ کامیابی اس انسان کو حاصل ہوتی ہے جو ایمان کی دولت سے مالا مال ہو

جائے یقین کے خزانے کا مالک بن جائے۔ جس کے اندر اچھے کام کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ جو ایسے خوش نصیب ساتھی پیدا کر سکے۔ جو حق پر جمے رہیں اور صبر و استقامت کو ہاتھ سے نہ دیں۔ اگر یہ بات کسی کو نصیب ہو جائے تو وہ رہتی دنیا تک فاتح رہے گا۔ دنیا میں ہمیشہ اس کے نام کا سکہ چلے گا چھوٹے بڑے سب قیامت تک اس کا کلمہ پڑھیں گے۔ یہ ساری دنیا ایک دوراہے پر کھڑی ہے۔ ایک راستہ بظاہر دلکش اور نظر فریب ہے۔ اس میں قدم قدم پر اونچے محلات اور آسمانوں سے باتیں کرنے والی عمارتیں نظر آتی ہیں۔ ہرے بھرے باغ ہیں جن کے اندر رنگ برنگ کے پھل پھول دکھائی دیتے ہیں۔ چشمے جاری ہیں۔ فوارے چھوٹ رہے ہیں۔ خوش منظر اور خوش خرام لوگ چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ اس راستے کی ابتدا ان تمام دل خوش کن مناظر سے ہوتی ہے۔ مگر انجام میں لق و دق میدان اور سنسان بیابان ہے۔ دوسرا راستہ بے پناہ مصائب و آلام سے شروع ہوتا ہے۔ قدم قدم پر آزمائشیں ہیں۔ ابتلا ہیں۔ کہیں جوان بیٹے کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ کہیں برابر کے بھائی کو خاک و خون میں تڑپتا ہوا دیکھنا پڑتا ہے گھر بار لٹانا اور دھن دولت کو نثار کر دینا تو اس راہ میں آئے دن کا کام ہے۔ بے شک آغاز ہوش ربا اور حوصلہ شکن ہے۔ مگر انجام ابدی راحت اور دائمی آرام سے ملا ہوا ہے۔

امام حسین علیہ السلام نے یہ آخری پُر خطر مگر نیک انجام راستہ اختیار کیا۔ اور نتائج نے بتا دیا کہ بظاہر ناکام ہونے والا حسینؑ ہی کامیاب ثابت ہوا۔ بے شک امام حسین علیہ السلام شہید ہو گئے۔ ان کے ساتھی ایک ایک کر کے میدان میں کام آئے ان کے خیام لوٹ لیے گئے۔ ان کی لاشیں گھوڑوں کی ٹاپوں نے پامال کر دیں۔ مگر آج دنیا کے اہل فکر و نظر سے پوچھئے کہ فتح کس کی ہوئی؟ یزید کی یا حسینؑ کی؟ تو سب "حسینؑ" ہی کا نام لیں گے۔ آپ ہمیشہ "آلِ ابراہیمؑ" کا نام تو سنتے رہتے ہیں۔ مگر کچھ خبر بھی ہے کہ اس نسل کا سرمایۂ افتخار کیا ہے؟ دنیا کی یہ تاریخی نسل مخصوص خصوصیتوں

کی حامل تھی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰۤی اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِیْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ

(بیشک اللہ نے آدمؑ، نوحؑ، آلِ ابراہیمؑ اور آل عمرانؑ کو سارے عالم میں سے منتخب کر لیا تھا۔)

قدرت کا ازل سے یہی دستور ہے کہ بعض افراد کو بعض اہم فرائض کے لئے چن لیتی ہے۔ یورپ کے ارباب دانش کا خیال ہے کہ صبح ازل مادے کے ذرے فضا میں چکر لگا رہے تھے۔ یہ ذرے ایک دوسرے سے دست و گریبان ہوئے۔ ٹکرائے، متصادم ہوئے اور اس باہمی تصادم کے بعد ان ذروں نے بہت سی نئی شکلیں اختیار کر لیں۔ کسی نے گلاب کا جامہ پہن لیا۔ کوئی ببول کا کانٹا بن گیا۔ کسی نے کوئلہ کی شکل اختیار کر لی۔ کوئی الماس کا ٹکڑا بن گیا۔ اصل ان سب کا ایک ہے۔ مگر قدرت نے جدا جدا فرائض ان کے متعلق کر دیئے ہیں۔ حضرت آدمؑ کی اولاد میں حضرت ابراہیمؑ کی نسل کو بھی اللہ نے منتخب فرما کر "امامت و قیادت" کا فرض سپرد کیا۔ اور شہادت کا منصب ان کا انعام ٹھہرایا۔ تاریخ عالم پر نظر ڈالیے اور دیکھیے ابراہیمؑ و نسل ابراہیمؑ نے کس خوبی کے ساتھ اس فرض کو ادا کیا ہے؟ کفر کی وہ تیرہ و تاریک رات جب سارے عالم میں شرک ہی پھیلا ہوا تھا۔ اور نمرود ٹھاٹ سے خدائی کا دعویٰ کر رہا تھا۔ اس وقت حضرت ابراہیمؑ ہی تو تھے جنہوں نے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں توحید کی مشعل روشن کی اور ستارہ پرستی اور انسان پرستی کے اس ماحول میں نعرۂ تکبیر بلند کیا۔

جب فرعون کو یہ جرأت ہوئی کہ وہ "انا ربکم الاعلیٰ" کہہ کر پورے ملک کو اپنا بندہ بنائے اور بنی اسرائیل تک سے (جو رب العالمین کے پرانے ماننے والے تھے) اپنی پرستش کا مطالبہ کرے تو ابراہیمی گھرانے کا فرزند موسیٰؑ ہی تھا جس نے مزاحمت کی اور بنی اسرائیل کو مصر کے کفر کدہ سے نکال کر فلسطین کی سرزمین پر لے آیا۔ "پیلاطوس" نے جب بیت المقدس کے یہودیوں کا ساتھ دے

کر دعوتِ حق کو روکنا چاہا ۔ تو حضرت عیسیٰؑ اپنی جان کی بازی لگانے کے لئے کھڑے ہو گئے ۔ اسی طرح یزید نے جب انسان کے بنیادی حقوق پر ہاتھ ڈالنا شروع کیا اور اسلام کے امن آفرین اصول کے بجائے کفر کے اخلاق سوز اور امن شکن آئین کا احیاء کرنا چاہا تو قدرت نے امام حسین علیہ السلام کو سامنے لا کھڑا کیا ۔

وہ منظر آنکھوں کے سامنے لایئے جب حسینؑ کا لٹا ہوا قافلہ حاکم شام کے دربار میں کھڑا تھا ۔ اور وہ امام زین العابدینؑ کو قتل کی دھمکی دے رہا تھا ۔ اور امام عالیمقام پوری بے پروائی کے ساتھ کہہ رہے تھے ۔ القتل لنا عادۃٌ وکرامتنا شھادۃ (ہم کو قتل سے کیا ڈراتا ہے، ہم ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کی یادگار ہیں قتل ہونے کی تو ہم کو عادت ہے ۔ اور شہادت ہماری کرامت ہے) حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب امامت کے منصب پر فائز کیا گیا تو آپ نے اللہ سے کہا:

قَالَ وَمِن ذُرِّيَّتِي قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ (یہ منصب میری ذریت کو بھی ملے گا ۔ اللہ نے فرمایا ۔ میرا عہدہ ظالموں کو نہیں پہنچے گا)

حضرت ابراہیمؑ کی دُعا مقبول ہوئی ۔ اور ان کی نسل میں ہمیشہ ایسے افراد پیدا ہوتے رہے جنہوں نے ظلم و استبداد کا مقابلہ کیا ۔

امام حسین علیہ السلام بھی انہی بلند انسانوں میں سے تھے جنہوں نے انسانوں کو ظالم یزید کے استبداد سے بچانے کے لئے احتجاج کیا ۔ اور جنگ و صلح کے لئے چند درخشاں اصولِ دُنیا کے سامنے رکھے ۔

۱ ۔ خونریزی کو حتی الامکان ٹالنا چاہیئے ۔

۲ ۔ گفت و شنید اور باہمی سمجھوتے سے کام چل سکے تو بہتر ہے ۔

۳ ۔ لڑائی میں پہل نہ کرنی چاہیئے ۔

ہمارا ملک اب آزاد ہے ۔ ہمارے نمائندے بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کرتے ہیں ۔ ہمارا ملک یو ۔ این ۔ او (تنظیم اقوام متحدہ) کا رکن ہے ۔ وقت آگیا ہے

کہ ہم اب اس چراغ کو زیرِ دامان نہ رکھیں بلکہ اس کی روشنی سے دنیا بھر میں اُجالا کر دیں ۔ اور مجلسِ اقوام میں یہ قرارداد پیش کریں کہ کوئی قوم جنگ میں پہل نہ کرے ورنہ وہ صلح مسلکِ اقوام کی فہرست سے خارج ہو جائے گی ۔ جس دن اس قرارداد پر عمل ہونے لگے گا دُنیا سے جنگ کا خاتمہ ہو جائے گا ۔ تقریروں اور تحریروں کا دَور ختم ہوا ۔ اب تدبیروں کا زمانہ ہے ۔ آپ "حسینیت" کو بین الاقوامی مسائل حل کرنے کے لئے استعمال کیجیے ۔ تاکہ دنیا تجربہ کر کے حسینی اُصول کی برتری کی قائل ہو جائے ۔

یُو ۔ این ۔ او کے اندر روسی اور امریکی دو بلاک ہیں ۔ اور دونوں ایک دوسرے پر غالب آنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں ۔ آپ حسینی تعلیم کے ذریعہ سے ان دونوں کو "خدمتِ خلق" کی طرف مائل کر دیجئے اور وہ طاقت جو تخریبی جدوجہد اور ہلاکت آفرین کوشش میں صرف ہو رہی ہے ۔ اس کا رُخ تعمیری کاموں کی طرف موڑ دیجئے ۔

یورپ، امریکہ اور روس کے بہترین دماغ ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم کی صنعت میں لگے ہوئے ہیں مگر امام حسین علیہ السلام سے روزِ عاشور جب زعفر جن نے آکر درخواست کی کہ ہم کو اجازت دیجئے کہ ہم آپ کے مخالفوں کو آناً فاناً فنا کر دیں تو آپ نے صاف فرما دیا کہ میں اپنے نانا کی اُمت پر ایسی طاقتوں کو مسلط نہیں کرنا چاہتا جن کا توڑ ان کے پاس نہ ہو جن سے مقابلے کی ان میں طاقت نہ ہو ۔

اس طرح حسینؑ ایک جنگی قانون کی بنیاد رکھ رہے تھے کہ لڑتے وقت وہی ہتھیار استعمال کئے جائیں جن کا توڑ مدِمقابل کے پاس موجود ہو ۔ امام حسین علیہ السلام کے اس جنگی قانون کو اقوام متحدہ کی انجمن میں پیش کیجئے ۔ اور پاس کرا کے عالم میں امن و امان قائم رکھنے کی مہم کو کامیاب بنایئے ۔

آپ سنتے چلے آئے ہیں کہ امام حسین علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل آہستہ آہستہ ارتقاء کی منزلوں سے گزرتی آئی ہے ۔ جس طرح گنّا دو چار دن میں اتنا میٹھا نہیں ہو گیا ۔ آڑو اور انار کو خوشگوار و شیریں بننے کے بہت سی منزلوں

سے گزرنا پڑا ہے۔ گھوڑا ہمیشہ ہی سے اس قدر قدآور اور تیز رفتار نہیں تھا۔ اسی طرح حضرت انسان نے بھی آہستہ آہستہ ارتقائی منزلیں طے کی ہیں ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

کارآمد افراد اور بزرگ انسان برسات کی گھاس کی طرح ایک رات میں نہیں اُگ کھڑے ہوتے۔ فطرت ہزاروں سال تیاریاں کرتی ہے۔ ہوشیار مالی کی طرح جو اچھے پودے پیدا کرنے کے لئے زمین کا انتخاب کرتا ہے۔ اچھے تخم تلاش کرتا ہے شیریں پانی سے سینچتا ہے اور مناسب ہوا میں پودے کو پروان چڑھنے کا موقع دیتا ہے۔ فطرت بھی جب اولوالعزم انسانوں کو وجود میں لانے کا تہیہ کرتی ہے تو صدیوں پہلے سے ماں اور باپ کا انتخاب کر کے اس روحِ اعظم کو ارتقا کی منزلوں سے گزارتی ہے اور اگر کسی مرحلہ پر آ کر منتخب افراد نہیں ملتے تو بظاہر قانونِ رائج میں تبدیلی پیدا کر دیتی ہے۔ اور حضرت عیسیٰؑ کا ایسا منتخب روزگار بے باپ کے پیدا ہو جاتا ہے آپ کہہ سکتے ہیں کہ بے باپ کے پیدا ہونا بڑا کمال ہے، یہ کمال حضرت عیسیٰؑ کو حاصل ہوا اور امام حسین علیہ السلام اس سے محروم رہے۔ نہیں ایسا نہیں ہے۔ حضرت عیسیٰؑ ایک ایمرجنسی قانون کی پیداوار تھے۔ اصل قانونِ فطرت یہی ہے کہ "انسانِ کامل" بننے کے لئے بچہ کو ماں اور باپ دونوں کا ورثہ دار ہونا پڑتا ہے۔

علم حیاتیات کے جاننے والے واقف کہتے ہیں کہ کسی فرد کو دو چیزیں بناتی یا بگاڑتی ہیں۔ ایک توارث اور دوسرے ماحول۔ توارث ماں اور باپ دونوں کی طرف سے حاصل ہوتا ہے اور ماحول میں بھی ماں باپ برابر کے شریک ہیں۔ اگر ان میں سے ایک بھی اپنا حصہ بچے کو نہ دے تو شخصیت کی تکمیل نہیں ہوتی۔

انجیل کے آئینہ میں ذرا حضرت عیسیٰؑ کی شخصیت کا تجزیہ کیجئے۔ حضرت عیسیٰؑ بار بار آسمانی باپ کو پکارتے ہیں جو ایک رخسار پر طمانچہ لگائے اس کے سامنے دوسرا رخسار آگے بڑھانے کے لئے آمادہ ہیں جو ایک میل بیگار میں لے جائے اس کے

ساتھ دو میل جانے کو آمادہ ہیں۔ آپ کی پوری زندگی کا جائزہ لیا جائے۔ اس کے اندر ماں کی "ماممتا" تو نظر آتی ہے۔ باپ کا "جلال" نہیں ملتا۔ لیکن حضرت امام حسینؑ انسانیت کا مظہرِ اتم ہیں۔ شجاعت کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ وہ حضرت فاطمہؑ کے ذریعہ سے رحمت اللعالمین کے ورثہ دار ہیں اور حضرت علیؑ کے ذریعہ سے فاتح خیبر و حنین کی مصلحانہ اور مدبرانہ شجاعت کے وارث ہیں۔

دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ امام حسین علیہ السلام فطرت کی صالح طاقتوں اور ترقی پذیر قوتوں کے وارث تھے۔ ان کی رگوں میں آدمؑ، نوحؑ، ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کا خون دوڑ رہا تھا۔ اور یزید کائنات کی رجعت پسند قوتوں کا وارث اور نمرود، فرعون، ہامان کا جانشین تھا۔ یوں کربلا کے میدان میں دریائے فرات کے کنارے خیر و شر استبداد و حریت، غلامی اور آزادی میں ایک فیصلہ کن مقابلہ ہو رہا تھا زیارت عاشور میں جب ہم امام حسین علیہ السلام کو السلام علیک یا وارث آدم صفی اللہ، السلامُ علیک یا وارث نوح نبی اللہ الخ کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ وہ آدمؑ کی ٹوپی، نوحؑ کے عمامے اور ابراہیمؑ کے کرتے کے وارث تھے (ممکن ہے یہ بھی ہو) مگر حقیقی مفہوم اس کا یہ ہے کہ وہ ان تمام اخلاق عادات اور کمالات کے وارث تھے۔ (ممکن ہے یہ بھی ہو) مگر حقیقی مفہوم اس کا یہ ہے کہ وہ ان تمام اخلاق، عادات اور کمالات کے وارث تھے۔ جو ان بزرگوں نے اپنے اندر پیدا کئے تھے، فطرت نے ہزاروں سال کے ہیر پھیر کے بعد نسلِ انسانی کو جن ارتقائی منزلوں سے گزارا تھا اس کا نچوڑ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے اور امام حسین علیہ السلام ان تمام ورثوں کو لے کر کربلا کی تاریخی میدان میں تشریف لائے تھے۔

اب یہ ہویدا ہو گیا کہ فرات کے کنارے حسینؑ و یزید کی نہیں بلکہ حسینیت اور یزیدیت کی جنگ تھی۔ حسینیت کفر کی گھنگھور گھٹا کو ہٹا کر اسلام و ایمان کا اُجالا پھیلانا چاہتی تھی ظلم و استبداد کا خاتمہ کر کے امن و امان کا بول بالا کرنے کی فکر میں تھی۔ شاہانہ لوٹ

کھسوٹ اور خونریزی کو مٹا کر انسان کے بنیادی حقوق قائم کرنا چاہتی تھی اور یزیدیت اپنے آباؤ اجداد کی کفر سامانیوں کو دوبارہ زندہ کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ وہ سامراجی نظام اور قہرمانی آئین و قوانین کو ملک میں رائج کرنا چاہتی تھی۔

خیر و شر اور حق و باطل کی یہ رزم آرائی خاندانی لڑائی نہ تھی۔ یزید کے بجائے اگر کوئی ہاشمی سردار ظلم و جور کی حمایت کرتا اور دورِ کفر کو واپس لانے کے لئے کمربستہ ہو جاتا تو امام حسین علیہ السلام اس کی بھی اسی شدت سے مخالفت کرتے۔

تاریخ کا مطالعہ کرنے والے واقف ہیں کہ یزید کے عہد میں سارے بُرے کام رائج ہو چکے تھے۔ زنا عام تھا۔ جوا کھلم کھلا ہوتا تھا۔ شراب نوشی پھر رائج ہو چکی تھی اسلام نے جن برائیوں کو مٹایا تھا، وہ سب ایک ایک کر کے پھر چور دروازے سے اندر داخل ہو گئی تھیں۔ پاکستان کے زندہ دل مسلمانو! آپ نے سنا کہ یزیدیت نام تھا اخلاقی برائیوں، معاشرتی خرابیوں اور معاشی سیہ کاریوں کا۔ اور حسینیت ان تمام برائیوں کو مٹانے کے لئے کمربستہ ہوئی تھی۔ آپ کہتے ہیں کہ ہم یزیدیت سے نالاں ہیں اور حسینیت کا فروغ چاہتے ہیں۔ پاکستان کے ہر طبقہ پر نگاہ ڈال کر بتایئے کہ کیا یہاں زنا ختم ہو گیا، شراب نوشی بند ہو گئی، لوگ جوا نہیں کھیلتے؟ اگر یہ برائیاں جاری ہیں اور اعلانیہ جاری ہیں تو یقین مانئے کہ یزیدیت اس ملک میں زندہ و تابندہ ہے۔ اور اس کے مٹانے کے لئے "حسینیت" کا پیغام بار بار سنایا جانا چاہیئے۔ آزاد ملک کے آزاد باشندو! یہ ہے وہ ضرورت جس کے لئے امام حسین علیہ السلام کا ذکرِ خیر مسلسل و پیہم کیا جاتا ہے۔ اور عصر قدیم اور عہد جدید کے بے باک" سرفروش" اور جانباز قائدوں میں صرف حسینؑ ہی ہے۔ جو شیطانی طاقتوں سے ٹکر لینے کا طریقہ ہم کو سکھا سکتا ہے۔ جو امارت، وزارت، سفارت کے لالچ سے منہ موڑ کر اصلاح امت کے لئے سر بکف ہو کر میدان میں آ گیا جس نے اولاد، اصحاب اور اعزا کی قربانی قبول کر لی۔ مگر رجعت پسند طاقتوں کے سامنے سر جھکانا قبول نہیں کیا۔ حسینؑ سے پہلے روٹی، گھی اور سرسوں کے تیل کی طرح ظلم کا بھی گریڈیشن (GRADATION) کیا

جاتا تھا۔ وہ ظلم جو فقیر و مسکین کرتے تھے بُرا سمجھا جاتا تھا۔ وہ ظلم جو دولت مند امیر اور بادشاہ کرتے تھے اس کی تعریف کی جاتی تھی۔ آج بھی ایسا ہی ہے۔ اگر کوئی غریب چار دیسی شراب کا ایک ادھا پی کر انارکلی کی نالی میں لوٹنے لگے تو جو ادھر سے گزرے گا اس کو ٹھوکر مارتا جائے گا۔ اگر کوئی بڑا آدمی شمپین کی پوری بوتل حلق کے نیچے اتار کر آپ کی محفل میں آ جائے تو آپ اس کو صدر میں جگہ دیں گے۔ لیکن امام حسین علیہ السلام نے اپنے عہد کے سب سے بڑے بادشاہ کے ظلم و ستم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر کے بتا دیا کہ ظلم، ظلم ہے خواہ وہ کسی چھوٹے آدمی سے سرزد ہو یا اس کا بانی کوئی بڑا آدمی ہو۔

نسلِ آدم کو حسینؑ سے پہلے یہ جرأت نہ تھی، شاید ان کے بعد بھی بہت کم لوگ یہ دل گردہ پیدا کر سکے۔ ہم آج تک رات کے اندھیرے میں چھپ کر چوری کرنے والوں کو چور کہتے ہیں۔ اور دن دھاڑے طبل و علم لے کر لوٹ مار کرنے والوں کو فاتح اعظم لکھا جاتا ہے۔ کیا یہ دنیا کی ستم ظریفی نہیں ہے۔ ٹکے کی ہنڈیا چرانے والوں کا تھانہ میں ہسٹری شیٹ کھولا جاتا ہے اور ملکوں کی دولت لوٹنے والے تاریخ کے اوراق کی زینت بنتے ہیں۔ یہ تاریخ جو ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں پڑھائی جاتی ہے کیا ہے؟ ان بے باک شاطروں اور ڈاکوؤں کا اعمالنامہ ہے جو دنیا کی آنکھوں میں خاک ڈال کر قتل و غارت اور لوٹ مار کرنے کے باوجود "خلد اللہ ملکہ" بنے رہے۔

امام حسین علیہ السلام نے ظلم کے چہرے سے نقاب الٹ دی اور اعلان کر دیا کہ ظلم جہاں ہو اور جس لباس میں ہو قابل نفرت ہے۔ زہر مٹی کے پیالے میں ہو تو، یا طلائی جام میں ہو تو بہر حال مہلک ہوتا ہے۔ میکیاویلی اٹلی ہی کا نہیں ساری دنیا کا سیاسی رہنما ہے۔ اربابِ سیاست نے شعوری اور لاشعوری طور پر ہر عہد اور ہر ملک میں اس کی پیروی کی ہے وہ حکومت اور مملکت کے مفاد کو اخلاق و آئین کی کسوٹی بتاتا ہے جو کام بادشاہ کرے حق ہے۔ جو کام مملکت کے لئے مضر ہو وہ غلط ہے۔ امام حسین علیہ السلام نے جان دے کر یہ بتایا کہ مملکت اور حکومت کے اوپر ایک دوسری طاقت

ہے۔ اور وہ اللہ جل جلالہٗ کی ہے۔ حق و صداقت اور اخلاق و فضائل کا سرچشمہ وہی ہے

وَالعصر ه ان الانسان لفی خسر ه الا الذین امنوا وعملوا الصّٰلحت وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر ه

زمانہ شاہد ہے، زمانہ کی تاریخ گواہ ہے۔ آثارِ قدیمہ پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ سکندر ہو یا دارا، ہنی بال ہو یا فرعون، غرض سارے کے سارے بنی آدم خسارے میں رہے۔ سوائے ان کے جو ایمان لائے اور عمل صالح بجالائے حق پر قائم رہے اور ایسی جماعت بنانے میں کامیاب ہوئے جو ایک دوسرے کو حق پر قائم رہنے اور صبر و استقامت کی تلقین کرتی رہی۔

پیر اجمیر حضرت خواجہ معین الدین چشتی علیہ الرحمۃ نے انہی کے حق میں فرمایا ہے:۔

شاہ است حسینؑ بادشاہ است حسینؑ
دین است حسینؑ دین پناہ است حسینؑ
سر داد نہ داد دست در دستِ یزید
حقا کہ بنائے "لا الہ" ہست حسینؑ

ہمارے مؤذن دن میں پانچ وقت لا الٰہ الا اللہ کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔ ہم ہر وقت اللہ اکبر کہتے ہیں مگر اس کا مطلب کتنے لوگ سمجھتے ہوں گے۔ مغلیہ بادشاہ جلال الدین اکبر کا درباری ابوالفضل خط کی پیشانی پر "اللہ اکبر" لکھتا تھا۔ دینِ الٰہی کے پیرو اذان میں "اللہ اکبر" سن کر اکبر کو خوش کرنے کے لئے "جل جلالہٗ" کہتے تھے۔

آج بھی لوگ بے سمجھے بوجھے اللہ اکبر کہتے ہیں۔ اگر سمجھ کر کہیں تو ان کے دل و دماغ پر اللہ کی برتری کا نقش جم جائے۔ امام حسین علیہ السلام جو اللہ کو سمجھ کر، جان بوجھ کر "اکبر" کہتے تھے۔ یزید کے سامنے نہیں جھک سکتے تھے۔ حضرت معین الدین چشتی کے بقول انہوں نے سر دے دیا مگر یزید کی بیعت نہ کی۔ اس طرح وہ عملاً لا الٰہ الا اللہ کی بنیاد رکھ گئے۔ یعنی انسان جب اللہ کو ساری طاقت کا سرچشمہ اور ہر قسم کی قوت کا مرکز مان لے تو پھر وہ اس کے علاوہ کسی اور کے سامنے کیسے جھک

سکتا ہے۔

ہمارا حال یہ ہے کہ پانچ وقت نماز میں "ایاک نعبد وایاک نستعین" کہتے ہیں۔ یعنی اے خدا ہم صرف تیری بندگی کرتے ہیں اور صرف تجھ ہی سے مدد کے خواہاں ہیں اور ہم پٹواری سے لے کر گورنر تک ہر چھوٹے بڑے حاکم کے در پر پیشانی رگڑتے ہیں

یہاں بہت سارے مسلمان جمع ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم اب مشرک نہیں ہیں۔ وحدہ لا شریک کی پرستش کرتے ہیں۔ ہم شکتی کے دیوتا اور لکشمی دیوی کے پجاری نہیں ہیں۔ میں کہا کرتا ہوں، خدا سے ڈرو۔ علانیہ جھوٹ نہ بولو۔ تم سب شکتی کے دیوتا کو آج بھی ڈنڈوت کرتے ہو جس کے ہاتھ میں ڈنڈا ہو۔ جس کے بازوؤں میں طاقت ہو اس کی غلامی کا طوق اب تک تمہارے گلے میں ہے۔ یہ مانتا ہوں کہ اب تم لکشمی دیوی کے اس مندر میں نہیں جاتے جس کی اندھیری کوٹھڑی کو گھی کے چراغ روشن کرتے ہیں۔ مگر یہ امپیریل بنک، نیشنل بنک اور لائڈز بنک کیا ہیں؟ یہ بیسویں صدی کی لکشمی دیوی کے فیشن ایبل مندر ہیں۔ ذرا ان مندروں میں جاکر پوجا دیوی کی عقیدت کا تماشہ دیکھو اور پھر مجھے بتاؤ کہ مسجدوں میں زیادہ رونق ہے یا لکشمی دیوی کے مندروں میں

امام حسین علیہ السلام نے لا الٰہ کی عملی تفسیر کی الا اللہ کا نقش زمینِ کربلا پر لکھا اور دنیا کو بتایا کہ ماسوا سے منہ موڑ کر خدا کے سامنے یوں سر جھکاتے ہیں۔ جب قومیں نشۂ قوت سے سرشار ہو کر تسخیر ممالک کے لئے آگے بڑھتی ہیں تو ان کے دلوں میں قساوت اور شقاوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ درندگی کو شجاعت سمجھنے لگتی ہیں

امام حسین علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کا ذکر، شہادت انسانی قلوب میں رقت اور نرمی پیدا کرتا ہے۔ اور سپاہیوں کو وہ حدود بتاتا ہے جن کے اندر رہ کر لڑائی حق کی راہ میں جہاد ہے۔ اور جس سے ہٹ کر لڑائی محض تیغ زنی ہو کر رہ جاتی ہے کربلا والوں کا ذکر نوجوانوں کو بزدل اور بہادروں کو کم ہمت نہیں بناتا بلکہ وہ ہر عمر اور ہر صنف کے انسانوں کو ان کا فرض یاد دلاتا ہے۔

کیا ہم شبیہ پیغمبرؐ علی اکبرؑ کا بہادرانہ کارنامہ کسی نوجوان کو بزدل بنا سکتا ہے؟

کیا عونؑ و محمدؑ کی سرفروشی اور علی اصغرؑ کی شہادت کسی قوم کے بچوں کو کم ہمت بنا سکتی ہے جس قوم کی تاریخ عباسؑ علمدارؑ جیسے دلاور اور قاسم ابن عباسؑ جیسے جانبازوں سے بھری پڑی ہو۔ وہ دنیا میں کم ہمت نہیں کہلائی جاسکتی۔

پاکستان ایک ملت نوخیز ہے۔ ابھی یہاں بہادری کی صالح روایات پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ نپولین، ہٹلر، مسولینی یا انہی جیسے دوسرے فوجی جرنیل ملتِ اسلامیہ کے لئے مثالیہ (آئیڈیل) نہیں بن سکتے۔ ان کے سامنے ان لوگوں کا نمونہ رکھنا ہے جو جادۂ حق پر جمے رہے۔ صبر واستقامت کو اپنا شعار بنائے رہے جنہوں نے ایمان اور عمل صالح کی دولت کو سینے سے لگائے رکھا (آمنوا وعملوا الصلحت وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر)

پاکستان کے نوجوانو! انسان عجیب چیز ہے۔ اس کا دل ودماغ لاہور کے چڑیا گھر کی طرح ہے۔ اس میں گائے اور بھیڑ کے خصائل بھی ہیں۔ اور شیر اور چیتے کی سی عادتیں بھی موجود ہیں۔ مصلح اخلاق اور معمار قوم کا کام یہ ہے۔ کہ وہ ان اخلاق میں اعتدال پیدا کرے۔ نہ گائے اور بھیڑ کے خصائل کا غلبہ ہو۔ کہ قوم بزدل بن جائے۔ نہ شیر اور چیتے کی عادتیں غالب آئیں کہ جو سامنے آئے۔ اس کی تکا بوٹی کر ڈالیں۔ مذاہبِ عالم کی تعلیم جو بگڑی ہوئی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ یا تو گوتم بدھ عیسیٰ اور مہابیر کی طرح قوموں کو اہنسا کا سبق دے کر شاطر قوموں کے لئے لقمہ تر بناتی ہے۔ یا یہودی نسل کے قانون سازوں کی طرح ان کو دوسری قوموں کا شکار کرنے پر اکساتی ہیں۔

بے شک ان مذہبوں کی اصل تعلیم میں اعتدال ہوگا۔ مگر ہمارے سامنے جو چیز ہے۔ اس سے یہی اثر پیدا ہوتا ہے۔

اس ہنگامہ افراط وتفریط میں اسلام جادہ اعتدال پر قائم رہنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اور امام حسین علیہ السلام نے کربلا میں ہم کو بتایا ہے۔ کہ باطل کے سامنے سر جھکا دینا۔ حق کے ساتھ غداری کرنا ہے۔ دشمن کے سامنے ہتھیار ڈال دینا، اس

ظلم میں مدد دینا ہے۔ مگر اندھا دھند تلوار چلانا اور گنہگار اور بے گناہ میں تمیز نہ کرنا درندگی ہے۔

انسان کا منصب بہت بلند ہے۔ (لا اکراہ فی الدین) دین و مذہب جبر و جور سے نہیں پھیلا کرتے نوعِ انسانی پر کوئی عقیدہ تلوار کے زور سے نہیں منڈھا جاسکتا۔ اور اگر کوئی طاقت بنی آدم کو اس کے اس بنیادی حق سے محروم کرنا چاہیے تو ہم کو ہر ممکن قربانی دے کر اپنے اس حق کی حفاظت کرنا چاہیئے۔

آزاد ملک کے آزاد شہریو! نشۂ اقتدار بہت بُرا ہوتا ہے۔ کم ظرف لوگ اختیار اور اقتدار پا کر بہک جاتے ہیں۔ مبارک ہیں وہ ہستیاں جو اختیار حاصل کرنے کے بعد آئین کو ہاتھ سے نہ دیں۔

صفین کی جنگ میں حاکم شام نے حضرت علیؑ کی فوجوں کے لئے دریا کا گھاٹ بند کردیا۔ وہ پیاس سے ہلاک ہو رہے تھے۔ لیکن جب لڑ بھڑ کر علیؑ نے گھاٹ پر قبضہ کرلیا۔ تو انہوں نے شامی لشکر کو عام اجازت دے دی کہ آؤ اور پانی کی مشکیں بھر کر لے جاؤ۔

یہ بنی ہاشم کا اخلاق تھا۔ نبیؐ کے گھرانے کا اخلاق تھا۔ مگر کربلا میں کوفیوں نے پھر پرانی رسم دھرائی اور تین شب و روز آل محمدؐ پر پانی بند رکھا۔ تاریخ کے آئینہ میں صاف نظر آرہا ہے۔ کہ امام حسین علیہ السلام انسانیت نواز آئیڈیالوجی کے حامی تھے اور یزید انسانیت سوز مسلک کا پابند تھا۔ اور کربلا کے میدان میں دراصل یہ دونوں نظریۂ حیات ایک دوسرے سے ٹکرائے۔

وہ لوگ جو انسان کے بنیادی حقوق کے حامی ہیں۔ ان کو چاہیئے کہ اس بیسویں صدی میں امام حسینؑ کے بلند نظریات کی تعلیم تبلیغ اور اشاعت کے لئے ایک بین الاقوامی ادارہ بنائیں اور ساری دنیا کو اس محسنِ انسانیت کے پیام سے روشناس کرائیں۔

عزیزو! عشرۂ محرم ختم ہوجائے گا۔ لیکن امام حسینؑ نے کربلا کے تپتے میدان میں نسلِ انسانی کو جو بھولا ہوا سبق یاد دلایا تھا۔ اس کا اعادہ کرنے کے لئے ایک مستقل ادارہ کی

ضرورت کا آپ کو احساس پیدا ہونا چاہیئے۔ مغرب نے مادیات میں بڑی ترقی کی ہے۔ لیکن روحانی اور اخلاقی میدان میں وہ مشرق سے بہت پیچھے ہے۔ اب وہ آپ کو مادی امداد دے رہا ہے۔ آپ اس کی اخلاقی اور روحانی دستگیری کے لئے حسینی تعلیم کا ایک بین الاقوامی ادارہ بنایئے تاکہ ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم کے اس ہلاکت آفرین دورِ تاریکی میں آپ حسینیت کی شمع جلاکر اُجالا کر سکیں۔

حضرات! آپ کی وساطت سے میں دنیا کی ساری قوموں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ امام حسینؑ کی سیرت کا مطالعہ کریں۔ ان کی امن آفرین تعلیم کو دنیا میں پھیلائیں تاکہ قومی، نسلی، ملکی اور لونی منافرت کم ہو۔ اور آدم کی اولاد ایک دوسرے سے مل جل کر ترقی کے میدان میں آگے بڑھے۔ ہر ملک اور شہر میں حسینؑ اور تعلیم حسینؑ کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے جلسے ہونے چاہئیں۔ اور ان کی سیرت کے ترجمے ہر زبان میں شائع ہونے چاہئیں۔

امام حسین علیہ السلام نے آخر وقت میں تمنا کی تھی۔ کہ جب شیریں پانی پیو۔ تو میری پیاس کو ضرور یاد کر لینا۔ یہ حسینی یادگار کس قدر آسان اور سہل ہے۔ دُنیا کے رہنے والو! جب پانی کا گھونٹ پیو تو اس پیاسے شہید کو ضرور یاد کر لینا جس نے انسان کے بنیادی حقوق کی خاطر اپنا سب کچھ لٹا کر آخر میں اپنی جان بھی راہِ خدا میں نذر کر دی تھی۔

جب تک نسلِ آدم میں کوئی فرد باقی ہے، پیاس لگتی رہے گی، اور پانی پیا جائے اور پانی کا ہر گھونٹ اگر کربلا کے پیاسے شہید کی یاد تازہ کر سکے۔ تو رہتی دُنیا تک حسین علیہ السلام کا نام اور کام نوعِ انسانی کی رہنمائی کر سکے گا۔ والسلام

حسینیت زندہ باد   یزیدیت مردہ باد

